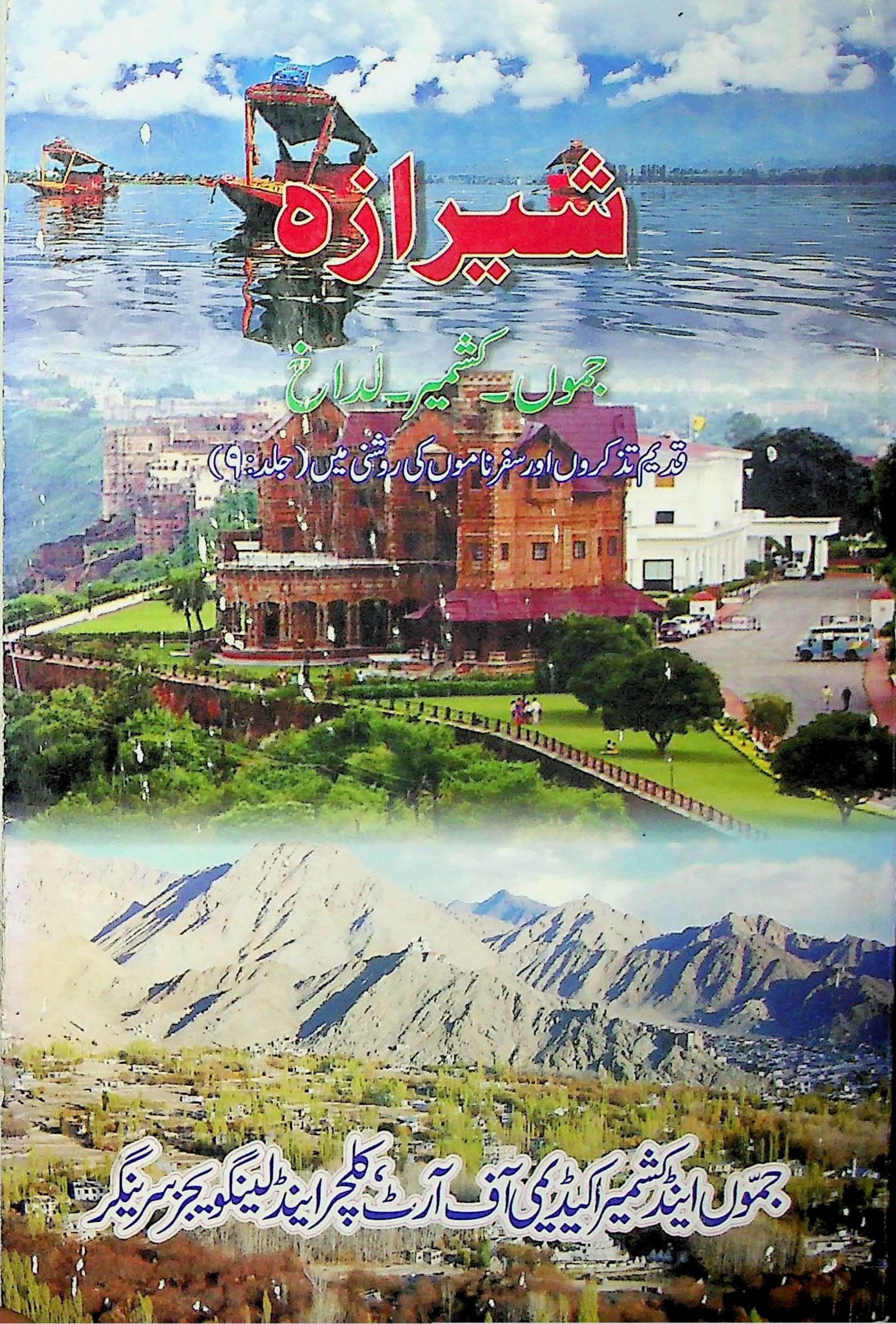


شیرازہ

جموں۔ کشمیر۔ لداخ

قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں (جلد: ۹)

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

جلد: ۵۲ | شمارہ: ۲-۳

جموں، کشمیر، لداخ
قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں (جلد: ۹)

نگران : خالد بشیر احمد

مُدیر اعلیٰ : محمد اشرف ٹاک

معاون مدیر : سلیم سالک

معاونین : سلیم ساغر، محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ: عادل اسماعیل

مطبع : جے کے آفسیٹ پرنٹرس۔ نئی دہلی

قیمت : مجلد: ۱۵۰ روپے ، پیپرکور : ۱۰۰ روپے

"شیرازہ" میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی یا اِدارے کا کُلّاً یا جزواً اتفاق ضروری نہیں۔

سرورق ڈیزائننگ: فردوس فیروز

☆......خط و کتابت کا پتہ:

محمد اشرف ٹاک

مدیر اعلیٰ "شیرازہ" اُردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

سرینگر / جموں

e-mail ID : urdusheeraza@gmail.com

فہرست

حرفِ آغاز

شیرازہ ''جموں۔ کشمیر۔لداخ، قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں'' کی نویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آج سے قریب دس برس قبل جس پروجیکٹ کا آغاز کیا گیا تھا وہ خوش اسلوبی کے ساتھ کامیابی اور کامرانی کی مختلف منازل طے کر رہا ہے۔ مضمون نگاروں کی سرپرستی اور قارئینِ کرام کی حوصلہ افزائی سے ہمارے ولولوں کی آبیاری ہو رہی ہے۔

زیرِ نظر جلد میں ثقافتی پہلوؤں کے اعتبار سے نہایت اہم گوشوں پر خامہ فرسائی کی گئی ہے جن میں ''کشمیر شناسی کے چند پہلو۔ فارسی شعراء کے کلام میں، کشمیر۔ غیر ملکی مصوّروں کی نظر میں، کشپ ریشی اور فارسی مورّخ، انگریزی رومانوی ادب میں کشمیر کا تذکرہ، کشمیر کوہستان، کشمیر شناسی کے بعض اَچھوتے اشارے بلتستان کے قدیم قبیلے اور لداخ کے جغرافیائی محلِ وقوع کے بارے میں مضامین شامل ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی میں فارسی زبان کشمیر میں وارد ہوئی۔ یہ یہاں کی تہذیب وثقافت میں ایک انقلاب تھا اور بہت کم وقت میں یہ درباری زبان بن گئی۔ اِس زبان کے پیچھے صدیوں کی جو تہذیبی تاریخ تھی اُس نے کشمیر میں اپنے اثرات مرتسم کیے۔ اِس تہذیبی اتصال سے کشمیر شناسی کے کئی پہلو سامنے آگئے۔ فارسی کے استاد پروفیسر مرغوب بانہالی نے اِن پہلوؤں کو نیا آب ورنگ دیا ہے اور حضرت شرف الدین

عبدالرحمٰن بلبل سے لے کر ماضی قریب تک اِن پہلوؤں کا کامیاب محاکمہ پیش کیا ہے۔ زین العابدین بڈشاہ، سلطان یوسف شاہ چک، ملک الشعراء فیضی، عرفی، ملک الشعراء طالب آملی، غنی کاشمیری، جان محمد قدسی، ملک الشعراء ابوطالب کلیم، نواب ظفرخان احسن، مرزا محمد قلی سلیم تہرانی، ملا شاہ بدخشانی، ملا نورالدین محمد ظہوری، ملا شیخ محسن فانی، میرزا داراب بیگ جویا، محمد رضا مشتاق، سیّد غلام الدین آزاد، پنڈت زندہ رام موبد، میر مہدی مجرم، علامہ اقبال اور مولوی صدر الدین صدر جیسے شعرائے کرام نے جس طرح کشمیر شناسی کے نمونے پیش کئے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

سولہویں صدی کے بعد جو یورپی سیاح کشمیر آئے اُن میں سے بعض نے یہاں بے پناہ قدرتی حُسن کو الفاظ کا جامہ پہنانے کے ساتھ انہیں اپنے موقلم سے بھی سمیٹنے کی کوششیں کی۔ اِن میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ کشمیر آنے والا فرانسز برنیئر، گاڈفرے، وائینی، ٹی ایس سونبورن فرانسز ینگ ہسبنڈ، مالینوکس اور فلورنس نے کشمیر کی بے پناہ خوبصورتی کو اپنے موقلم سے سمیٹنے والے شہکار اِن کے سفرناموں کی زینت بنے۔ جن میں سے مصوّری کے بعض نمونے اُن عمارتوں، قلعوں، پلوں اور محلوں کے ہیں جن کا اب کوئی وجود نہیں۔ اِس لحاظ سے اِن کی تاریخی اہمیت مسلمہ ہے۔ پروفیسر شفیع شوق نے کمالِ عرق ریزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مصوّری کے یہ بعض نمونے نہ جانے کہاں کہاں سے کھنگال ڈالے ہیں جو کہ زیرِ نظر اشاعت میں اُن کے مضمون کے ساتھ شامل کئے گئے ہیں۔

کشپ ریشی کو کشمیر کی وجہ تسمیہ قرار دیا جاتا ہے۔ سنسکرت مورّخوں نے کشپ ریشی کا ذکر اپنے انداز سے کیا ہے لیکن کشمیر کے فارسی مورخوں نے کشپ کا ذکر سنسکرت مورخوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔ اِن فارسی تاریخوں میں حسن بیگ خاکی کی تاریخِ کشمیر، بہارستانِ شاہی، ملک حیدر چاڈورہ کی تاریخِ کشمیر، نرائن

کول عاجز کی منتخب تواریخ، سعد اللہ شاہ آبادی کی باغِ سلیمان، واقعاتِ کشمیر از خواجہ محمد اعظم دیدمری، مجموعتہ التواریخ از بیربل کاچرو، نوادر الاخبار از رفیع الدین احمد غافل، حاجی محمد اسلم منعمی کی گوہرِ عالم، عبدالقادر خان کی حشمتِ کشمیر، تاریخِ حسن از غلام حسن گامرو اور وجیز التواریخ از غلام نبی شاہ خانیاری شامل ہیں۔ اِن تاریخی حوالوں کو غلام رسول بٹ نے اپنے خاص انداز سے ایک مقالے کی صورت میں پیش کیا ہے جو کہ شاملِ اشاعت ہے۔

مغلوں اور چکوں کے درمیان محاذ آرائی ایک ایسا موضوع ہے جس پر آج تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ زیرِ نظر اشاعت میں پروفیسر فدا محمد خان حسنین نے اِس موضوع پر بعض نئے زاویہ نگاہ پیش کئے ہیں اور اِس محاذ آرائی میں مغلوں کی بدعہدی کا تحقیقی خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

''لڈی شاہ'' اَب روایتِ پارینہ بنتا جا رہا ہے۔ یہ ہماری ثقافت کی انمول دین ہے جو نامعلوم زمانے سے ہمارے روزمرّہ کا ایک حصہ رہا ہے۔ یہ لوک فنکار قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں ایسے طنزیہ اور مزاحیہ اشعار سُناتا رہتا تھا کہ سُننے والے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ یہ اشعار لڈی شاہ اکثر اوقات بذاتِ خود تخلیق کرتا۔ اس کے خدوخال اور چال ڈھال سے مزاح جھلکتا اور چھلکتا رہتا تھا۔ عوامی زندگی میں رونما ہوئے واقعات جن میں سے اکثر تاریخی ہیں، لڈی شاہ ہی کی وساطت سے محفوظ ہو گئے۔ لڈی شاہ چونکہ ایک فعال کردار ہے، اُس کی منظومات چاہے اُس کی طبع زاد ہوں یا دوسرے شعراء کی، ایک نسل سے دوسری نسل تک سینہ بہ سینہ پہنچتی رہی ہیں۔ اِس طرح وہ سماجی تاریخ کو سینوں میں محفوظ کرتا رہا ہے اور منتقل بھی کرتا رہا ہے۔ غلام نبی آتش صاحب ہماری لوک روایات پر برسہا برس سے کام کر رہے ہیں اس کی شیرازہ بندی کرتے ہوئے ہمیں ''لڈی شاہ'' کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت کے بارے میں مضمون عنایت کیا ہے جو قارئین کے لئے یقیناً

دلچسپی کا باعث ہوگا۔

بلتستان زمانۂ قدیم سے نسلی، جغرافیائی اور لسانی اعتبار سے تبت کا حصہ رہا ہے اور اِس کی تمدنی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ تاریخی کتب، لسانی تفاوت، مقامی روایات، تجربات اور مشاہدات پر مبنی بلتستان کے کئی قبیلے ہیں جن میں منگول، مون، بروشو، شنِ دارد، خوریاہور، یبگو، کشمیری، سادات، مقپون اور چترل قابلِ ذکر ہیں۔ محمد علی خان گزشتہ کئی برسوں سے بلتستان کی تاریخ پر تحقیق کر رہے ہیں اور زیرِ نظر اشاعت میں اُن کا مضمون بلتستان کے نسلی گروہوں کے بارے میں نت نئی معلومات فراہم کرتے ہیں۔

کشمیر کی جمالیات کی تصویر کشی یہاں کی اردو شاعری میں نہ ہو اِس بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ ہرگوپال خستہ، صادق علی خان، راجہ شیر علی خان، خوشی محمد ناظر، قیس شیروانی، محی الدین فوق، شہ زور کاشمیری، نندلال کول طالب، غ۔م۔طاوس، غلام علی بلبل، غلام احمد مہجور، تنہا انصاری، میر غلام رسول نازکی، فاضل کاشمیری، عبدالحق برق، سیفی سوپوری، قیصر قلندر، اکبر جے پوری، شہزادی کلثوم، حامدی کاشمیری، رحمن راہی، امین کامل، فاروق نازکی، سلطان الحق شہیدی، ہمدم کاشمیری، قاضی غلام محمد، حکیم منظور، مظفر ایرج، شبیب رضوی، نشاط انصاری اور دیگر شعراء نے جس طرح سے شہر کی منظر کشی کی ہے وہ اردو ادب کے ذخیرے میں اچھا خاصا اضافہ ہونے کے ساتھ یہاں کی تہذیبی روایات کو بھی بیان کرتی ہے اور اس سلسلے میں ڈاکٹر نذیر آزاد کا مضمون اپنے اندر جہانِ معنی لئے ہوئے ہے۔

وادی کشمیر کی ہزار ہا سال کی جُدا گانہ تاریخ کی طرح یہاں کے کوہستانوں کی بھی اپنی ایک الگ شناخت ہے جو اس خطے کو منفرد موسمی حالات بھی عطا کرتے ہیں۔ اِن سلسلہ ہائے کوہ کی ارضیاتی عمر، ساخت اور خصوصیات کا احاطہ کرنے والی عطا محمد میر کی تحریر خاصی توجہ کی مرکز ہے اور قارئین کی معلومات میں اضافے کا باعث بن سکتی ہے۔

جہلم ویلی کارٹ روڑ ۱۸۸۹ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے تعمیر کروائی تھی۔ یہ پہلی

اور واحد شاہراہ تھی جو قلمرو جموں وکشمیر، گلگت بلتستان وشمالی علاقہ جات کی راجدھانی اور اہم مراکز کو سری نگر اور راولپنڈی اور بقیہ دُنیا سے ملاتی تھی۔ یہ شاہراہ ۱۸۸۹ء سے قبل بھی بیرونی تاجروں، مبلغوں اور سیاحوں کے استعمال میں تھی اور جب اِسے یورپی انجینئروں نے تعمیر کیا تو اُس وقت یہ کسی عجوبے سے کم نہیں تھی۔ اِس راستے سے مشہور یورپی سیاح وارد کشمیر ہوئے اور اپنے سفرناموں، یاداشتوں اور تذکروں میں اِس شاہراہ اور اس کے مختلف پڑاوٗں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اِس شاہراہ کے بارے میں راجہ نذر بونیاری کا تفصیلی مضمون تحقیق کی کئی پرتوں کو کھول دیتا ہے۔

شمارے میں بھوٹی زبان اور اس کا رسم الخط کشمیر اور گجر، انگریزی رومانوی ادب میں کشمیر کا تذکرہ اور دیگر مضامین شامل ہیں جو خصوصی اشاعت کے موضوع کے حوالے سے بہترین جانکاری فراہم کرتے ہیں۔ جموں کشمیر لداخ۔ قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں کی ۹ رویں جلد آپ کے ہاتھوں میں سونپنے کے بعد دسویں جلد پر کام شروع کیا گیا ہے اور اِس میں بھی حسبِ سابق موضوع کے حوالے سے نت نئی تحریریں نذرِ قارئین کی جائیں گی۔

ادارہ شمارے میں شامل جملہ مضمون نگاروں کا بے حد ممنون ہے جن کی سرپرستی سے ہمیں آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ شمارے کے مشمولات کے بارے میں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

سرینگر ☆......محمد اشرف ٹاک

۲۱ رمارچ ۲۰۱۴ء

☆......پروفیسر مرغوب بانہالی

کشمیر شناسی کے چند پہلو
برِ صغیر کے بلند پایہ فارسی شعراء کے کلام میں

کشمیر میں تاریخی طور پر سب سے بڑے ثقافتی اور سماجی انقلاب کی جو داغ بیل آٹھویں صدی ہجری یا چودھویں صدی عیسوی کے ابتدائی برسوں کے دوران اُن پاک باز علمائے دین اور مبلغین کے مبارک ہاتھوں پڑی جن میں سے بیشتر کا تعلق ایران اور وسطی ایشیا سے تھا۔ چنانچہ جب بُزرگ علمائے دین کے ہمقدم یہ بابرکت نعمتیں یعنی اسلام، تصوف اور فارسی زبان کشمیر میں وارد ہوگئیں تو کشمیر کی موجودہ تہذیب و ثقافت کو گویا نیا آب و رنگ میسّر ہوگیا۔ پھر جب اِسی صدی کے ابتدائی دور میں اوّلین داعیٔ دینِ حق سیّد عبدالرحمن المعروف بابا بلبل شاہ تُرکستانی اور اُن کے رفیقِ خاص عربی و فارسی کے سرکردہ ماہر جیّد عالمِ دین مولانا علامہ احمد، حاکمِ کشمیر رینچن کو مشرف بہ اسلام کیا تو منجملہ اور تہذیبی اقدام کے فارسی زبان و ادب سے کشمیریوں کے متعارف ہونے کا ایک عہدِ زرین بن جانے کی شروعات ہوئی۔ فارسی اب اِس خطے کے خواص میں اہم رابطے کے طور رواج پانے لگی۔ اس کے نتیجے میں ہمیں اُن ثقافت ساز شخصیتوں اور اخلاقی معماروں سے متعلق سارے تعارفی دستاویزات فارسی اشعار میں دستیاب ہوگئے ہیں۔ مثلاً رینچن کے قبولِ اسلام کے دن بابا بلبل شاہ کا دریائے جہلم کے کنارے شاہی محل کے سامنے ساتھیوں سمیت اذانِ صبح کا یہ منظر نامہ راجا کا کھڑکی سے دیکھنا:۔

دید شخصے چو مرد بر لبِ جُو طلعتش صُبح و آفتابش رُو
خرقہ پُوشیدہ ہمچو خوش حالان خواندہ قُرآن چو بُلبلِ نالان

(باغِ سلیمان۔ سعد اللہ شاہ آبادی)

چودھویں صدی عیسوی سے پیشتر کی تین صدیوں کے دوران خطۂ کشمیر جس اخلاقی پستی میں گرفتار ہو گیا تھا، اُس کی تفصیلات کے اشارے ہندو مورخوں، خاص طور پر پنڈت کلہن، جونراج اور شری ور نے بھی اپنے دھرم کے راجاؤں سے متعلق درج کر رکھے ہیں۔ اُن سب تباہیوں اور بُرائیوں کا اِزالہ کرنے میں جو رول اگلے ڈھائی سو سال میں شاہ میری سلاطین نے ۱۳۳۹ء سے ۱۵۵۵ء تک اور چک سلاطین نے داخلی انتشار کے باوجود ۱۵۵۵ء سے ۱۵۸۶ء تک انجام دیا ہے اُس کی چند جھلکیاں مقامی فارسی شاعروں کے قطعات میں بھی بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً شاہ میری سلطنت کے بانی سلطان شمس الدین شاہ میری کے ذاتی صفاتِ حسنہ سے متعلق یہ اظہار۔

در عدالت موشگافی کرد شاہِ شمس دین
بود اندر شغلِ حق او بے نظیر و بے قرین

(تاریخِ ہادی)

اور اس کی وفات کو عدل کا سُورج چھپ جانے کے برابر سمجھا گیا ہے
''آمدہ شمس باز زہر سحاب''
۷۴۳ھ

(ڈاکٹر صوفی محی الدین۔ کشمیر، ص: ۱۳۳)

شاہ میر کے فرزندِ ارجمند سلطان شہاب الدین کو کئی لحاظ سے کشمیر کے حکمرانوں میں لاثانی گردانا گیا ہے۔ اِسی حُسنِ ظن کا عکس یہ فارسی شعر پیش کرتا ہے۔

خاکِ ما دیگر شہاب الدین نژاد

(جاوید نامہ۔ علامہ اقبال)

سلطان شہاب الدین کا بھائی سلطان قطب الدین ثقافت کشمیر کے سب سے بڑے معمار حضرت شاہِ ہمدان میر سید علی ہمدانیؒ کا اِستقبال کرنے کی سعادت پاتے ہیں تو اُن کے اندر چھپا ہوا شاعر بے ساختہ اپنی زبانِ کج مج میں مسرت اور شادمانی کا اظہار فارسی میں ہی شروع کرتا ہے اور پھر عُمر بھر حضرتِ شاہ ہمدان کے نغمہُ توحید اور اِدفتحیہ کے ساتھ آپ کے جس چہل اسرار (فارسی) کو وظیفۂ روزگار بنالیتا ہے اس کی پہلی دلکشا مناجاتی غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہوتا ہے۔

اے گرفتارانِ عشقت فارغ از مال ومنال　　والہانِ حضرتت را از خود وجنت ملال

در تمنائے وِصالت شُد علائی جانفشان　　تاچہ خواہد دید آخرزین تمنائے محال

سلطان قطب الدین کی سولہ سالہ حکومت کے بعد سلطان سکندر عدل پروری، ادب نوازی اور شرعی پابندی میں خاص ربط وضبط سے 23 سال تک حاکمِ کشمیر رہے۔ کئی عناصر نے ''لڑے سپاہی نام سردار کا'' کے مصداق سہہ بٹ وزیر کے وہ اقدام بھی سلطان موصوف کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی ہے جو اسلام قبول کرنے کا طعنہ دینے والوں کے خلاف سہہ بھٹ وقتاً فوقتاً کرتا تھا۔ حالانکہ حقیقت شناس مُنصفوں نے سلطان سکندر کی رعایا پروری اور عدل گستری چھپانے والوں کی حماقت روکی ہے جیسا کہ اُن کی وفات پر کہے گئے اِن اشعار میں بھی عیاں ہے۔

شاہِ عادل، سکندرِ ثانی　　کہ زِ وے یافت سرفرازی تاج

مُلک روشن بنورِ شرع از دست　　گرچہ بُودہ زِ کُفر چوں شب داج

بہر تاریخ سالِ سلطنتش　　عقلِ گفتا بشرعِ دادہ رواج

۷۹۱ھ

(ڈاکٹر صوفی محی الدین، کشمیر ج ا ص: ۱۴۴)

اپنے باپ کی پابندیٔ شرعی پالیسی پر تنقید کرنے والے معدودے عناصر کو اپنانے کی حد سے زیادہ لگن اور شہرت پسند سیاست نے اگلے پچاس سال تک حُکمرانِ کشمیر بنے

والے سلطان زین العابدین بڈشاہ کو ایسا بادشاہ بنادیا کہ ماسوائے چند خواص، عام لوگ اس کے دورِ حکومت کو سنہری دور گردانے لگے کیونکہ بقولِ شاعرِ کشمیر اس کی مجموعی پالیسی بحیثیتِ پیشرو وہی تھی جو اس کے بعد برِ صغیر کی سطح پر اکبر نے اختیار کرلی بقولِ مہجورؔ

شہنشاہِ معظم شاہِ الدین بڈشاہ

کیا اکبر نے جس سے کسب آئینِ جہانبانی

(کشمیر، ج ا،ص:۱۷۶)

بڈشاہ شعر و ادب کا بھی بڑا دلدادہ تھا بلکہ خود بھی فارسی میں ایسے شعر کہتا تھا۔

اے بگردِ شمعِ رویت عالمے پروانہ — وزلبِ شیرین تو شوریست در ہر خانہ

من بہ چندین آشنائی مے خورم خونِ جگر — آشنارا حال این است وائے بر بیگانہ

(تاریخِ کشمیر۔ ملک حیدر چاڈورہ)

باقی شاہ میری سلاطین میں شعر و سخن کا ویسا جوہر ظاہر نہ ہوسکا جو ان کے بعد چک حکمرانوں میں سے سلطان یوسف شاہ چک میں دیکھا گیا۔ داخلی انتشار اور مغل یلغار میں بھی یوسف شاہ اپنی ہار کے فراق میں ایسے اشعار گاہ بے گاہ کہتا رہا۔

بریادِ دو زلفِ بُتِ کشمیر نژادے — شد تار سر مار سراز گریہ دو چشم

اپنی محبوب حبہ خاتون اور کشمیر سے جدا ہونے کا یہ المیہ الفاظ میں کب ڈھلا۔ کیا راجہ بھگوان داس کو ضمانت کے باوجود مغلِ اعظم کا فریب یوسف کو بسواک بہار پہنچائے جانے پر صدمے کی شدت رُلاتی ہے۔ واقعاً جب باہمی اِنتشار کی وجہ سے کشمیریوں کی مُدافعت مغل حملہ آوروں کے مقابلے میں کمزور پڑگئی اور یعقوب چک کئی کارگر جوابی حملوں کے بعد کشتواڑ کے علاقے میں پناہ لینے پر مجبور ہوگیا تو مغل صوبیداروں اور فوجیوں نے وادیٔ گلپوش میں رقصِ بے مہار (وُنٹہٕ نوُن) شروع کیا۔ چنانچہ جب مغل اعظم نے جشنِ فتح کو کشمیر میں ہی منانے کا فیصلہ کرلیا تو مغل شہنشاہ کے دربار کا ملک الشعراء فیضی (وفات ۱۰۰۴ھ) ایک ایسی روایت کا بانی بن گیا جس کا واحد ہدف یہ تھا کہ ساکنانِ کشمیر کو یرغمال

بنائے جانے کے اصل مسئلہ سے توجہ ہٹا کر اکثر مجلسوں اور جشنوں میں یہاں کے فطری مناظر کو ہی موضوعِ شعر بنایا جائے تا کہ ہمیشہ سے اُن کا وطن "ملکِ کشمیر" کہلائے جانے کا وہ نقش بھی مدہم پڑ جائے جو اُن کے تحت الشعور پر ثبت ہے۔ اکبر کی طرف سے اِس تجویز کی پذیرائی اور سراہنا ہونے کی دیر تھی کہ فیضی نے ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے خود ہی ایسا پہلا قصیدۂ کشمیر لکھا جس میں رمز و کنایہ کے باوجود فاتحانہ رُعونت عیاں تھی۔ ۹۸ اشعار پر مشتمل اُس قصیدہ میں سے صرف یہ درجن بھر شعر مُشتے نمونہ از خروارے تصور کر لیجئے گا۔

هزار قافلۂ شوق مے کُند شبگیر ۔۔۔ کہ بارِ عیش کُشاید بہ عرصۂ کشمیر
تبارک اللہ ازاں عرصۂ کہ دیدنِ او ۔۔۔ ورق نِگار خیال است و نقشبندِ ضمیر
ہوائے او متنوع چو فکرتِ نقاش ۔۔۔ زمینِ او متلوّن چو صفحۂ تصویر
غُبار او بتواں خواند چشم را دارو ۔۔۔ گیاہِ او بتُواں گُفت رُوح را اکسیر
بہ تن موافقتِ آبِ او چو بادہ و گُل ۔۔۔ بہ جان مُناسبتِ بادِ او چو شکّر و شیر
بہ پیشِ فیضِ نسمش دمِ مسیح سموم ۔۔۔ بہ نزدِ آبِ روانش زلالِ خضر عذیر
نسیمِ او زسرِ آب تیز مے گُورد ۔۔۔ کہ باد را نتوان داشت پائے در زنجیر
بہر طرف روئے: از بحر مالا مال ۔۔۔ ہزار چشمۂ جوشندہ چوں دلِ نحریر
ز اعتدالِ ہوایش شُگفت نیست شگفت ۔۔۔ کہ سر زند ہمہ عناب از نہالِ زریر
دیارِ دلکشِ کشمیر را مسخّر کرد ۔۔۔ بداں صفت کہ سلیمان پری کُند تسخیر
چو دادِ ایزدِ ش آں مُلک خواست تا گردد ۔۔۔ دراں زمینِ سعادت بسجدہ شُکر پذیر

فیضی کے بعد اب رواج ہی یہ چلا کہ کشمیر کی تعریف کے پردے میں قابض حاکم اور اُس کے لشکر کی چیرہ دستیوں کو چھپائے رکھا جائے۔ یہاں تک کہ اُس دربار کا وظیفہ خوار بن جانے پر عرفی شیرازی جیسا آتش نوا بھی کشمیریوں کی حالتِ زار پر اظہارِ خیال نہیں کر پاتا۔ دسویں صدی کے اِس ممتاز شاعر عرفی (وفات ۹۹۹ھ) کے قصیدۂ کشمیر کے فقط پانچ شعر مُلاحظہ فرمائیے۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید	گر مرغِ کباب است کہ بابال وپر آید
بنگر کہ زفیضس چہ شود گوہرِ یکتا	جائیکہ خذف گررود آنجا گہر آید
فردوس بہ دروازۂ کشمیر رسیدہ است	گو مُدعی را گر بنگرندہ است در آید
زیبائیٔ کشمیر گرش باعثِ عشوہ است	من مے مَحرم از زالِ فلک عشوہ گر آید
ایں سبزہ وایں چشمہ وایں لالہ وایں گل	آں شرح ندارد کہ بہ گفتار در آید

شہنشاہ اکبر کے درباری شاعروں کی کشمیر سرائی شہنشاہِ جہانگیر کے درباری شاعروں نے بھی اپنے اپنے انداز میں جاری رکھی۔ چنانچہ دربارِ جہانگیر کے ملک الشعراء طالب آملی (وفات ۱۰۳۶ھ) نے ایک غزل نُما قصیدہ کا ردیف ہی لفظ کشمیر بنایا ہے اور اُم الخبائث شراب کورواج دینے کی ترغیب سے نام نہاد عقلمندوں کو مدہوش بنانے کا مشورہ یوں دیا ہے:۔

فیضِ پیالہ بخشد آب و ہوائے کشمیر	از خشتِ خُم نہادند گویا بنائے کشمیر
چوں خاکِ عشقبازاں ہر لحظہ در مشامم	بوئے محبت آید از کوچہائے کشمیر
کشمیر مے ستانم از حق بجائے جنت	امانمے ستانم جنت بجائے کشمیر
شاہنشہِ جہانگیر چید از بہارِ اوگل	خوش مُستجاب گردید آخر دُعائے کشمیر
گردے زِ نُور نمود ہمرنگ نُور گفتم	کیں سرمۂ بہشت است یا تُوتیائے کشمیر
جنت کُجا تو اندبا او برابری کرد	چوں لطفِ بادشاہ گشت رونق فزائے کشمیر
وصفِ بہشتِ جاوید از عشقانِ اُو پرس	مارا زبان نہ گردد جز در ثنائے کشمیر
ہر کس پئے تماشا کردند خوش فضائے	رضواں فضائے جنت طالبؔ فضائے کشمیر

مغل باغات کو عشرت کدۂ شہزادگان بنانے میں شہنشاہ شاہجہان اپنے باپ جہانگیر سے دو قدم آگے رہنے کی کوشش شاہجہان آباد (دہلی) سے بھی زیادہ کشمیر میں کرتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے فطری مناظر کو موضوعِ توجہ بنانے میں شاہجہانی دربار کے شعراء بھی ایک دوسرے سے سبقت لینے کی کوشش کرتے رہے۔ شاہجہاں مناظرِ کشمیر کی تزئین وتوسیع دیکھنے خود چار بار کشمیر آتا ہے اور شعراء کی کشمیر سرائی سے محظوظ ہوتا ہے۔ یہ بات آگے

بڑھانے سے پہلے یہاں ایک جُملہ معترضہ کی جانب توجہ مبذول کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جس طرح اب تک بڈشاہی دور میں گرفتار کیئے جانے والے ملانورالدین کو حضرت شیخ نورالدین سے میمز نہیں کیا جاسکا ہے اُسی طرح نظیری نیشاپوری (وفات ۱۰۲۱ھ) کے دیوان کے صفحہ ۴۳۳ پر درج وہ غنیؔ کشمیری کون تھا جس کو قید سے رہائی دلانے کے لئے نظیریؔ نے ایک قصیدہ اس عنوان سے لکھا ہے "درمدحِ شاہ اکبر وفتحِ قلعۂ سیر وتقاضای آزادی غنی کشمیری"۔ اُس غور طلب قصیدہ کے چند شعر بھی نذرِ قارئین کئے جاتے ہیں۔

نن ورفیقے زِ ابنای من زِمُلک عراق — بگرم وسردِ تموز وخزان شدیم مَسیر
دُو مُرغ بُودیم آوردہ سوی ہند پناہ — زِ کیدِ مشتری و دامِ ماہ و آفتِ تیر
قضای بدسوی کشمیرش از ہوا انداخت — مگر کشید دراں بُوم بے مقام صفیر
اسیرِ بندِ تو گردید وخلق مے گویند — بہ عندلیب چمن درخواست بے زنجیر
گرسنہ است بد دیوزۂ شفاعتِ من — بخش جُرمِ غنیؔ را بہ التماسِ فقیر
بہ نیکی و بہ بدی از ازل قلم رفتہ است — خطای نظمِ من و جُرمِ قولِ او بپذیر
زِ عرضِ حالِ نظیریؔ نگاہِ عفو مپوش — کہ ہیچو لطف تو اش نیست در زمانہ نظیر

ویسے کشمیر سرائی میں بھی غزل گوئی کی طرح نظیریؔ نے اپنی خاص ادا کو پروان چڑھایا ہے۔ یہ دو شعر ملاحظہ کیجئے۔

کعبہ وزمزم زنخدان ورُخش پنداشتم — دیدہ اش بُتخانۂ کشمیر و چاہِ بابلی!

معجز بکعبہ سحر بہ کشمیر مے بُرند — از تخمِ من کہ در گِلِ ہندوستاں فتاد

طالبؔ آملی ملک الشعراء نے کشمیر میں داخل ہونے کے راستوں کی دُشواری کو بھی خاص طور پر اپنا موضوعِ شعر بنایا ہے۔

شد آسان طے رہِ دشوارِ کشمیر — بہ اقبالِ شہنشاہِ جہانگیر
قدم بر تیغ کوہے گشت گستاخ — کہ بروے نگذرد پویندہ نخچیر

رہے کردیم طے کز پیچ و تابش | بد ندان لب گزد مارِ شکن گیر
نہ زیرِ پا در آوردیم راہے | کہ وروے آسمان گشتے زمین گیر
چرا چوں عُمر اژدرہا درازاست | کہ کوتاہ باد عُمر راہِ کشمیر
رہے جانسوز تر از برقِ خنجر | رہے باریک تر از نوکِ شمشیر
زِ محنت گرچہ پُر خاراست راہش | ولے در سرو و گل ہم نیست تقصیر
یکے باغیست ایزد ساز کوہے | کہ معمارِ بہارش کرد تعمیر
درختانِ بلندِ سبز شاخش! | کمانِ قامت افلاک را تیر
ہوائے دِلکشاے کوہسارش | گرہ نگذاشتہ در شاخِ نخچیر

شاہراہ کشمیر دراصل فطری اور غیر فطری ترجیح کا معاملہ ہے۔ چنانچہ دوسرے فارسی شعراء کے تاثرات اب جموں سرینگر شاہراہ پر صادق آتے ہیں۔ مثلاً مشہور نعت گو شاعر جان محمد قدسیؔ کا یہ شعر۔

رہے پیچیدہ تر از موے زنگی | بہ تُندی چوں دم تیغِ فرنگی

نواب ظفر خان احسنؔ کا یہ احساس کہ۔

مرا اندیشۂ راہیست جانکاہ | کہ آنجا خضرے ہم گُم کند راہ
بہم پیچیدہ میگر درچُو مکتوب | دریں رہ عُمرِ خضر و صبرِ ایوب

مگر عُمرِ خضر اور صبرِ ایوب یاوری کرے تو آسان رستہ بھی مل سکتا ہے۔ بقولِ عاقل خان۔

بے رنج محال است بہ فردوس رسیدن | ہمواریٔ رہ گُلشنِ کشمیر ندارد

اگرچہ کشمیر کے راستے کی دشواری کا انتہائی تلخ تجربہ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کو ذاتی طور بھی ہوا ہے اور وہ اپنے عرصۂ حکومت میں ایک ہی بار کشمیر آسکے ہیں لیکن اکبر جہانگیر اور شاہجہاں کے دور میں کشمیر کی روحانیت پسندی پر سرکاری طور غالب کرائی گئیں عیش پسندانہ کاروائیوں اور خواہ مخواہ اپنی تعریف میں قصائد لکھوا کر پیسہ اور وقت ضایع کرنے کی حماقتوں سے اورنگ زیب بیزار تھے۔ وہ مفلوک الحال کشمیریوں کی حالتِ زار

سُدھارنے کی سنجیدہ کوشش کراتے رہے جس کے چند پہلو ڈاکٹر صوفی محی الدین نے معتبر ذرائع کی بنیاد پر بڑی دیانتداری سے درج کر لئے ہیں۔
(دیکھئے کشمیر جلد ۱، ص ۲۷۳ تا ص ۲۸۶)

مقتدر شاعروں کی سطح پر لناس علی دینِ ملوکہم کے مصداق اب ایک خوشگوار تبدیلی نشوونما پانے لگی۔ نہ صرف قصیدہ کی جگہ مثنوی نے لے لی بلکہ عوام کی دردمندی بھی شاعری کا موضوع بننے لگی۔ تاہم دیر تک فطری مناظر کے گیت الاپنے کا رُجحان کم نہ ہو سکا۔ تاہم اب معنوی تبدیلی میں مقامی فارسی شعراء کا حصہ بھی قابلِ اعتبار محسوس کیا جانے لگا۔ البتہ کئی دہائیوں کے دوران جن سانچوں میں مہمان شعراء کی طبیعت ڈھلی تھی وہ عادتِ کہن سے مجبور ہو کر خارجی حُسن پر ہی زیادہ طبع آزمائی کرتی رہی اور ظفر نامۂ شاہجہاں کا فاضل مصنف حاجی جان محمد قدسیؔ جیسا دین اور۔

مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی　　دِل و جان بادِ فدایت چہ عجب خُوش لقبی

جیسی نعت گوئی کرنے والا بھی اِس میلان کے تحت کشمیر کے مناظر اور مشکل راستے پر ہی زیادہ توجہ دیتا رہا مثلاً ایسے اشعار تخلیق کرتے وقت۔

بُود قطعِ رہِ کشمیر مُشکل　　بہ حق نتواں رسید از راہِ باطل
مگر زیں راہِ باریکت خبر نیست　　کہ گوئی کوہ راموئے کمر نیست

قدسیؔ روحانی توجیہہ پیش کر کے بھی کشمیریوں کے ساتھ دلی وابستگی یوں ظاہر کرتا ہے:

زِ راہش کس چرا دِلتنگ باشد　　زمُرد درمیانِ سنگ باشد
اگر انیست نُزہت گاہِ کشمیر　　ہزاراں جاں فِدائے راہِ کشمیر
چہ کشمیر آبروئے ہفت کشور　　نِگاہ از دیدن آں تازہ و تر
چہ کشمیر آب و رنگِ باغ و بُستان　　اسیرِ ہر نہالش صد گلستان
خوشا مُلکے کہ از فیض ہوایش　　بود گُلدستہ جاروبِ سرایش
بمینا کاریٔ ایں خطۂ خاک　　چہ صنعتہا نمود اُستادِ افلاک

بخوبی آنچناں کشمیر طاق است! — کہ معشوقِ خراسان وعراق است

سزد کشمیر را در جلوهٔ ناز — ہزار اللہ اکبر گو چو شیرا

نسیم فیضِ ایں روح اللہ آباد — زِ اعجازِ مسیحا مے دہد یاد

قدسی کی کشمیریوں سے محبت اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی چنانچہ کشمیر میں رہ کر درویشانہ زندگی گزارنے والے عاشقِ رسول اکرمؐ نے ۱۰۵۶ھ میں وفات پر کرڈلگیٹ سرینگر کے مُتصل مزارِ شعراء میں مدفن پالیا ہے۔

اِسی مزارِ شعراء میں شاہجہانی دربار کا ملک الشعراء ابو طالب کلیم ہمدانی (وفات ۱۰۶۱ھ) بھی دفن ہے۔ان کی کشمیر شناسی پر مبنی ایک غزل نما نظم کے یہ چند شعر ملاحظہ فرمایئے:

نسیمِ خُلد گدائے بہارِ کشمیر است — شگفتگیٔ گُل و خار یارِ کشمیر است

لبِ پیالہ زِ تبخالِ رشک مے سوزد — کہ نشۂ وقت لبِ جوئبارِ کشمیر است

اگر چہ پایۂ دلبستگی است قامتِ سرو — عنانِ ہوش بدستِ چنارِ کشمیر است

پیامِ عالمِ بالا کہ گوش نشۂ اوست — ترانہ ایست کہ با آبشارِ کشمیر است

ملک الشعراکلیم کی اسی ردیف وقافیہ کو لے کر نواب ظفر خان احسنؔ نے بھی ایسے شعر کہے ہیں۔

ہست رضوان اگر چہ در جنت — در دِلش خار خارِ کشمیر است

احسنؔ (وفات ۱۰۷۳ھ) نے کشمیر کو اپنا محبوب ترین موضوعِ شعر بنا کر کئی طرح کی گُل افشانی گفتار عمل میں لائی ہے۔ یہاں پر ان کے صرف یہ چند شعر نقل کرنے پر اِکتفا کی جاتی ہے۔

چہ کشمیر اِنتخابِ ہشت جنت — بہار اینجا کمربستہ بخِدمت

چنیں گلشن ندیدہ چشمِ اختر — بود خُلدش پدر، فردوس مادر

فراواں گُل بُود در بوستانش — برضوان طعنہ دارد باغبانش

نمے گردم زرنجِ راہ دِلگیر — بسر طے مے کنم از شوقِ کشمیر

کشد ہر برگِ سبزش دامنِ دِل　　رسیدن تا بمنزل نیست مُشکل
راہِ اورشکِ فردوس بریں است　　خوشا باغے کہ راہش اینچنیں است

....　　...

الٰہی تا بُود کشمیر آباد　　ز گُلزارِ خراسانم مده یاد
بہر کس ہر چہ خواہد بے سخن ده　　مرا کشمیر و بُلبل راچمن ده

احسنؔ کا یہ شعر بھی اُن کے عاشقِ کشمیر ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

کشمیر مگو رشکِ پری خانۂ چین است　　القصہ بہشتے است کہ برروئے زمین است

یہ شعر سید فضل علی دہلوی کے اِس مشہورِ عالم شعر کا ماخذ و محرک لگتا ہے۔

اگر فردوس برروئے زمین است　　ہمین است وہمین است وہمین است

(اُردو شیرازہ جلد ۱۱، شمارہ ۴، ص ۱۲۰)

کشمیر کے مذکورہ بالا مزارِ شعراء میں مدفون شاہجہانی عہد کا ایک اور مشہور شاعر میرزا محمد قلی سلیم تہرانی (وفات ۱۰۵۷ھ) تھا۔ آپ نے بھی کشمیر کو موضوع بنا کر یہاں کے مناظرِ فطرت کی تعریف کی۔ نیز ثقافتِ کشمیر کی ایک ممتاز صنعت شال بافی کو بھی خوب سراہا ہے۔

تعالیٰ اللہ دریں باغِ خدائی　　کہ گرد و دست از خاکش حنائی
فضائیش چوں بساطِ نیک بختاں　　پر طوطی درو برگِ درختاں
بپای گل زموج سبزه زنجیر　　نگویم سبزه، خوابِ شالِ کشمیر
بصحرائیش گُل ولالہ ہم آغوش　　بباغش سرو وسبزه دوش بردوش

جس وحدۃ الوجودی شاعر کو شاہجہاں اور اُس کا بیٹا دارشکوہ اپنا مرشد سمجھتے تھے یہاں تک اس کی خانقاہ میں خود جا کر حاضری دیتے تھے وہ ہمیشہ مُجرد اور بے نکاح رہا اس کا نام مُلا شاہ بدخشانی تھا۔ اُسی مُلا شاہ (وفات ۱۰۷۲ھ) کے کشمیر کے چند تاریخی مقامات سے متعلق کچھ شعر دیکھئے۔

شالہ مارِ تو بود دیرینہ　　نخلہا شیر دِہند از سینہ

فیض بخش او ہمہ با آب و ہوا   از فرح بخشش انہما نبوا

میلِ دِل از ہمہ برخاست مرا   چونکہ میلِ طرب افزاست مرا

آں چنارش بمیانِ قد افراخت   بسرِ چرخِ فلک دارو تاخت
بخدا و بچہار اخیارم   ہوسِ باغِ محمدؐ دارم

مسجدِ جامعِ بشہرِ کشمیر   جُمعہ از خوبی او در زنجیر

آنچناں پاک بُود آبِ ڈلش   کہ کشد تختِ سلیمان بغلش

گرنہ گویم و فریاد کُنم   نظرے سوے شہ آباد کُنم

خودظفرخان چو بعدل وداد است   او مظفر بہ ظفر آباد است

مُلا نورالدین محمد ظہوری ترشیزی کی اہمیت اور عظمت کو غالب نے مصائب کے ساتھ محوِ ہمکلامی دکھانے کے لئے یہ تک کہا ہے کہ ۔

زنظم ونثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب   رگِ جاں کردہ ام شیرازہ اوراقِ کتابش را

ظہوری (وفات ۱۰۲۵ھ) بیشتر وقت دکن میں گزارنے کے باوجود جب کسی خاص قوم کی قسم کھانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو کشمیریوں سے متعلق بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے ۔

بہ ترکانِ غارت گرِ صبر و ہوش   بہ کشمیریانِ ملاحت فروش

(دیوانِ ظہوری کول کشور ص: ۶۳۵)

بعض تذکروں میں ہندوستانی مغل سلاطین کی سات پشتوں میں ادبِ عالیہ سے

وابستگی اور شعر وسخن پر طبع آزمائی بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، دارالشکوہ اور بہادر شاہ ظفر سے منسوب کی گئی ہے۔ اُنہی میں عالمگیر اورنگ زیب کی دُخترِ نیک اختر زیبُ النساء کے بُلند پایہ شاعرانہ ذوق کو نہایت قابلِ ستائش گردانا گیا ہے۔ زیب النساء مخفیؔ (وفات ۱۱۱۳ھ) نہایت پاکباز خاتون تھی جس نے عربی اور فارسی میں اُستادانہ دسترس حاصل کرنے اور قرآنِ پاک کی تفسیر (زیبُ التفاسیر) لکھنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کرلیا تھا۔ اسلئے شادی پر بھی امادہ نہ ہوسکی۔ کشمیر سے متعلق ان کی والہانہ محبت کے آئینہ دار ایسے کئی شعر ملتے ہیں۔

مژدہ دہ بادِ صبا از ما بہ اربابِ نشاط — کز سرشکِ ما زمینِ ہند چوں کشمیر شُد
در مذہب مادم زدن از عشق حرام است — مُرغے کہ ہوائے گُلِ کشمیر ندارد

(دیوانِ مخفی، کانپور، ص:۳۲/ص ۱۰۷)

کشمیر کے فطری مناظر اور کشمیری ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو یوں موضوعِ شعر بنانے والوں میں ڈاکٹر سید حسام الدین راشدی کے تذکرہ شعرائے کشمیر کی رُو سے جن دیگر درجنوں چھوٹے بڑے شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے اُن میں مُلا شیدا آتی فتح پوری (وفات ۱۶۱۷ء) مُلا مُنیر لاہوری (وفات ۱۲۴۴ء) میر محمد زمان راسخ لاہوری (وفات ۱۶۹۵ء) ناصر علی سرہندی (وفات ۱۶۹۶ء) آفرین لاہوری (وفات نامعلوم) گُلشن دہلوی (وفات ۱۷۲۷ء) اور جدید ایران کے ملک الشعراء بہار اور عارف قزوینی بھی شامل ہیں۔ لیکن طوئلِ مقال کہیں باعثِ ملال نہ بن جائے میں ایسے درجنوں کشمیر سرا شعراء سے صرفِ نظر کر کے فقط نزدیکی تعلق ملحوظ رکھ کر چند اور نام شامل کرنے پر اکتفا کرنا چاہوں گا۔

پہلے ہم برِصغیر کے شعراء کی کشمیر سرائی کا حرفِ آخر عظیم غزل گو مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کے اِن چند شعروں کو بنائیں گے۔

حورِ بہشتی زیاد آں بُتِ کشمیر بُرد — بیم صراط از نہاد آں دمِ شمشیر بُرد

(کُلیاتِ غالبؔ، ص:۱۲۷)

اور دُنیا کے کسی خوبصورت مقام کو بطورِ مثالی سیر گاہ متعارف کرانا مقصود ہو تو اُس کو کشمیر کے مانند قرار دینا کافی ہوگا۔ غالبؔ کے الفاظ میں:

سیر گاہیست دراطراف تو گوئی کشمیر　　روستاے است زِ اقصای، تو گوئی شیراز

(کُلیاتِ غالبؔ فارسی مرتبہٗ پروفیسر امیر حسن نورانی ص: ۵۸۳)

اب ہم صفِ اوّل کے کشمیری النسل فارسی شعراء کے چند نمائندوں کی کشمیر شناسی کے نمونوں سے محظوظ و متعارف ہونے کی کوشش کریں گے۔ دراصل مغلِ اعظم کو خوش کرنے اور ذہین و فہیم کشمیریوں کی توجہ اصل مسئلہ سے ہٹانے کی غرض سے جو کشمیر سرائی لمبے لمبے قصائد لکھ کر ملک الشعراء فیضی اور آتش نوا عرفیؔ شیرازی نے شروع کر لی تھی اُس کی تحریک انہوں نے حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ (وفات ۱۰۰۳ھ) کے ایسے اشعار سے پائی تھی جو آپ نے اپنے وطنِ عزیز کی فطری خوب صورتی، حضرت شاہ ہمدانؒ کی کشمیر نوازی اور عوام میں انتشار اور رسہ کشی کے تناظر میں تخلیق کیے تھے۔ مثال کے طور پر اُن کے ایک لمبے قصیدے کے یہ چند اشعار دیکھیے:

مُصوّران زِ ہوائے کہ ہست در کشمیر　　کشید صورتِ جاندار در دمِ تصویر
مگر گرفت بہ وام آب و خاک از رضوان　　کہ کرد طینتِ حورِ بہشت را تخمیر
درو بہر طرف انہار تحتہِ الاشجار　　عجب نباشد اگر گویمش بہشت نظیر
ولے مشابہٗ خُلدش مگو کہ عارِ وے است　　بگوی خُلدِ بریں را مُشابہٗ کشمیر
خمیر مایہ زِ آب و گِلش بگرفت فلک　　دمے کہ ساخت پۓ قرصِ ماہ مہر ضمیر
عجب نباشد اگر عطرِ گُلرخان سازند　　زِ خاک او کہ ہمہ عین عنبرست و عبیر
چکد ہمہ گُل سُرخ زِ سیاہی قلمم　　صفاتِ فصلِ بہارش اگر کنم تحریر
امیر ماست علی نام و فخر آلِ علیؑ　　بتخت و تاج حقایق براہلِ کشف امیر
بروں ز سلسلہ اش ہیچ عاشقی نبود　　بقیدِ او ہمہ آزاد گانِ عشق اسیر

خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ المعروف حبی کشمیری (وفات ۱۰۱۵ھ) حضرت صرفی کے

شاگردِ رشید اور خلیفۂ خاص تھے۔ آپ کی شاعری بھی اعلیٰ پایہ سنجیدگی اور شائستگی کی آئینہ دار ہے۔ اپنے وطن کی تعریف میں بھی وہ مُرشد صرفیؒ کے نزدیک دکھائی دیتے ہیں مثلاً ایسے اشعار میں ؎

نیست کشمیر بلکہ ہست بہشت ۔۔۔ ہر کہ دیدش زِ دل بہشت بہشت
پُرز اشجار بوستان اینست ۔۔۔ میوہ اش ہمچو جانِ شیرین است
معتدِل اندروست تابستان ۔۔۔ بندہ اش نوبہارِ ہندوستان
سبزہ زارش بہ از قطیفۂ نرم ۔۔۔ ہم ہوایش درونہ سرد نہ گرم
گرچہ از شکر ست پُر لاہور ۔۔۔ من نگیرم بخوشۂ انگور
کوہسارش چُو طُور پُر از نُور ۔۔۔ مردماں رانہ وصفِ موسیٰ دور
خوب رویان دراں سیہ چشمان ۔۔۔ بدل و جان و عاشقانِ فنان
اکثراز مردمانِ آں صُلحا ۔۔۔ ہم بسے اہلِ فضل از عُلماء
حافظ وخوشنویس دروے بیش ۔۔۔ ہم صفا کیش بیشتر درویش
اہلِ اِسلام مُرد مانش ہم ۔۔۔ نا مسلماں ولے دروہست کم
اکرم اللہ جَلَ سا کِنہا ۔۔۔ اصلح اللہ عزَّ کا ینہا

مُلا شیخ محسن فانیؔ (وفات ۱۰۸۲ھ) حضرت صرفیؒ کے ایک اور مایہ ناز وسیع مشرب شاگرد رشید ہیں جو افتخارِ کشمیر ملا محمد طاہر غنیؔ کشمیری کے خاص اُستاد اور دبستان المذاہب جیسی معرکتہ الآرا تصنیف کے مُصنف بھی ہیں۔ وہ ایک جہاں گرد کشمیر شناس کی حیثیت سے اپنے وطن کے ساتھ مختلف جگہوں کا تقابلی مطالعہ بھی اپنے اشعار کا موضوع بناتے رہے ہیں۔ مثلاً

فانیؔ از بختِ سیاہت شُدہ در ہندوطن ۔۔۔ ورنہ جائے تو بجُز گوشۂ کشمیر نبود

در بہارِ گلشنِ کشمیر فانیؔ ہر طرف ۔۔۔ جُز شرابِ ناب وشمعِ مجلسِ احباب نیست

ہوائے برشگالِ ہند خوش آمد مرالیکن نسیمِ نوبہارِ کابل وکشمیر مے باید

گوظفرخان داغ شوا مشب کہ فانی ایں غزل درالہٰ آباد پیشِ قدردانے خواندہ است

فانی نے ایک موقعہ پر پھر بھی دہلی کی سج دھج کو کشمیر پر ترجیح دی ہے ۔

فانی آخر منزدی در گوشۂ کشمیر شُد گرچہ جائے بہتر از شاہِ جہاں آباد نیست

لیکن اکثر وہ شاکی ہی رہے ۔

در کِتابہائے کشمیر از زبانِ آہِ سرد شِکوہ ہا از کوے ہندوستان مے باید شنید

(مثنویات فانی مرتبہ پروفیسر عابدی ص:۶/۷)

اگر چہ ابھی چھ درجن اہم شاعروں کے وطنِ عزیز کشمیر سے متعلق چھوٹی بڑی نظمیں میری نظر میں ہیں لیکن اُن سب کا اندراج ایک پوری کتاب لکھنے کا تقاضا کرے گا اسلئے میں اب درجن بھر مزید جوانوں پر ہی میں مقالہ کو ختم کرنا چاہوں گا۔ پہلے حضرت عرفی کے بعد کشمیر کے سب سے بڑے فارسی شاعر ملا محمد طاہر غنی کشمیری (وفات ۱۰۷۹ھ) کے دردوسوز میں ڈوبے ہوئے ایسے چند شعر دیکھئے جن میں کشمیریوں کے استحصال کا رونا رو کر انقلاب کی تمنا کی گئی ہے ۔

بہ بزمِ دردمندان زار نالیدن ہوس دارم چُو نے خواہم کہ در فریاد باشم تا نفس دارم

کدام باز ندانم در آشیان بندیست کہ ہست حُکم پرِ کاہ بالِ مُرغان را

روزیٔ ما میشود آخر نصیبِ دیگراں طالعِ برگشتہ ہمچوں آسیا داریم ما

غنی از گُلخنِ گیتی بہ اخگرے زنم پہلو کہ از سوزِ دروں خاکستری شُد رنگِ رُخسارم

غنیؔ در مُلکِ دُنیا اِنقلابے آرزو دارم — کہ خاک از گردشِ گردوں غبارِ آسیا گردد

کردہؔ است ہوائے ہند دِلگیر مرا — اے بخت رساں بباغِ کشمیر مرا

ہرکہؔ پابندِ وطن شُد میکشد آزارہا — پایۂ گُل اندر چمن دایم پُر است از خارہا

اِنقلابےؔ بہ غمِ آبادِ جہاں مے خواہم — شاہد ایں طالعِ برگشتۂ من بر گردد

میرزا داراب بیگ جویا، غنیؔ کے بعد کشمیر کا سب سے بڑا مسلم الثبوت اور پختہ کار شاعر گزرا ہے۔ اس کے چند متعلقہ شعر دیکھئے:

تعالی اللہ زہے گُلوارِ کشمیر — کہ در وے غنچۂ ہم نیست دلگیر
گرفتہ دربغل خاکش صفارا — وطن اینجا بُود آب و ہوا را
گُل و نرگس زنیکو یان باغند — میانِ بوستان چشم و چراغند
زہے برگے دریں خرم گُلستان — تُو اں بُردن زہے برصنعِ یزدان

کشمیر کے جادو بیان فارسی شعراء میں محمد رضا مشتاقؔ بھی شُمار کئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شمس الدین احمد نے پی ایچ ڈی مقالہ ایران میں اسی شاعر مشتاقؔ (وفات ۱۱۴۳ھ) کی حیات اور شاعری پر بڑی عرق ریزی سے لکھا تھا۔ ایک قصیدے میں ابو طالب کلیم کے ردیف وقافیہ کو بروئے کار لا کر مشتاقؔ نے کشمیریوں کی امن دوستی کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

.شوخ از بس بہارِ کشمیر است — مِژۂ حُور خارِ کشمیر است
چشمِ لیلیٰ کہ دِل زِ مجنون بُرد — داغ از لالہ زارِ کشمیر است
سرِعیش و نشاط و ناز و طرب — روز و شب در کنارِ کشمیر است
خضر ہر چند زندۂ ابدست — کُشتۂ چشمہ سارِ کشمیر است

آبروی بہارو ہر چہ دروست   خاکِ پائے دیارِ کشمیر است

سید غلام الدین آزاد کشمیری (وفات ۱۲۰۳ھ) نے کلیم اور مشتاق کی بحر میں ہی سماجی اور سیاسی مظالم کو بھی اپنے اشعار میں جگہ دی ہے۔ یوں ۔

ہزار داغ بہ دلِ لالہ زارِ کشمیر است   پس از وفات مرا یادگارِ کشمیر است

دریں حدیقہ خزاں بہتر از بہار بُود   بہ از شگوفۂ او پنبہ زارِ کشمیر است

کسے نگشت ونگر دوزِ دام او آزاد   چو خطِ سبزِ بتاں سبزہ زارِ کشمیر است

پنڈت زندہ رام مُوبد بڑے محبِ وطن شاعر کی حیثیت سے ایک سیمابی طبیعت کے مالک تھے۔ دہلی یونیورسٹی کے صدرِ شعبہ فارسی مشہور پروفیسر سید امیر حسن عابدی نے لکھا ہے "اٹھارہویں صدی عیسوی کے دورِ زوال میں ثقافت کے جن علمبرداروں نے ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کو اُجاگر کرنے میں بڑی ثابت قدمی سے کام لیا اُن میں پنڈت زندہ رام موبد کشمیری بھی ایک اہم نام ہے۔ موبد کی وطن دوستی کے آئینہ دار چند شعر دیکھئے ۔

بلبلِ کشمیرم و اسیرِ دہلی ام   نالہ ہردم درام از حبِ وطن

یارب برسان موبدِ مارا توبہ کشمیر   تایادِ جوانیش دہد عالمِ پیری

وطنم سہت گلشنِ کشمیر   چہ شود گر بمن وطن بخشی

جامِ شرابِ گلگون ساقی بدہ بہ موبد   کا مدرسید بہارے از کوہسارِ کشمیر

تابہ کے باشی دلِ من دور از کشمیر خویش   خانۂ خود را بکُن آباد از تعمیر خویش

میرزا مہدی مُجرم تیرھویں صدی ہجری کے کشمیر شناس شعراء میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے محقق ڈاکٹر حکیم الدین قریشی لکھتے ہیں "مجرم کشمیری"

آخرین دورِ ادبیاتِ فارسی در ہندوارای مقامے شامخ است۔''

(آئینہ ہند سال پنجم شمارہ ششم)

مجرمؔ کی کشمیر شناسی کے چند پہلو دیکھیے۔

عیان است ایں کہ از تقدیر یاری | کُہستانیست یکسر مُلکِ کشمیر
دریں کہسار شیر و شیر مرداں | ہمیشہ بودہ و باشند جا گیر

مجرمؔ یہ بھی لکھتا ہے کہ وقت وقت کی آفتوں میں اگر اللہ کا غیبی کرم اور فضلِ ایزدی کشمیریوں کے آڑے نہ آتا تو یہ لوگ کئی بار لقمۂ اجل بن کر نہ بچتے۔

خوشا شہرِ کشمیر جنت قرینہ | تماشاہی تالاب و سیرِ سفینہ
ہمہ لالہ رُو سرو قد دلبرانش | سمن ساق و نسرین سرین، سیم سینہ
دلاویز و دلکش، ہمیہ مست و سرخوش | قدح در کف و در بغل آبگینہ
شکر خند و دِلبند و نازان و تازان | نظر بازو طنازو شوخ و شینہ
قران ہا فتے گر بہ این مہ جبیناں | نمے برد با خویش قارون خزانہ

اب آفتوں سے بچنے کا پہلو

اگر نہ کردے کرم عِنایت وگرنہ دادے دِرم شُجاعت
نبود اردین پسند پایت کسے نماندے میانِ کشمیر

عظیم فرزندِ کشمیر علامہ اقبالؔ چودھویں صدی ہجری کے فارسی شعراء میں ممتاز ہونے کے علاوہ ہر دور کے عظیم شعراء میں بھی ایک مُنفرد مقام رکھتے ہیں۔ غنی کشمیری کی طرح وہ بھی کشمیریوں کی حالتِ زار پر خون کے آنسو بہانے میں یکتائے روزگار مانے گئے ہیں۔ یہاں پر صرف چند فارسی شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

جان زِ اہل خط سوزد چُون سپند | خیزد از دِل نالہ ہاے دردمند
زِیرک و دراک و خوش گِل ملتے است | در جہاں تر دستیٔ او آیتے است
ساغرش غلطمندہ اندر خُونِ اوست | در نَۓ من نالہ از مضمونِ اوست

از خُودی تا بے نصیب اُفتادہ است — دَر دیارِ خود غریب اُفتادہ است
دستِ مزد او بدستِ دیگراں — ماہی رودش بہ شستِ دیگراں
از غلامی جذبہ ہائے اُو بمرد — آتشے اندر رگِ تاکش فسرد
کشیری کہ بابندگی خو گرفتہ! — بُتے مے تراشد زِ سنگ مزارے!
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے — خودی ناشناسے زِ خود شرمسارے!
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او — نصیبِ تنش جامۂ تار تارے!
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے — نہ در سینۂ او دلِ بیقرارے
ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری — کہ خاکسترش آفریند شرارے

غنیؔ کی طرح کشمیر میں ایک ہمہ گیر معنوی انقلاب چاہنے والا اقبالؔ عالمی سطح پر بھی کشمیریوں کے مسائل اُجاگر کرنے کی ضرورت سمجھتا ہے۔

بادِ صبا! اگر بہ جنیوا گزر کنی — حرفے زِ مابہ مجلسِ اقوام باز گوے
دہقان وکشتِ وجوے وخیابان فروختند — قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

جہاں اقبالؔ یہ بیان اِس تمہید کے ساتھ دیتے ہیں کہ۔

روحِ غنیؔ است ماتمی مارگ آرزوئے — (جاوید نامہ)

وہاں وہ وُلر جھیل کے حوالے سے اُردو میں ''خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے'' کہنے کے علاوہ وُلر کی منتشر موجوں کو یکجہتی کا درس بھی دیتے ہیں۔

چند در قُلزم بیک دیگر زنیم — خیز تا کیدم بساحل سرزنیم
زیستن اندر حدِ ساحل خطاست — ساحلے ماسنگے اندر راہِ ماست
باکراں درساختن مرگِ دوام — گرچہ اندر بحرِ غلطی صبح وشام

ایسے میں اقبالؔ کے یہاں خداداد مناظرِ فطرت کا موضوع بھی ثانوی درجے پر چلا جاتا ہے۔ پھر بھی وہ بشر وشعرا کی تسکینِ روح کے لئے وہ پیامِ مشرق میں کشمیر عنوان کی وہ دلکش نظم لکھتے ہیں جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

رخت بہ کاشمر کُشا کوہ وطن و دمن نگر

سبزہ جہاں جہاں بین لالہ چمن چمن نگر

ابھی اقبالؔ کے پیش وپس میں کئی کشمیر سرا شاعر میرا دامنِ دل کھینچ رہے ہیں لیکن میں مزید طوالت سے بچنے کے لئے صرف تین مزید نام شامل کرسکوں گا۔ اوّل پنڈت دیارام کاچرو خوشدلؔ کشمیری (وفات ۱۸۱۱ء) کے یہ دو شعر۔

اَلا اے صاحبانِ شہرِ کشمیر بگوش آرید حالِ زارِ دلگیر

مرا حُبِ وطن آشفتہ تر کرد نمے دانم چرا قسمت بدر کرد

دوم، مشہور کشمیری شاعر ولی اللہ متو کو ترجمہ کے لئے فارسی ''ہی مال'' میسر کرنے والے مولوی صدر الدین صدرؔ کے بھی آج کی تباہ حال ڈل جھیل کی پہلی نفاست سے متعلق دو شعر۔

خوشا کشمیر و خاکِ حُسن خیزش مُبارکباد بادِ مُشک بیزش

دِلش دِلجوتر است از چشمہ ٔ نور صفا پرُوردہ زِ آبش آبِ انگور

سوم، اقبالؔ کی درمندی اور حُبِ کشمیریاں کا سچا وارث میرولی اللہ ایڈوکیٹ، کشمیری قوم کی مجموعی بے حسی اور ضمیر فروشی کو یوں ہدفِ تنقید بناتا ہے۔

بگو کشمیریٔ افیون زدہ را مَے گُلرنگ را کیفیتے ہست

بیا کارے کُن و گرمِ عمل شو کہ نرم آہنگی تو آفتے ہست

بگو ایں بے سروسامانیت چیست چُو دستت مایہ دارِ صنعتے سہت

بفردوسِ زمین کشمیریٔ ما بخود نارِ جہنم آفرید است

بہ ذوقِ بندگی بُت مے تراشد زِ الطافِ خُداوندی بُریدست

فسوں خوردہ است از تزویر خویشاں ز سحرِ خواجگی از خود رَمید ست

دِلش محروم لذاتِ تمناست نمے دانم دریں پستی چہ دیدست؟

دِل کشمیریٔ کم آرزو را بدہ یارب تب و تابے تُوانے

نہ دیدم در بساطِ دہر ہرگز ہُنر مندے چو او محتاجِ نانے

☆......شفیع شوق

کشمیر۔غیر کشمیری مصوّروں کی نظر میں

یوں تو کشمیر قدیم ترین زمانوں سے ہی باہر کی دنیا کے لئے دلچسپی کا مرکز رہا ہے، لیکن جب ۱۶۶۵ء میں مغل بادشاہ اورنگ زیب کا ذاتی طبیب فرانسز برنیئر (Francis Bernier) کشمیر آیا، وہ یہاں کے منظر کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ برنیئر نے یہاں رہ کر اور یہاں سے واپس دلّی جا کر یورپ کے دوستوں کے نام خطوط لکھے جن میں کشمیر کے فطری حسن، عوام اور رسم و رواج کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔ ۱۶۷۶ء میں ان کے خطوط کا مجموعہ Travels in India کے نام سے چھپ گیا۔ یہ کتاب پڑھ کر پورے یورپ میں ہل چل مچ گئی اور یہاں آنے کی امنگ بیدار ہوئی۔ یہ کتاب کشمیر کی ایک ایسی لفظی تصویر پیش کرتی ہے، جو حقیقی ہو کر بھی کسی طلسمی جگہ کی تصویر لگتی ہے۔ برنیئر نے اگر چہ لکیروں اور رنگوں کا استعمال نہیں کیا، پر کشمیر میں تین ماہ کے قیام کے دوران اسنے اپنے مشاہدے کو لفظوں کے سہارے یہاں کے کئی نظاروں کو سمیٹنا چاہا ہے۔ مثلاً نویں خط کا یہ اقتباس دیکھئے:

The numberless streams which issue from the mountains maintain the valley and the hillocks in the most delightful verdure. The whole kingdom wears the appearance of a fertile and a highly cultivated garden. Villages and hamlets are frequently seen through the luxuriant foliage. Meadows and vineyards, fields of rice, wheat, hemp, saffron and many sorts of vegetables, among which are intermingled

trenches filled with water, rivulets, canals, and several small lakes, add variety to the enchanting scene. The whole ground is enameled with our European flowers and plants, and covered with apple, pear, plum, apricot and walnut trees, all bearing fruit in great abundance.(379)

ترجمہ: پہاڑوں میں سے پھوٹتی بے شمار ندیاں وادی اور پہاڑیوں کی شادابی برقرار رکھتی ہیں۔ پوری سلطنت ایک وسیع ذرخیز باغ کی شکل میں ہے جس کی پوری طرح آبیاری کی گئی ہو۔ گاؤں اور چھوٹی چھوٹی آبادیاں گھنے سرسبز درختوں کے بیچ میں ہر طرف نظر آتی ہیں۔ گھاس کے میدان، انگور کے باغات، شالی کے لہلہاتے کھیت اور گیہوں، زعفران اور کئی طرح کی فصلوں کے کھیت ہر طرف نظر آتے ہیں۔ صرف بیچ بیچ میں تالاب، ندیاں نہریں اور جھیلیں ہیں۔ یہاں کی پوری زمین یورپی پھولوں اور پودوں سے سجی ہے۔ سیب ناشپاتی، آڑو، خوبانی اور اخروٹ ہر طرف نظر آتے ہیں جو کثرت سے میوہ دیتے ہیں۔

برنیئر کی کتاب میں شامل ایسے ہی کئی دلفریب نظاروں نے یورپ کے کئی شاعروں کے تخیل کو جگایا اور تخیل کی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے اور شاعری کے ذریعے دوسروں کو دکھانے لگے۔ ان شاعروں میں ٹامس مور (1852-1779) کا نام خاص کر قابلِ ذکر ہے جسنے اپنی طویل بیانیہ نظم ''لالہ رُخ میں کشمیر کی وادی کو مرکزی اہمیت دی۔ اورنگ زیب کی دختر لالہ رُخ اور ایران کے شہزادے فراموز کی شادی کا جشن شالیمار باغ میں منایا گیا۔ ٹامس مور نے برنیئر کے بیان کے عینِ مطابق اپنے تخیل کی مدد سے گرد و پیش کے نظاروں کو لاجواب شبیہوں میں پیش کیا ہے۔ مثلاً:

Who has not heard of the vale of cashmere?
With its roses the brightest that earth ever gave its temples, and grottos, and fountains as clear
As the love-lighted eyes that hang over their wave?
Oh! To see it at sunset,-when warm o'er the Lake,

Its splendour at partinga summer eve throws,
Like a bride, full of blushes, when lingering to take
A last look of her mirror at night ere she goes!-
When the shrines through the foliage are gleaming half shown,
And each hallows the hour by some rites of its own.
Here the music of prayer from a minaret swells,
Here the magian his urn full of perfume is swinging.
Or to see it by moonlight, - when mellow sly shrines
The light o'er its palaces gardens and shines;
When the waterfalls gleam like a quick fall of stars,
And the nightingale's hymn from the Isle of Chenars
Is broken by laughs and light echoes of feet
From the cool, shining walks where the young people meet-
Or at morn, when the magic of daylight awakes
A new wonder each minute, as slowly it breaks,
Hills, cupolas, fountains, call'd forth every one
Out of darkness, as they were just born of the Sun.
When the Spirit of Fragrance is up with the day,
From his haram of night-flowers stealing away;
And the wind, full of wantonness, woos like a lover,
The young aspen-trees till they tremble all over.
When the East is as warm as the light of first hopes,
And day, with his banner of radiance unfurl'd,
Shines in through the mountainous portal that opes,
Sublime, form that Valley of bliss to the world!

۱۸۳۳ء میں ایک انگریز سیاح گاڈفرے ٹامس واینے (Godfrey Thomas Vigne) نے کشمیر اور دور شمال مغربی علاقوں کی سیر کی۔ اپنے سفرنامے Travels in Kashmir, Ladak, Iskardo میں اُس نے ایشیا کے ممالک میں کشمیر کی اہمیت کو سمجھ کر لکھا:

Kashmir will become the focus of Asiatic civilization; a



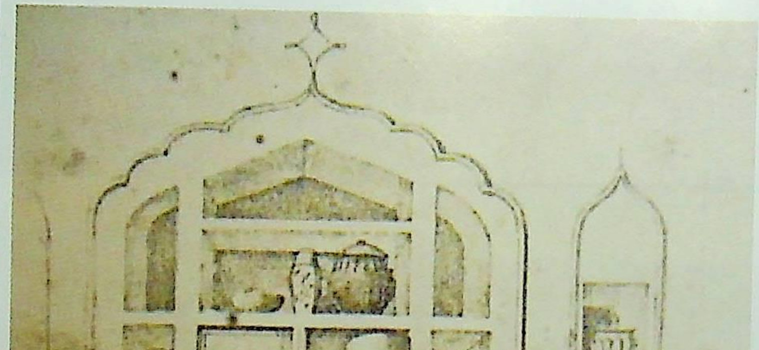
[illegible]



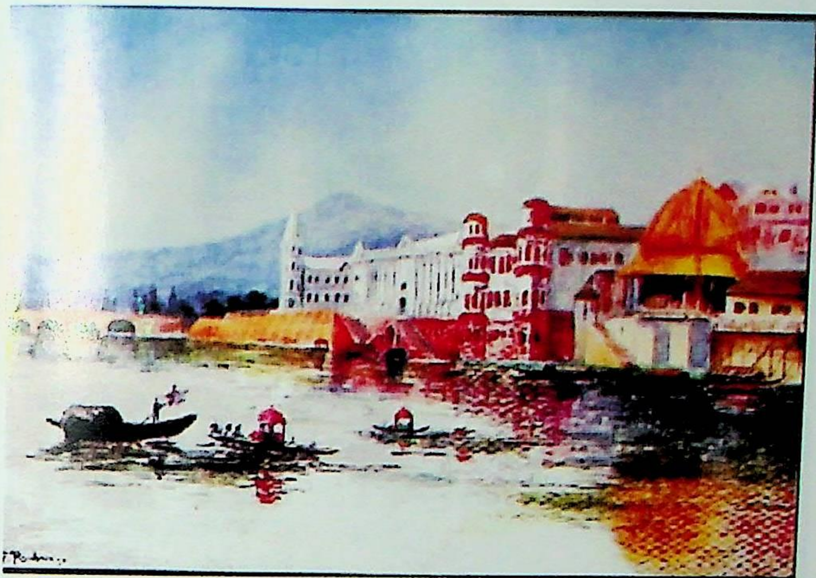
ٹامس مور



فلورنس پاربری



واینی کے ہاتھوں بنائی گئی ایک کشمیری رقاصہ کی یادگار تصویر





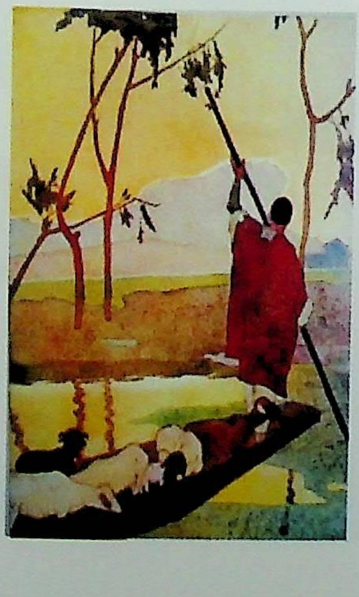
1۔ مہاراجہ اشوک اور گوپادری
(پینٹنگ: اے این ٹیگور)



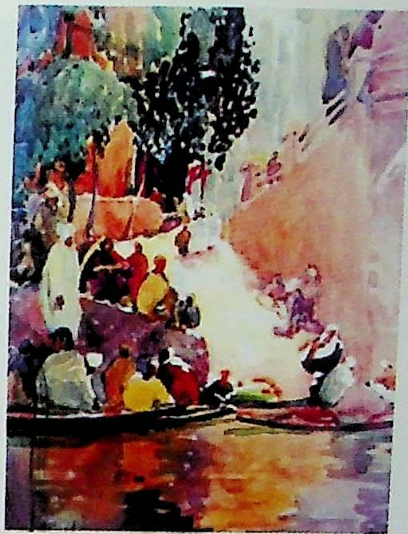
2۔ [illegible]
([illegible]
ٹیگور)



3۔ حُسنِ کشمیر
(پینٹنگ: G. Hadenfeldt)

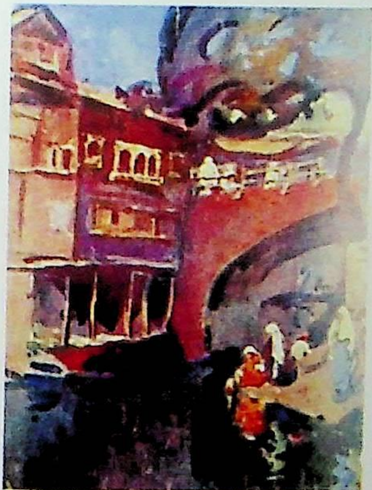


چرواہا اور اسکے ساتھی
(پینٹنگ: G. Hadenfeldt)



ژونٹھی کول کا ایک دِن

(پینٹنگ: سلطان احمد)



یار بل

(پینٹنگ: ایل سلطان احمد)

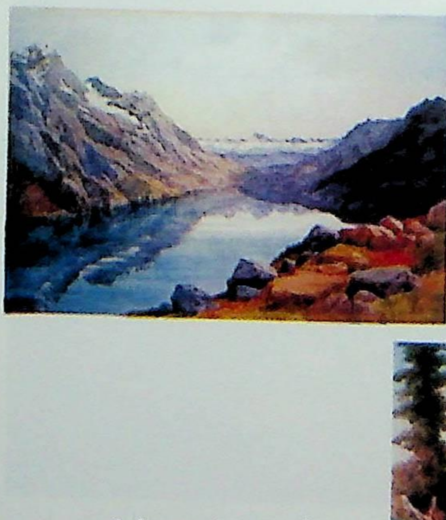


کشمیر کا مسافر

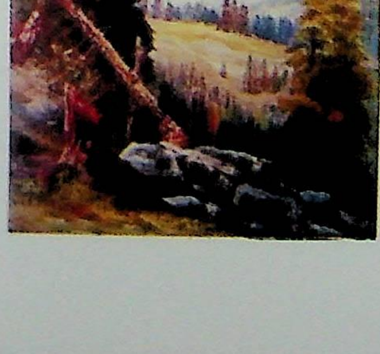
(پینٹنگ: G. Hadenfeldt)



شاہ جہاں اور
شالیمار کی ایک شام



جھیلوں کی سرزمین
(پینٹنگ: کرنل جی سٹراہن)



ننگہ پربت کا دور سے نظارہ
(پینٹنگ: کرنل جی سٹراہن)



نسیم اور تصوّرِ جانان
(پینٹنگ: اے این ٹیگور)



ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
(پینٹنگ: اے این ٹیگور)



خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں
(فوٹو: فلورنس پاربری)



۲۵ سو سال پرانا شو مندر ۔۔۔ [illegible]



امام باڑہ ۔۔۔ نور خواہ تحصیل بونیار



بونیار Temple



زیارت شریف بابا عبدالغفور صاحب ۔ [illegible] تحصیل بونیار



[illegible] (۱۹۲۳ ۔ [illegible])



مولانا [illegible] حسن حسرت



گوردوارہ چھٹی پادشاہی ۔ [illegible] اوڑی



مولانا محمد سعید مسعودی، شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ اور بخشی غلام محمد

miniature England in the heart of Asia.... and, presenting so many attractions, it will become the sine qua non of the oriental traveler, when he be disposed to consider it as the Ultima Thule of his voyage, or a resting place, when he may start again for still more distant regions.

وائنی نے نہ صرف کشمیر کے طبعی حسن کی انتھک تعریفیں کی ہیں بلکہ یہاں کے دیہات کا دورہ کر کے یہاں کی ثقافت کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔ اُس نے شانگس میں رہ کر صمد شاہ نام کے ایک رئیس سے دوستی کی اور اچھ بَل اور دیگر سیر گاہوں کی سیر کی۔ اُس نے صمد شاہ کی تصویر بنائی ہے اور کتاب میں شامل کی ہے۔ اس وقت کے مردانہ لباس کی مکمل عکاسی اس تصویر میں ہے۔ صاحب دستار صمد شاہ کی آنکھوں کی چمک، اس کے ماتھے کی کشادگی، ناک کی اونچائی اور ریش کی رونق سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے پہلے تقریباً دو سو سال پہلے مردانہ وضع کے کیا اقدار تھے۔

وائینے نے یہاں کی رقاصاؤں کے فن سے متاثر ہو کر ایک مقبول کشمیری گانے کی نوٹیشن بھی دی ہے۔ ان رقاصاؤں کو اُس نے nauch girls لکھا ہے۔ ایک رقاصہ کی شاہانہ حشمت اور کو اسنے اپنے قلم سے نہایت ہی باریک بینی کے ساتھ دکھایا ہے۔ اگر چہ وائینے نے رنگوں کا استعمال نہیں کیا ہے تاہم لکیروں کے ماہرانہ استعمال سے ہر پہلو کی تفصیلی عکاسی ہوتی ہے۔ وائینے نے تصویر میں دکھائی گئی رقاصہ کا نام اور پتہ نہیں دیا ہے لیکن آس پاس کے شان وشوکت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ رقاصہ یا تو دربار میں رہی ہے یا کسی بڑے تفریحی مرکز کی مالک۔ سامنے صراحی اور جام حاضر ہے۔ دائیں طرف طرح طرح کے میوہ جات ہیں۔ رقاصہ کے پیچھے ایک ضخیم گاؤ تکیہ ہے۔ دیوار میں محرابی الماری میں آرائشی سامان ہیں۔ رقاصہ طرح طرح کے زیورات سے لدھی ہوئی ہے۔ سرتاپا قیمتی اور شاہانہ طرز کی پوشاک میں ملبوس ہے۔ وائینے کے مطابق شانگس کا گاؤں ایسی رقاصاؤں کے لئے مشہور تھا۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے:

The village of Changus, but a few miles from Achibul, was

celebrated in times gone by as containing a colony of dancing girls, whose singing and dancing were more celebrated than those of any other part of the valley. I have heard Sumad Shah and other old men breathe forth sighs of regret, and expressions of admiration, when speaking of days that were past; and the grace and beauty of one of the Changus' danseuses, whose name was, I think Lyli, and long since dead, seemed to be quite fresh in their re collection.(349)

وائینے جب شانگس کا دورہ کر رہا تھا، اسے وہاں کے بزرگوں نے آہیں بھر کر کہا "اب پرانے زمانے کی رقاصاؤں کا فن کہاں!" وہ کسی لیلےٰ نام کی رقاصہ کو یاد کر کے افسردہ ہوتے تھے۔

ٹی ایس سوِنبرن (T.S.Swinburn) انیسویں صدی کے پہلے حصے میں کشمیر آیا۔ اس کے سفرنامے A Holliday in the Happy Valley میں ۲۲ تصویریں شامل ہیں ۔ یہ تصویریں دیکھکر لگتا ہے کہ وہ اس زمانے کی مقبول تحریک امپرشنزم سے بہت متاثر رہا ہے۔ اس تحریک سے وابستہ فنکاروں کے فن کی ایک نمایاں بات یہ ہے کہ کھلی فضا سے حاصل ہونے والے احساسات کو ہی تصویر کا روح بنایا جاتا ہے۔ سونبرن خود امپرشنزم کے سب سے مقبول فنکار مونے (Monet) سے متاثر دکھائی دیتا ہے۔ اسنے وادی کے گونا گوں نظاروں کو نکھرتے رنگوں میں پیش کیا ہے۔

1۔ سرینگر کا ایک پرانا پل جو کبھی لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا تھا۔ اب کہاں؟

2۔ سرینگر سیلاب کے دنوں میں کتنا افسردہ اور ویران لگتا ہے۔ بھورے رنگ کی پرچھائیاں بے بسی کی داستان ہیں۔

3۔ ایک پرانے طرز کی کشتی پانی کی سطح پر انسانی حرکت کی ترجمان۔

4۔ غروب آفتاب میں تنہا آبادی۔

5۔ سفیدوں قطاروں کے بیچ میں شہر بابنڈ۔

6۔ جہلم کے خاموش پانی میں تنہا ناؤ کا سفر جاری ہے۔

7۔ جہلم شام کے گھنیروں میں سو رہا ہے جبکہ گوپادری کا مندر جاگ رہا ہے۔

8۔ بہار میں سرینگر کے بیچ میں رواں دواں نالہ مار شہر کے مکینوں کی شہہ رگ۔

9۔ دھند میں لپٹا ہوا پیر پانژال کشمیر کا نگہبان۔

10۔ کولہاے کی بولتی خامشی

11۔ لدروٹ کی تنہائیوں کی سرگوشیاں۔

12۔ گنگہ بل کے پانی کا تقدس۔

13۔ ہرمکھ کی پراسرار زبان۔

14۔ گلمرگ کی طرف جانے والا امنگ بھرا راستہ دعوتِ سفر۔

15۔ ننگہ پربت دردستان کی طلسمی دنیا پر پہلا حجاب۔

16۔ پہاڑیوں کے درمیان شفاف جھیل پاکیزگی کی علامت۔

فرانسز ینگ ہسبنڈ (Francis Younghusband, 1863 –) ۱۹۴۲ء مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور میں کشمیر آیا۔ انہی دنوں یہاں ایک یورپی مصوّر میجر مالینوکس (Major Molyneux) یہاں کے فلک بوس کوہساروں، خاموش وادیوں، مہکتے پھولوں، تیز رفتار دریاؤں اور فطرت کے دوسرے نظاروں سے متاثر ہو کر اپنے بیدار احساسات کو رنگوں اور لکیروں سے پیش کر رہا تھا۔ فرانسز ینگ ہسبنڈ نے اپنی کتاب Kashmir کو مالینوکس کی ۷۰ تصویروں سے آراستہ کیا۔ یہ کتاب ۱۹۰۹ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ (اب یہ کتاب تصویروں کے ساتھ بازار میں دستیاب ہے۔)

مالینوکس کی ان ستر تصویروں کی خاص بات یہ ہے کہ اسنے موتنے سے متاثر ہو کر بھورے رنگ کے بجائے روشن اور نکھرے رنگوں کا استعمال کیا۔ اس کی تصویروں میں Renoir کا اثر بھی محسوس ہوتا جو لینڈ سکیپ میں ہمیشہ نور اور سرور کو کینوس پر اتارتا تھا۔ اس کی تصویروں میں انسانوں کی غیر موجودگی کے باوجود انسانی خصائص کو فطرت کے مناظر کی

صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ تصویریں اس طرح ہیں:

1۔ ہری بھری وادی کے رنگ بسنتِ پس منظر میں تختِ سلیمان۔

2۔ حضرتِ شاہمدان کی مسجد کے سامنے جہلم پر بنا یہ لکڑی کا قدیم پل۔

3۔ ہریالی میں چھپا ہوا بربر شاہ کا پرانا پُل۔

4۔ خاموش مندر کے سامنے پانی میں خاموشی کی ناؤ۔

5۔ نالہ مار کبھی کشمیر کی زینت۔

6۔ شال بافوں کے مکانوں میں کسی قدیم صوفیانہ گانے کی دھُن۔

7۔ نالہ مار کا دوسرا منظر جنت گم گشتہ کی یاد۔

8۔ پربت پر قائم قلعے کا کھلا دروازہ بہار کی آمد کے لئے کوشاں۔

9۔ نشاط باغ کے سرسبز چنار۔

10۔ سرینگر کا یہ الف لیلوی طرز کا قدیم بازار۔ (مرحوم قاضی غلام محمد کی نظم "اکھ پرون شہر" کی بصری صورت۔) مکانوں کی برزہ چھتوں پر یہ بانلی پھول اب اسی تصویر میں قید ہیں۔

11۔ پنگھٹ پر سہیلیوں کی آپس میں سرگوشیاں۔ گھر جانے کو جی نہیں کرتا۔

12۔ ڈل جھیل کے یہ مسکراتے اور مہکتے پمپوش حسن کی مختصر عمر۔

13۔ شالیمار باغ کا یہ پرسکوں گوشہ بادشاہوں کی رنگین شاموں کی داستان۔

14۔ کرالہ یار پر اکبر کا یہ پُل۔ اس کے سامنے کوئی دوشیزہ اپنے مہندی لگائے پاؤں دھو رہی ہے۔

15۔ چنار باغ کے نزدیک یہ خاموش مندر۔

16۔ دریائے جہلم اور غروب آفتاب کا پُر جلال منظر۔

17۔ جب رات کے اندھیروں میں پانی سونے لگتا ہے۔

18۔ جہلم جب صبح سویرے اپنی رفتار سے بہتا دکھائی دیتا ہے۔

مالینوکس شہر سرینگر کی مشرقی جمالیات سے بے حد متاثر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ

وہ کشمیر کے جنگلوں اور پہاڑوں کی کروڑوں سال پرانی خوبصورتی سے دیوانہ وار عشق کرتا تھا۔ اسنے لکھا ہے کہ یہاں کے پہاڑوں کی شان اور خوبصورتی کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ وہ جگہ جگہ گھومتا رہا اور فطری حسن مین چھپی حیرت اور دلکشی کو رنگوں میں اتارتا گیا۔ وہ انہی پہاڑوں کے بیچ دشوار گزار راستوں سے ہندوستان سے چین گیا۔ وہاں کئی سیاسی معاملوں پر گفتگو کر کے انہی پہاڑوی راستوں سے کشمیر لوٹ آیا۔ اپنے سفر کے دوران اس نے کئی منظر کو رنگوں میں قید کیا۔ چند تصویریں اس طرح ہیں:

1۔ کائج ناگ بہار کی آغوش میں۔
2۔ کنزلون سے آگے گُریز کی حسین وادی جس کا ہر چپہ تاریخ کی داستان ہے۔
3۔ گلمرگ سے اوپر کھلن مرگ کے یہ سفید پوش سر بلند کوہسار۔
4۔ ننگہ پربت جو کمری درّے سے دکھتا ہے۔
5۔ وادیٔ سندھ میں گنگہ بل کا یخ بستہ پانی۔
6۔ غروبِ آفتاب کے وقت شیش ناگ کی تنہائی کی داستان۔
7۔ کولہائے کا گلیشیر کا کروڑوں سال کی خاموشی۔
8۔ ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے''۔
9۔ رامپور اور جہلم ویلے روڑ۔
10۔ پہاڑی دھند لکے
11۔ ارن سے عیان ہرمکھ کا جلوہ۔
12۔ کنگن سے اوپر سندھ وادی میں کوٹوال۔
13۔ سندھ وادی کا دروازہ جو شاہراہِ ابریشم کے کاروانوں کو پکارتا ہے۔
14۔ لدرو وادی میں 'سنسا' ناگ۔
15۔ وادیٔ سندھ میں گگن گیر۔

۱۹۰۲ء میں برطانیہ کی ایک ذہین اور حسین جواں سال میم صاحب فلورنس

پاربری(Florence Parbury: 1880-?)اپنی والدہ کے ہمراہ کشمیر کے دورے پر آئی۔ وہ زبردست ادبی سکالر ہونے کے ساتھ ساتھ مصوّر اور فن شناس بھی تھیں۔اس نے ٹامس مور کی شہرۂ آفاق نظم ''لالہ رُخ'' کو نہ صرف ایڈٹ کیا، بلکہ اس کے لئے ایک مفصّل دیباچہ بھی لکھا جس میں مغلوں کے عروج وزوال اور کشمیر کے ساتھ مغلوں کے تعلقات پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں تاریخ، ادب، دیومالا اور مشرقیات کے بسیار حوالوں سے لالہ رُخ نظم کو سمجھنے کی کوشش گئی ہے۔فلورنس پاربری کو موسیقی پر بھی دسترس تھی۔ اسنے نہ صرف ٹامس مور کی نظم کے چند اقتباسات کی موسیقی کی ترقیم کی تحریری اشارات میں دی ہے۔، بلکہ فارسی شاعر حافظ کی اس غزل کی موسیقی بھی دی ہے جس کا مطلع ہے:

مطرب خوش نوا بگو　　　　تازہ بہ تازہ،نو بہ نو

یہ کتاب The Emerald Set with Pearls کے نام سے لندن سے شائع ہوئی ہے۔اس کتاب کی نمایاں بات یہ ہے کہ اس میں تیس رنگ بستہ پینٹنگز شامل ہے۔یہ پینٹنگز اس زمانے کے زبردست مصوروں نے بنائی ہیں۔ ہر ایک پینٹنگ فلورنس پاربری کے رخسار کی مانند دلکش ہیں۔

ان تصویروں میں سب سے زیادہ دلکش وہ تصویر ہے جو فلورنس پاربری کی اپنی تخلیق ہے۔اس میں جہلم کے کنارے شیر گڑی اور مندر آسمان کی وسعتوں سے ہمکلام ہیں۔

یورپی سیاحوں کے سفرناموں میں مصوری کی شاہکاروں کے علاوہ سینکڑوں فوٹوگراف بھی شامل ہیں جن سے بیسویں صدی سے پہلے کے کشمیر کی تہذیب وثقافت کے گوناگوں پہلو روشن ہوتے ہیں۔

☆☆☆

☆......اصل: پروفیسر غلام رسول ملک
انگریزی سے ترجمہ: عابد احمد

انگریزی رومانوی ادب میں کشمیر کا تذکرہ

کوہ ہائے زنگ سارِ اونگر ۔۔۔ آتشیں دستِ چنارِ اونگر
در بہاراں لعل می ریزد زسنگ ۔۔۔ خیز داز خاکش یکے طوفانِ رنگ
کوہ و دریاؤ غروبِ آفتاب ۔۔۔ من خدارا دیدم آنجا بے حجاب

(اقبالؔ، جاوید نامہ)

کشمیر نے ہمیشہ بادشاہوں، فاتحوں، فطرت کے پرستاروں، ریشیوں، منیوں اور سب سے بڑھ کر تخلیقی جوہراور تخیّل سے بہرہ ور افراد کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس کی خوبصورتی اور پُراسراریت بیک وقت اس کی قوت بھی ہے، کمزوری بھی اور اس کی شکست و ریخت کی وجہ بھی۔ اس نے نہ صرف فاتحین کو اپنی طرف کھینچا، جنھوں نے اِسے بار بار لُوٹا بلکہ شاعروں اور تخلیق کاروں کو بھی، جنھوں نے اِس کو زمین پر جنت کی طرح چاہا۔ اِس کے ایک وسیع وعریض جھیل سے سرسبز وادی کے طور اُبھر آنے کے وقت سے لے کر اس نے اپنی تاریخ میں انقلابی اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے جس بات کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کشمیر انگلستان کی متحرک ادبی نشاۃِ ثانیہ یعنی اُنیسویں صدی کی رومانوی تحریک کے پیچھے ایک مضبوط محرّک بنا تھا۔ رومانوی دَور کے تخلیقی ادب کو کشمیر

نے کس طرح متاثر کیا ہے یہ نہ صرف رومانوی تحریک کا ایک روشن پہلو سامنے لانے اور نادرونایاب (Exotic) کی طرف اس کے زبردست میلان کے لحاظ سے اہم ہے بلکہ تخلیقی تخیل کے محرکات کو سمجھنے کے لئے بھی لازمی ہے۔

رومانوی دَور کے شعراء نے کشمیر کے بارے میں برنیے (Bernier) اور ٹرونیے (Travernier) کے سفرناموں، ٹامس موریس اور الیگزینڈر ڈاؤ کی ہندستان کی تواریخ، ابوالفضل کی آئینِ اکبری جس کو فرانسس گلیڈوِن نے 1780ء میں انگریزی میں منتقل کیا تھا اور سرولیم جونز کے کشمیر سے متعلق اشارات سے جانا تھا۔ کشمیر بحیثیتِ دُنیاوی جنت یا حقیقی باغِ عدن کے طور پر اِن ادبی کارناموں اور اپنے وقت کی دیگر انگریزی اور غیر انگریزی تحریروں سے بار بار اُبھر کر آنے والی ادبی علامت ہے۔

بیلی، والٹیئر اور جونز انسانی تہذیب کے واحد منبع میں یقین رکھتے تھے۔ ان سب کا اس بات پر اتفاق تھا کہ یہ مرکز ایشیا میں تھا جس کو دوسرے لفظوں میں عدن یا بہشت کہا جاتا ہے۔ بیلی کا نظریہ یہ تھا کہ یہ مرکز تاتار میں تھا۔ جس کے مربیّوں اور سرپرستوں میں اسطوری شہنشاہ قبلا خان جیسی شخصیات شامل تھیں۔ اس کے برعکس والٹیئر نے اس مرکز کو ہندوستان میں قرار دیا۔ ریلے (Raleigh) اور بولز اپنی نظم The Spirit of Discovery by Sea (جس کو کولرج نے بڑے انہماک سے پڑھا تھا) اس بات کا اظہار کیا کہ دُنیا کا وہ مرکز جہاں پر نوح کی کشتی نے قرار کیا تھا ہندوکش کے پہاڑی سلسلے میں واقع ہے۔ ایک اور تصوّر جس کا علمی حلقوں میں کافی اعتبار تھا کے مطابق سکندر اعظم کے سپاہیوں نے Prometheus کا غار کھوج نکالا تھا اور وہ پتھر بھی جس کے ساتھ پرومیتھیس کو ہندوکش (پیر پنچال) میں باندھا گیا تھا۔

ہندوکش کا ذکر بعد میں شیلی کے Prometheous Unbound میں ایک ایسی خوبصورت وادی کے سلسلے میں بھی اُبھر آیا، جس کو کوئی نام تو نہیں دیا گیا ہے لیکن جو بلاشک کشمیر ہی لگتی ہے۔

بر بیے اپنے سائینسی مزاج کی وجہ سے ایک معتدل، منصفانہ، غیر متعصب مشاہد اور چیزوں کی وضاحت کرنے والا تھا۔ لیکن وہ بھی کشمیر کو بیان کرتے وقت مسحور ہو جاتا ہے اور اس کو انڈیز کی جنت کہتا ہے اور مزید کہتا ہے:

It may therefore be reasonably concluded that the Garden of Eden was planted in Kaschemire, and not, according to the received opinion, in Armenia...[1]

ولیم موریس حالانکہ وادی فُرات کے بہشت کے حقیقی جگہ ہونے میں یقین رکھتا تھا لیکن وہ بھی کشمیر کے متبادل دعویٰ کو قبول کرنے کے لئے تیار تھا۔

جونز کا رجحان بہشت کو وسط ایشیا میں ڈھونڈنے کی طرف تھا لیکن کشمیر جس کو اس نے کبھی دیکھا تو نہیں تھا لیکن جس کے بارے میں اس نے دوسروں سے کافی سنا تھا، اس کے لئے اس کا جوش و جذبہ زبردست تھا۔

....no nation at this day can vie with the Arabians in the delightfulness of their climate, and the simplicity of their manners. There is a Valley, indeed, to the north of Indostan, called Cashmir, which, according to an account written by a native of it, is a perfect garden, exceedingly fruitful and watered by a thousand rivulets....[2]

رومانوی ادب کے بڑے ادیبوں میں سے اکثر کشمیر سے کافی متاثر تھے۔ ان میں خاص طور پر رابرٹ سودی، ٹامس مور، مس سڈنی، ویلسن، کولرج اور شیلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حالانکہ یہ سب کشمیر کو بہ حیثیت کائناتی بہشت سامنے لاتے ہیں، لیکن مس اوینسن، کولرج اور شیلی میں اس شبیہ کا تصور زیادہ وسیع، عمیق اور ادبی اعتبار سے کامل ہے۔ خاص طور پر کولرج اور شیلی کی نظموں میں۔ مس اوینسن کولرج اور شیلی محض جغرافیہ سے آگے مابعد الطبیعاتی حدود میں پہنچ جاتے ہیں اور کشمیر کے روحانی اور پراسرار پہلوؤں پر وجدانی اور غیر مرئی گرفت دکھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کولرج اور شیلی میں تمام متعلقہ مواد جذب ہو کے ایک زبردست تخلیقی تبدیلی سے گزر کر پہلے درجے کی شاعری ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

سودی نے نہ صرف ٹرور یے اور برنیے کے سفرناموں بلکہ گلیڈ وِن کے آئینِ اکبری کے ترجمے اور مورلیس کی تاریخ اور ہندوستان کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ ان مواخذ میں کشمیر کی تفصیلات سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے ولیم ٹیلر William Taylor of Norwich کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کرنے کے لئے لکھا کہ "وہ کشمیر کے خوش کن علاقے" کو[3] Thalaba the Destroyer... میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ لیکن Thalaba کا کردار اِتنا المناک تھا جو کشمیر جیسی خوشحال وادی کی ترجمانی کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ لیکن The Curse of Kehama میں سورگ کی تفصیلات میں وادی بلاشک موجود ہے۔ ابوالفضل، برنیے، ڈاؤ اور مورلیس کی صدائے بازگشت کو ان سطور میں آسانی سے سنا جاسکتا ہے۔

Through the deep shade of aromatic trees,
Half-seen, the cataracts shoot their gleams of light,
And pour upon the breeze
Their thousand voices, far away the roar,
In modulations of delightful sound,
Half-heard and ever-varying, floats around
Below, and ample lake expanded lies,
Blue as the o'er-arching skies.[4]

مندرجہ بالا مواخذ کے علاوہ ٹامس مور نے جیمس اینڈرسن کے تزکِ جہانگیری کے ترجمے کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ شاید یہ بھی ایک وجہ رہی ہوگی کہ وہ مغلوں کی شان وشوکت سے اتنا مسحور ہوگیا کہ یہ اس کی لالہ رُخ کا کلیدی سُر بن گیا جس کی کہانیوں میں کشمیر کا سفر اس کا جوڑنے والا دھاگا بن گیا۔ حالانکہ اس کتاب میں کشمیر شروع سے ہی موجود ہے لیکن اس کے تذکرے کا موقعہ آخری کہانی The Light of Haram کے شروع میں آتا ہے۔

Who has not heard of the vale Cashmere,
With its roses the brightest that earth ever gave,
Its temples, grottos, and fountains as clear
As love-lighted eyes that hang over their wave!

Oh! To see it at sunset, ...when warm o'er the lake
Its splendor at the parting a summer eve throws
Like a bride, full of blushes, when lingering to take
A last look of her mirror at night ere she goes:
When the shrines through the foliage are gleaming half-shown
And each hallows the hour by some rites of its own...
Or to see it by moonlight, ...when mellowly shines
The light o'er its palaces, gardens and shrines;
When the waterfalls gleam like a quick fall of stars...
Or at morn, when the magic of daylight awakes
A new wonder each minute, as slowly it breaks...[5]

(۲)

ساودی اور مور کشمیر کے ارضی حسن سے زیادہ مرعوب ہیں اور اس سے آگے جانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کے برعکس کولرج (شیلی اور اس کے بعد کسی حد تک Mis Sydney Owenson کی طرح) کشمیر کی پُراسراریت، اس کی سرّی اور روحانی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ جو برنیے اپنے کٹر سائنسی اور معروضی رویہ کی وجہ سے ماننے کیلئے تیار نہیں تھا۔ سودی (Southey) اور مور کشمیر کے قدرتی حُسن سے حد درجہ متاثر ہیں اور اس سے پرے دیکھنے کی طرف کوئی التفات نہیں کرتے۔

جارج فوسٹر پہلا برطانوی تھا جس نے سب سے پہلے 1783ء میں کشمیر کا دورہ کیا، اس کے بقول برنیے کا کشمیر کے بارے میں ایک نمایندہ مسلمان کا سا نقطۂ نظر تھا۔ لیکن اس کے برعکس عہدِ وسطیٰ کے مسلمان ابوالفضل کی آئینِ اکبری کشمیر کے بارے میں ہندو عقیدے سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب رومانیت پرستوں کو فرانسس گلیڈون کے ترجمے کے ذریعے مہیا تھی۔ اس رائے کے مطابق کشمیر نہ صرف قدرتی حسن والی بلکہ پراسرار دھرتی بھی ہے۔ اس کی پراسراریت اس کے قدرتی حسن کے ساتھ ہی وجود میں آئی تھی۔ ہندو اساطیری عقیدے کے مطابق کشمیر کا دیوتا نیل ناگ ہے اور یہ ایک ایسا واہن

ہے جس کے اوپر خود وشنو اس کائینات کی تخلیق کی دیکھ ریکھ کرتا ہے۔ یہ نیل ناگ ہی تھا جس نے اس وادی کے جھیل سے وجود میں آنے کے بعد یہاں اس شرط پر انسانی بستی کی اجازت دی کہ بسنے والے لوگ ناگوں کی پرستش کریں گے جو پورے کشمیر میں پانی کے چشموں کی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کشمیری زبان میں پانی کے چشموں کے لئے ناگ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ان ناگوں میں ویری ناگ (مضبوط سانپ) بھی شامل ہے جو کشمیر کی پہچان کی علامت یعنی دریائے جہلم کا منبع بھی ہے۔ قدیم کشمیری اساطیر کے مطابق دریا اصل میں دیویاں ہوتی ہیں جن کی عزت اور پوجا کی جانی چاہئے۔ تیزی سے ختم ہونے کے باوجود اس عقیدے کی باقیات ایک روایتی کشمیری کے اس احساس سے جھلکتی ہیں کہ دریاؤں اور تالابوں کو گندہ نہیں کرنا ہوتا ہے۔

سادھو، سنت اپنی روحانی طاقت کے بل بوتے پر دریا کو ایک دیوی کی صورت میں کھڑا کر کے اس کے منبع تک پہنچ سکتے ہیں۔ ایسے روحانی بزرگوں کا تارک الدنیا ہی ہونا ضروری نہیں۔ جیسا کہ قدیم سنسکرت کتابیات میں آیا ہے کہ ایک بادشاہ ایک روحانی بزرگ بھی ہوسکتا ہے اور روحانی اور دنیاوی طاقت دونوں کا مالک ہوسکتا ہے۔ شاید عظیم قبلا خان ایک ایسا ہی شہنشاہ تھا، جس کے درباری، بقولِ مارکوپولو، کشمیر سے تعلق رکھنے والے سادھو اور بھکشو تھے جن کو مارکوپولو بادشاہ کے جادوگر کہتا ہے۔ مارکوپولو کے مطابق، ان میں سے ایک قرانطاس بخشی تھا۔ یہ یقین کہ ایک بادشاہ بیک وقت سنت بھی ہوسکتا ہے کشمیر میں شاہمیری دور تک قائم رہا۔ زین العابدین کے بارے میں ابھی بھی یہ مشہور ہے کہ اس نے اننت ناگ ضلع میں پانی کی ندی کو اپنے پیچھے پہاڑ پر چڑھوایا اور اس لئے یہ ندی ابھی بھی شاہ کول (شاہی ندی) کے نام سے مشہور ہے۔

ایک اور روایت جو رومانوی ادب کے دور میں جی۔ پی۔ مرانا، ڈبلیو براڈ شا اور جان مارشل جیسے ادیبوں کے ذریعے مشہور ہوئی، یہ تھی کہ کشمیر کے پہاڑوں پر ایسے انسان بستے ہیں جو صدیوں زندہ رہتے تھے اور طویل مدت تک مراقبے کی حالت میں اپنی سانس

ڈوب کر بے حس و حرکت رہ سکتے تھے بشرطیکہ انکے جسم کو گرم رکھا جائے۔ The Turkish Spy نامی کتاب نے درویش پیر پنچال کو سرزمینِ ہند کے مقدّس مرجع اور مشرق کے اپالو کی حیثیت میں پیش کیا، جس کی زیارت کے لئے لوگ اطراف واکناف سے آتے تھے۔ علاوہ بریں، وادی کو سرسوتی یعنی شاعری کی دیوی کی آماجگاہ کے طور پر بھی دیکھا جاتا تھا۔

کولرج میں ہمیں کشمیر کے حسن اور ہیبت ناک پُراسراریت کے لئے زبردست ذوق وشوق دکھائی دیتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے قبلا خان اور زین العابدین جیسے بادشاہوں میں دُنیاوی جاہ وجلال کے ساتھ ساتھ درویشی بھی پائی جاتی ہے۔ اُس کا قبلا خان اس امتزاج کی ایک بہترین مثال بھی ہے اور اس امر کی توضیح بھی کہ کس طرح ایک تخلیقی فنکار اپنی کیمیاگری سے ایک نئی تخلیق کو توڑ پھوڑ اور تعمیرِ نو کے عمل سے گذار کر معرضِ وجود میں لاتا ہے۔ وہ کشمیری دیومالائیت اور اس سے متعلق پُراسراریت سے بہت زیادہ واقف نہیں تھا اور اِس موضوع سے متعلق ان تفصیلات سے بے خبر تھا جو اُس کے بعد دستیاب ہوئیں۔ اس کے باوجود حیرانگی کی بات یہ ہے کہ وہ ریت کے ایک دانے میں ریگستان دیکھ پایا اور اپنی تھوڑی بہت ۔ ۔ نگاری ہی کی مدد سے اس راز کی گہرائیوں میں اتر گیا جس کو کشمیر کہتے ہیں۔ بے شک وہ بریئے کو تفصیل سے پڑھ چکا تھا۔ پیش نظر موضوع کی مناسبت سے بریئے کے کشمیر سے متعلق بیانات میں سے مندرجہ ذیل اقتباس قابلِ غور ہیں:

Returning from Send-brary, I turned a little aside from the road to go and lie at Achiavel, which is a house of pleasure of the ancient kings of Kachemire, and at present of the great Mogl. That which most adorns it is a fountain.... It breaks out of the earth, as if by some violence. It ascends up from the bottom of a well, and with such an abundance might make it to be called a river rather than a fountain.... The garden itself is very fine, there being curious walks in it, and store of fruit-bearing trees...7

The most beautiful of all these gardens is Chah-limar (Shalimar). The entrance from the lake is through a spacious canal, bordered with green turf, and running between two rows of poplars... A second canal still finer than the first, then conducts you to another summer-house at the end of the garden... The summer houses are placed in the midst of the canal, consequently surrounded by water...8

I was indeed to quit the high road for the sake of approaching a large lake (Wular)... In the center of the lake is a hermitage, with its little garden, which it is pretended floats miraculously upon the water... It be the tradition that one of the ancient kings of Kachemire, out of mere fancy, built it upon a number of thick beams fastened together.9

"کشمیر کا وہ قدیم بادشاہ جس کا ذکر آخری اقتباس میں ہے زین العابدین ہے جس نے تیرتے باغات سن ۱۴۴۳ء میں بنوائے۔"

برنیے اور مورلیس سے ہی کولرج کو امرناتھ گپھا کے بارے میں بھی پتہ چلا تھا اور اس نے اپنے Gutch Notebook میں ایک اندراج ان الفاظ میں کیا ہے:

In a cave in the mountains of Cashmere is an image of ice, which makes its appearance thus... two days before the new moon there appears a bubble of ice: which increases in the size every day till the 15th day, at which it is an ell or more in height: then, as the moon decreases, the image does also till it vanishes...[10]

قبلا خان نامی نظم میں کشمیر کے اس حسن اور پراسراریت کو جن کا اظہار ان تفصیلات سے ہوتا ہے عملِ تخیّل سے گزار کر انتہائی حسین اور پُر کشش تخلیقی جامہ پہنایا گیا ہے۔ نظم کی ابتداء قبلا خان کے محل کے اردگرد کے ماحول کی فطری اور فوق الفطری تفصیلات سے ہوتا ہے۔ اس ماحول کو بھی مزید دہشت اور جلال sublimity سے متصّف کرنے

کے لئے ایک پُر اسرار دریا کا سہارا لیا جاتا ہے جو ماحول کے وسط میں رواں ہے۔

In Xanadu did Kubla Khan
A stately pleasure-dome decree:

Where Alph, the sacred river ran
Through caverns measureless to man
Down to a sunless sea....

And there were gardens bright with sinuous rills,
Where blossomed many. an incense-bearing tree;
And here were forests ancient as the hills,
Enfolding sunny spots of greenery....

And from this chasm, with ceaseless turmoil seething,

As if this earth in fast thick pants were breathing,
A mighty fountain momently was forced.
And mid these dancing rocks at once and ever...
It flung up momently the sacred river....

The shadow of the dome of pleasure
Floated midway on the waves;
Where was heard the mingled measure
From the fountain and the caves.
It was a miracle of rare device
A sunny pleasure-dome with caves of ice!

نظم کے دوسرے حصے کا متکلم خود قبلا خان ہے جس کے لئے دریا کھڑا ہو کر گانے لگتا ہے اور بربط کی تال پر ناچنے لگتا ہے۔ اُس کا گانا اور موسیقی خالص الوہی شان رکھتے ہیں۔

Could I revive within me
Her symphony and song,
To such a deep delight it would win me,

That with music loud and long,
I would build that dome in air,
That sunny dome! Those caves of ice!
And all who heard should see them there,
And all should cry, Beware Beware!
His flashing eyes, his floating hair!
Weave a circle round him thrice,
And close your eyes with holy dread,
For he on honey-dew hath fed,
And drunk the milk of Paradise.

صاف ظاہر ہے کہ قبلا خان کشمیری روایات کے زین العابدین کی طرح ایک درویش بادشاہ کا روپ دھار لیتا ہے۔ جو ایک ندی کو دیوی کے روپ میں کھڑا کروا سکتا تھا۔ جہاں بھی وہ جاتا وہاں اپنے پیچھے چلوا سکتا تھا۔ قبلا خان کی اس تشریح سے اس عظیم نظم کی گہرائی اور معنی خیزی ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے اور بھی پہلو ہیں جو اس توجیہ کے موضوع سے باہر ہیں، لیکن یہ ضرور نظم کے چند ایسے گوشے سامنے لاتی ہے جو بصورتِ دیگر ہماری نظروں سے اوجھل ہو سکتے ہیں۔

(۳)

سِڈنی اُووِنسن جس کو عام طور پر لیڈی مورگن (1783-1859) کے نام سے جانا جاتا ہے اپنے دور کی جانی مانی ادیبہ تھی حالانکہ ان کے رومانی ناولوں کی مورخوں نے خاطر خواہ پذیرائی نہیں کی۔ ان کے ناول The Missionary: An Indian Tale کا محلِ وقوع کشمیر ہے۔ ناول میں اس دور کے مستشرقین بالخصوص برنیے اور ولیم جونز کا اثر صاف چھلکتا ہے۔ ناول بڑے پُر اثر اور فن کارانہ انداز میں برنیے کی کشمیر کی خوبصورت منظر کشی کو استعمال کرتا ہے اور دکھاتا ہے کہ محترمہ اُوونسن جونز ہندو دیوتاؤں کی شان میں مدح سرائی، ان کے کالی داس کے ڈراما شکنتلا کے ترجمہ اور ان کے ویدانت کے تصور کی تشریح سے کافی متاثر ہوئی ہیں۔

دی مشنری (The Missionary) مابعد الطبیعات اور افلاطونیت میں بھنی ہوئی ایک عشقیہ کہانی ہے۔ ایک جذباتی عیسائی مشنری ہلیرین کشمیر کا سفر کرتا ہے اور سنیاسی کا روپ دھار کر برہمنوں کو عیسائیت کی دعوت دیتا ہے۔ اس بیچ میں وہ ایک خوبصورت ہندو لڑکی لکشیما سے ملتا ہے، جو اکثر اپنا چہرہ ڈھانک کر رکھتی ہے۔ ہلیرین ایک کشمیری پنڈت سے اس پُر اسرار برہمن سادھو نی کے مذہب کی بنیادی جانکاری حاصل کرتا ہے۔ یہ مذہب ذہنی تاثرات کی تقدیم (Primacy) اور مادی حقیقت کے کسی بھی طرح کے آزاد وجود سے قطعی انکار میں یقین رکھتا ہے۔ جیسا کہ پنڈت خود کہتا ہے:

...And the external sensation would vanish into nothing. If the divine energy for a moment subsided: that the soul differs in degree, but not in kind, from the creative spirit of which it is a particle, and into which it will be finally absorbed: that. nothing has a pure and absolute existence, but spirit...[11]

یہ ویدانت کے بارے میں جونز کے اکثر مضامین کا نچوڑ ہے۔ کالی داس کی شکنتلا کی طرح، لکشما اپنے گرو کے زیر تربیت ایک چھوٹی سی گھاٹی میں رہتی ہے جس کے اردگرد گھنے درخت اور پھول ہوتے ہیں۔ ہلیرین اور لکشما سب سے پہلے دو دریاؤں کے سنگم کے پاس ملتے ہیں جہاں لکشماں ہر روز اپنی گایتری گانے کے لئے آتی ہے۔ دو دریاؤں کے سنگم کی طرح، ان دو کا ملنا مشرق اور مغرب کا علامتی سنگم ہے۔

She, like the East, lovely and Luxuriant
He, like the West, lofty and commeding...[12]

ایک شام کو ہلیرین لکشیما کو پیار کے دیوتا یعنی کامدیو کی تعریف میں گانا گاتے سنتا ہے۔ پہلے تو اس کو وحشت ہوتی ہے لیکن بعد میں وہ بے تحاشا اس کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دونوں برف کی ایک گپھا میں ملتے ہیں جہاں ہلیرین رہ رہا ہوتا ہے۔ لکشیما عیسائی اور ویدانتی تصورِ عشق کی مماثلت سمجھ کر ہلیرین کو بہ حیثیت ایک سنیاسی پسند کرتی ہے۔ تھوڑی ہی

That with music loud and long,
I would build that dome in air,
That sunny dome! Those caves of ice!
And all who heard should see them there,
And all should cry, Beware Beware!
His flashing eyes, his floating hair!
Weave a circle round him thrice,
And close your eyes with holy dread,
For he on honey-dew hath fed,
And drunk the milk of Paradise.

صاف ظاہر ہے کہ قبلا خان کشمیری روایات کے زین العابدین کی طرح ایک درویش بادشاہ کا روپ دھار لیتا ہے۔ جو ایک ندی کو دیوی کے روپ میں کھڑا کروا سکتا تھا۔ جہاں بھی وہ جاتا وہاں اپنے پیچھے چلوا سکتا تھا۔ قبلا خان کی اس تشریح سے اس عظیم نظم کی گہرائی اور معنی خیزی ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے اور بھی پہلو ہیں جو اس توجیہ کے موضوع سے باہر ہیں، لیکن یہ ضرور نظم کے چند ایسے گوشے سامنے لاتی ہے جو بصورتِ دیگر ہماری نظروں سے اوجھل ہو سکتے ہیں۔

(۳)

سِڈنی اُووِنسن جس کو عام طور پر لیڈی مورگن (1783-1859) کے نام سے جانا جاتا ہے اپنے دور کی جانی مانی ادیبہ تھی حالانکہ ان کے رومانی ناولوں کی مورخوں نے خاطر خواہ پذیرائی نہیں کی۔ ان کے ناول The Missionary: An Indian Tale کا محلِ وقوع کشمیر ہے۔ ناول میں اس دور کے مستشرقین بالخصوص برنیے اور ولیم جونز کا اثر صاف چھلکتا ہے۔ ناول بڑے پُر اثر اور فن کارانہ انداز میں برنیے کی کشمیر کی خوبصورت منظر کشی کو استعمال کرتا ہے اور دکھاتا ہے کہ محترمہ اُووینسن جونز ہندو دیوتاؤں کی شان میں مدح سرائی، ان کے کالی داس کے ڈراما شکنتلا کے ترجمہ اور ان کے ویدانتہ کے تصور کی تشریح سے کافی متاثر ہوئی ہیں۔

دی مشنری (The Missionary) مابعد الطبیعات اور افلاطونیت میں بھنی ہوئی ایک عشقیہ کہانی ہے۔ ایک جذباتی عیسائی مشنری ہلیرین کشمیر کا سفر کرتا ہے اور سنیاسی کا روپ دھار کر برہمنوں کو عیسائیت کی دعوت دیتا ہے۔ اس بیچ میں وہ ایک خوبصورت ہندو لڑکی لکشیما سے ملتا ہے، جو اکثر اپنا چہرہ ڈھانک کر رکھتی ہے۔ ہلیرین ایک کشمیری پنڈت سے اس پُراسرار برہمن سادھو نی کے مذہب کی بنیادی جانکاری حاصل کرتا ہے۔ یہ مذہب ذہنی تاثرات کی تقدیم (Primacy) اور مادی حقیقت کے کسی بھی طرح کے آزاد وجود سے قطعی انکار میں یقین رکھتا ہے۔ جیسا کہ پنڈت خود کہتا ہے:

...And the external sensation would vanish into nothing. If the divine energy for a moment subsided: that the soul differs in degree, but not in kind, from the creative spirit of which it is a particle, and into which it will be finally absorbed: that. nothing has a pure and absolute existence, but spirit..."[11]

یہ ویدانت کے بارے میں جونز کے اکثر مضامین کا نچوڑ ہے۔ کالی داس کی شکنتلا کی طرح، لکشیما اپنے گرو کے زیر تربیت ایک چھوٹی سی گھاٹی میں رہتی ہے جس کے اردگرد گھنے درخت اور پھول ہوتے ہیں۔ ہلیرین اور لکشیما سب سے پہلے دو دریاؤں کے سنگم کے پاس ملتے ہیں جہاں لکشیماں ہر روز اپنی گایتری گانے کے لئے آتی ہے۔ دو دریاؤں کے سنگم کی طرح، ان دو کا ملنا مشرق اور مغرب کا علامتی سنگم ہے۔

She, like the East, lovely and Luxuriant
He, like the West, lofty and commeding..."[12]

ایک شام کو ہلیرین لکشیما کو پیار کے دیوتا یعنی کامدیو کی تعریف میں گانا گاتے سنتا ہے۔ پہلے تو اس کو وحشت ہوتی ہے لیکن بعد میں وہ بے تحاشا اس کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دونوں برف کی ایک گپھا میں ملتے ہیں جہاں ہلیرین رہ رہا ہوتا ہے۔ لکشیما عیسائی اور ویدانتی تصورِ عشق کی مماثلت سمجھ کر ہلیرین کو بہ حیثیت ایک سنیاسی پسند کرتی ہے۔ تھوڑی ہی

دیر میں ہلیرین بھانپ لیتا ہے کہ وہ جذبۂ محبت سے مغلوب ہورہا ہے۔ اپنی کمزوری سے پریشان ہوکر وہ کشمیر چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ لیکن اُسی لمحہ لکشیما اپنے چہرے کا پردہ ہٹالیتی ہے اور کامدیو اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ دونوں کا ملن ہوجاتا ہے۔ لکشیما کو برہمن طبقہ برادری بدر کردیتا ہے تو دونوں کشمیر چھوڑنے کا فیصلہ کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے کیتھولک چرچ بھی ان کو اپنانے سے انکار کرتا ہے۔ ہلیرین کو قید کر کے تعذیبی موت کی سزا دی جاتی ہے۔ حالانکہ سزائے موت پھر عملائی نہیں جاتی لیکن لکشما اس غم میں گھٹ گھٹ کر مرجاتی ہے کہ ہلیرین مرچکا ہے۔ آخر میں ہلیرین ریشی کی زندگی گزارنے کے لئے کشمیر واپس لوٹ آتا ہے۔ کشمیر سے متعلق انگریزی رومانوی ادب میں The Missionary کئی لحاظ سے اہم ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ، مِس اوونسن ساودی اور مور کی طرح محض کشمیر کے قدرتی حسن کی ورافتہ نہیں ہے بلکہ اس کے مابعد الطبیعاتی پہلو کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسرے اور زیادہ اہم لحاظ سے The Missionary نے شیلی کو بہت متاثر کیا۔ اس ناول کا مذہب سے متعلق آزادانہ رویہ Inquisition کی برملا تنقید اور اس بگڑے ہوئے سماجی ماحول کی مذمت جس کا یہ ادارہ ایک حصّہ تھا اور بالخصوص اس کے اندر کشمیر کے حسن اور اس کی پراسراریت کا ملاپ سب شیلی کی طبیعت سے ہم آہنگ تھا۔ یہ سب اس تاثر سے مل کر جو شیلی نے Kehama سے حاصل کیا تھا ایک ایسی شاعری میں ظہور پذیر ہوا جو شیلی کے شہہ پاروں کو قبلا خان کا ہم پلہ بنادیتی ہے۔

کشمیر کے تعلق سے شیلی کی پہلی تخلیق خشیمہ Zainab and Kathema تھی جو لگتا ہے کہ اس نے The Missionary کو پہلی بار پڑھنے کے فوراً بعد لکھی۔ محبت اور موت کی اس وحشت ناک کہانی میں شیلی The Missionary کی ساری ترتیب کو الٹ پلٹ کرتا ہے۔ زینب جو ایک زبردست خوبصورتی والی کشمیری دوشیزہ ہوتی ہے اس کو برطانوی چھل کیٹ اور دھوکہ انگلینڈ پہنچادیتا

ہے اور اس کا منگیتر اس کا پیچھا کر کے وہاں تک پہنچ جاتا ہے جس کے بڑے سنگین نتائج دونوں کے لئے ظاہر ہوتے ہیں۔ نظم نہ صرف شیلی کے اوونسن سے بڑھ کر سامراجی، سیاسی اور سماجی نظام کی تنقید کے لحاظ سے اہم ہے بلکہ اس شاعرانہ قوت کی وجہ سے بھی اہم ہے جو اس تخلیقی تخیل سے نکلتا ہے جو مس اوونسن، ساودی اور مور کے برعکس حاصل کردہ مواد جذب کر کے اس کو حقیقی شاعری میں تبدیل کرتا ہے۔ مثلاً Thomas Moore کی اوپر درج کشمیر کی منظر نگاری کا نینب اینڈ خشیمہ کے اس passage سے موازنہ کریں۔

Yet Albions' changeful skies and chilling wind
The change from Cashmire's vale might well denote.
There, heaven and earth are ever bright and kind;
Here, blights and storms and damp forever float;
Whilist hearts are more ungenial than the zone-
Gross, spiritless, alive to no pangs but their own
There flowers and fruits are ever fair and ripe;
Autumn, there, mingles with the bloom of spring,
And forms unpinched by frost or hunger's gripe
' A natural veil o'er natural spirits fling...'[13]

جوں جوں شیلی میں پختگی آتی ہے۔ اتنا ہی اس کا تخلیقی جوہر کھلنے لگتا ہے۔ اس کے بعد والی نظم جس میں شیلی پھر کشمیر کا رُخ کرتا ہے Alastor ہے۔ اس نظم میں کشمیر اس طرح سامنے آتا ہے گویا یہ شیلی کی نفسیات کی گہرائی میں جا کر اس کا جزوِ لاینفک بن چکا ہے۔ یہ نظم ایک ایسے نوجوان شاعر کی کہانی ہے جو کائنات کے رازوں کو جاننا چاہتا ہے اور اس کے لئے زمان و مکان کے لامتناہی سفر پر روانہ ہو جاتا ہے لیکن اس کی پیاس کہیں نہیں بجھ پاتی۔ قدیم علوم اور ایک عرب دوشیزہ کی جنسی کشش بھی اس کی پیاس کو نہیں بجھا پاتے یہاں تک کہ وہ کشمیر پہنچ جاتا ہے۔

The poet wandering on, through Arabie
And Persia, and the wild Carmanian Waste,
And o'er the aerial mountains which pour down

Indus and Oxus from their icy caves,
In joy and exultation held his way;
Till in the vale of Çashmire, far within
Its loneliest dell, where odorous plants entwine
Beneath the hollow rocks a natural bower,
Beside a sparkling rivulet he stretched
His ianguid limbs...[14]

یہاں وہ ایک پردہ نشین دوشیزہ سے ملتا ہے جو بعد میں خود اس کی اپنی پرچھائیں ثابت ہوتی ہے۔

...He dreamed a veiled maid.
Sate near him, talking in low solemn tones.
Her voice was like the voice of his own soul
Heard in the calm of thought...[15]

محبت کے اس جلوے کے غائب ہونے سے پہلے یہ نوجوان اِس سے علم، حقیقت اور خیر کے اسباق سیکھ لیتا ہے۔ لیکن اس کا سفر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

شیلی کی عظیم ڈرامائی نظم Prometheus Unbound میں کشمیر ایک جغرافیائی وجود سے آگے بڑھکر ایک گہری علامت کا روپ دھار لیتا ہے۔ اپنے شاعرانہ وجدان کے ذریعے کشمیر کی روحانی گہرائیوں میں ڈوب کر، شیلی اس کو کوئی نام دئے بغیر اس کی اور پراسراریت کا جوہر پیش کرتا ہے۔ اس کو وہ A vale in the Indian Caucasus کا نام دے کر یوں اس کی منظر کشی کرتا ہے۔

.....The eastern star looks white,
And Asia waits in that far Indian vale,
The scene of her sad exile; rugged once
And desolate and frozen, like the ravine;
But now invested with fair flowers and herbs,
And haunted by sweet airs and sounds, which flow

Among the woods and waters...[16]

ڈرامے میں ایشیاء، اوونسن کی لکشیما اور ساوِدی کی کیلیل کی یاد دلاتی ہے حالانکہ وہ علامت زیادہ ہے اور لکشیما اور کیلیل کی طرح گوشت پوست کی دوشیزہ کم۔ پرومیتھیس اور ایشیا دونوں کشمیر کے ایک غار میں رہائش اختیار کرتے ہی اور ہمیں شیو اور پاروتی کی یاد دلاتے ہیں۔ خود غار اور اس کے گردونواح وقت کے اتار چڑھاؤ کے بیچ میں پُراسراریت، لافانیت اور لازمانیت سے بھرپور ہوتے ہیں جیسا کہ پرومیتھیس ایشیا سے کہتا ہے:

....There is a cave,
All overgrown with trailing odorous plants,
Which curtain out the day with leaves and flowers,
And paved with veined emerald, and a fountain
Leaps in the midst with an awakening sound.
From its curved roof the mountain's frozen tears
Like snow, or silver, or long diamond spires,
Hang downward, raining forth a double light:
And there is heard the ever-moving air'
Whispering without from tree to tree, and birds,
And bees; and all around are mossy seats,
And the rough walls are clothed with long soft grass;
A simple dwelling, which shall be our own;
Where we will sit and talk of time and change,
As the world ebbs and flows, ourselves unchanged...[17]

☆☆☆

☆......غلام رسول بٹ
کشمیری سے ترجمہ: محمد اقبال لون

کشپ ریشی اور فارسی مورّخ

کشمیر کی قدیم تواریخوں کے بعد پہلی دستیاب تواریخ راج ترنگنی ہے جو کلہن پنڈت نے راجہ جے سنگھ کے عہد میں ۱۱۴۹ء میں منظوم سنسکرت میں تالیف کی۔ کلہن نے اُس سے قبل تالیف تواریخوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن یہ تواریخیں فی زمانہ دستیاب نہیں ہیں۔ کلہن کے بعد زین العابدین بڈشاہ کے دور تک پونے تین سو سال اگر کشمیر میں کوئی تاریخ لکھی گئی ہے اُس کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ لہذا یہ مانا جاتا ہے کہ اس عرصے کے دوران کوئی تواریخ معرضِ وجود میں نہیں آئی ہوگی۔

بڈشاہ کے دَور یعنے ۱۵ ویں صدی عیسوی میں سنسکرت کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کی بھی ترویج ہوئی۔ بہت سی سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ فارسی وعربی زبان میں بہت سی کتابیں سنسکرت میں منتقل کی گئیں۔ فارسی اور سنسکرت میں تواریخیں تالیف کی گئیں۔ جونراج نے سنسکرت میں زینہ ترنگنی تالیف کی۔ ملا احمد اور مُلا نادری نے فارسی زبان میں الگ الگ تاریخیں لکھیں لیکن اِن دونوں مورّخوں کی تواریخیں صرف تواریخوں ہی میں محفوظ ہیں کیونکہ وہ اس وقت دستیاب نہیں ہیں۔

کلہن پنڈت راج ترنگنی میں کشمیر کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے کشپ ریشی کے متعلق صرف اِس بات کی صراحت کرتا ہے کہ قدیم زمانے میں ہمالہ کے دامن میں واقع

زمین منو کے عہد تک زیرِ آب تھی۔ اس کے بعد پرجاپتی کشپ نے اوپندر اور رودر کی رہبری میں دیوتاؤں سے مدد حاصل کی اور جل اُدبھو نامی راکھشس کو ہلاک کر کے یہاں سے پانی کا اخراج کیا اور کشمیر نام کی جگہ آباد کی۔

بڈشاہ اور اس کے بعد کشمیر میں جو فارسی تواریخیں تالیف ہوئیں اُن میں سے اکثر کا ماخذ کلہن کی راج ترنگنی ہے۔ فارسی مورّخوں نے کشپ کا ذکر پنڈت کلہن کے مقابلے میں زیادہ وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔ بعد فارسی مورخوں نے کشپ ریشی کے مختلف پہلوؤں میں پیش کر کے اُس کی اہمیت عیاں کرنے کی سعی کی ہے۔ کلہن پنڈت کے بعد کشمیر میں تالیف کی جانے والی فارسی تواریخیں جو کشمیر کے وجہ تسمیہ کے لئے کشپ ریشی کے کلہن کے بیان سے اتفاق کرتی ہیں، وہ سلسلہ واریوں ہیں:

۱۔ تاریخِ کشمیر۔ حسن بیگ خاکی۔ سالِ تالیف ۱۶۰۸ء

۲۔ بہارستانِ شاہی۔ سالِ تالیف ۱۶۱۶ء

۳۔ تاریخِ کشمیر۔ ملک حیدر چاڈورہ۔ سالِ تالیف ۱۶۱۹ء

۴۔ منتخب التواریخ۔ نارائن کول عاجز ۱۷۱۰ء

۵۔ باغِ سلیمان۔ سعد اللہ شاہ آبادی ۱۷۸۷ء

۶۔ واقعاتِ کشمیر۔ خواجہ محمد اعظم دیدمری۔ سالِ تالیف ۱۷۴۶ء

۷۔ مجموعۃ التواریخ۔ بیربل کاچرو، سالِ تالیف ۱۸۳۵ء

دیگر فارسی تواریخیں جو کشپ ریشی کے متعلق بعد تذکروں کو اپنے اندر سموئے ہیں، یوں ہیں:

۱۔ نوادر الاخبار۔ رفیع الدین احمد المتخلص غافل۔ سالِ تالیف ۱۷۲۳ء

۲۔ گوھرِ عالم۔ حاجی محمد اسلم منعمی۔ سالِ تالیف ۱۷۸۵ء

۳۔ حشمتِ کشمیر۔ عبدالقادر خان۔ سالِ تالیف ۱۸۶۹ء

۴۔ تاریخِ حسن۔ غلام حسن شاہ گامرو۔ سالِ تالیف ۱۸۲۴ء

۵۔ وجیز التواریخ۔غلام نبی شاہ خانیاری۔۱۸۹۳ء

وہ فارسی تواریخیں جن کا ذکر اولاً کیا گیا ہے اور جو کشمیر کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کلہن پنڈت کے بیان سے اتفاق کرتی ہیں وہ کشپ ریشی کے متعلق تقریباً ایک ہی بیان کی یوں صراحت کرتی ہیں۔

''پرانے زمانے میں کشمیر ایک تالاب ہوا کرتا تھا جس کو ستی سر کہتے تھے۔''ستی'' سنسکرت میں خاتون کو کہتے ہیں اور ''سر'' تالاب کو۔ اِسی تالاب میں جَل اُدبھو نامی راکھشس رہتا تھا۔جَل سنسکرت میں پانی کو کہتے ہیں۔بعض فارسی مورخوں نے جَل اُدبھو کو آبی دیوانہ کہا ہے۔اِسی جَل اُدبھو برہما کی عبادت کی تھی اور اُسے خاص تقرب حاصل ہو گیا تھا۔اُسے یہ بتایا گیا تھا کہ پانی میں تمہیں کوئی زیر نہیں کرسکتا۔اِسی وجہ سے وہ تالاب میں رہا کرتا تھا۔جَل ادبھو اکثر پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اِنسانوں اور حیوانوں کو پکڑ کر کھاتا جاتا تھا۔اِس طرح سے اُس کے قتل اور غارت گری سے اِن پہاڑیوں پر رہنے والے لوگ بے حد پریشان تھے اور وہاں کی آبادی قریب قریب ختم ہو گئی تھی۔ایک وقت جب کشپ، جو برہما جی کا پسر زادہ تھا، متبرک مقامات کا طواف کرتے کرتے ستی سر کے نزدیک پہنچ گیا وہاں اُس نے جَل اُدبھو کی تباہ کاریاں دیکھیں۔اُس نے وہاں ایک سہمے ہوئے بزرگ سے دریافت کیا کہ وہاں کی آبادی اِتنی قلیل کیوں ہے۔بزرگ نے جَل اُدبھو کا سارا ماجرا سُنایا۔یہ سُن کر کشپ رشی بہت غمگین ہو گیا۔یہ ہیر پورہ شوپیان کے قریب کُنسر ناگ (کوثر ناگ) پہاڑی پر چلا گیا جہاں اُس نے عرصۂ دراز تک عبادت و ریاضت کی۔اُس کی یہ ریاضت قبول ہو گئیں اور یہ مدعا منظور ہو گیا کہ جَل اُدبھو کے مظالم سے چھٹکارا حاصل ہو۔برہما جی اور مہش جی کو جَل اُدبھو کے خاتمہ پر مامور کیا گیا۔اُنہوں نے جل ادبھو کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن وہ جل اُدبھو کو زیر نہیں کر سکے کیوں کہ جَل اُدبھو کمزور ہوئے وقت پانی کی تہہ میں چھپنے کے لئے چلا جاتا تھا۔آخر پر یہ تدبیر ٹھہری کہ شری وِشنو جی کے بارہ مولہ کے نزدیک پہاڑ میں سوراخ کئے جہاں سے پانی کا اخراج ہو گیا لیکن جَل اُدبھو پانی کی تہہ میں چھپتے چھپاتے

بے گناہوں کا قتل کرتا رہا۔ جل اُدبھو موجودہ ہاری پربت کے نیچے پانی میں چھپتا پھرتا تھا کیوں کہ اس جگہ پانی میں کافی گہرائی اور چھپنے کے لئے جگہ تھی۔ قدرت نے کشپ ریشی کی التجا منظور کی اور قدرت کی طاقت شارکا یعنی مینا کی شکل میں ظاہر ہوگئی۔ اُس نے اپنی چونچ میں متبرک پہاڑی کا ایک ٹکڑا لے کر جل اُدبھو کمین گاہ پر ڈال دیا جس سے جل اُدبھو ہلاک ہوگیا۔ اِسی وجہ سے اِس پہاڑی کو ہاری پربت (کشمیری میں مینا کو ہٲر کہتے ہیں) کہا جاتا ہے۔ اِس پہاڑی کے مغرب میں شارکا بھگوتی کا پوتر استھاپن قائم ہے۔ غرض جب جل دیو ختم ہوا ستی سر خشک ہوگیا اور خشکی نظر آنے لگی۔ آبادی بتدریج بڑھ گئی اور ستی سر کا نام کشپ مر پڑ گیا۔ ''مَر'' سنسکرت میں گھر کو کہتے ہیں۔ یعنی کشپ کا گھر۔ امتدادِ زمانہ اور زبان کے تغیر سے یہ کشمیر بن گیا۔

مورّخ نرائن کول عاجز لکھتا ہے ''بعد ازاں ستی سر بکشپ مر موسوم گردید۔ بمرور منہ وتغیر السنہ کشف مر کشمیر شُد۔ اَلنون بکشمیر زبان زد ساکنان ربع ومسکون است''۔

نوادرالاخبار کا مصنف رفیع الدین احمد المتخلص غافل کشپ ریشی کے متعلق ایک اور بات کی وضاحت یوں کرتا ہے۔

''کہا جاتا ہے کہ حضرتِ سلیمان علیہ السلام اپنی نبوت اور فرمانروائی کے زمانے میں کشمیر آئے تھے جب اِس وادی کی زمین زیرِ آب تھی۔ یہاں کی آب و ہوا اُنہیں بہت پسند آئی۔ اُن کے ہمراہ بہت سے دیو اور جن ہوتے تھے۔ اِن میں ایک دیو کا نام کشو تھا۔ حضرت سلیمان نے اِسی کشو کے ہاتھوں مغرب میں پہاڑیوں میں دراڑ ڈالوائی جس سے وادی کا پانی خارج ہوگیا اور زمین نمودار ہوگئی۔ اس کے بعد اُنہوں نے اپنی ملکیت میں ایک فرمان جاری کروایا جس کی رُو سے دُنیا کے شریف ترین قوموں سے ایک ایک جوڑا یہاں بسایا گیا۔ آہستہ آہستہ آبادی بڑھ گئی اور شہر، گاؤں، قصبے آباد ہوگئے اور اِس جگہ کا نام باغِ سلیمان رکھ دیا گیا۔ چونکہ کشو دیو نے یہاں سے پانی کا اخراج کیا تھا اور اِس کشو دیو کی اہلیہ کا نام میری تھا، یہاں کے بسکین داروں نے کشو اور میری نام کی آمیزش سے اِس کا نام

کشومیری رکھا جو بگڑتے بگڑتے کشمیر بن گیا۔

رفیع الدین احمد یہ بات یوں لکھتا ہے:

''آں معمورہ فردوسِ نشان را''باغ سلیمان'' نام نہادہ۔ چو مقصدی مہم بیرون کشیدن آب کشو دیو بود، زن اور اسماۃ میری۔ مے گفتند ساکنانِ در محادرہ ہمہ گیر اسمیں زن وشوہر را بتر خیم واو کشو و یای آخیر مساۃ میری نام کشمیر میگفتند۔ نباں بر آن مرورِ ایام کہ برزبان خاص وعام مثلِ اسمِ قرار گرفت مسمی بہ بلدۂ کشمیر گشتہ۔''

اِسی طرح ''گوہرِ عالم'' کا مصنف حاجی محمد اسلم منعمی کشپ ریشی کے متعلق لکھتا ہے۔ اُس کے مطابق یہ بیان حشمتِ کشمیر کے مصنف عبدالقادر خان نے اپنی تواریخ میں درج کیا ہے۔ مصنفِ گوہرِ عالم اپنی تواریخ میں بحوالہ ''مراۃ الاولیاء'' مصنف مُلا احمد، جو بڈشاہ کے عہد میں بڑے پائے کا شاعر اور مصنف تھا، لکھتے ہیں:

''حضرتِ آدم صفی اللہ کے انتقال کے ایک سو سال بعد اُن کی اولادوں میں شین ابنِ آدم علیہ السلام بن کا نام کشو تھا، شکار کرتے ہوئے راستہ بھٹکنے کے سبب یہاں آئے اور ایک حوض کے نزدیک درخت کی چھاؤں میں نیند کے ساتھ ہم آغوش ہو گئے۔ اِسی اثناء میں اِس جگہ جنات کے بادشاہ کی دُختر بھی آن پہنچی۔ اُس کے ہمراہ بہت سے جن اور دیو تھے۔ کشو کو دیکھ کر اُنہوں نے اُسے ختم کرنے کا قصد کیا۔ بادشاہ کی دختر نے اُنہیں کشو کو ناحق ختم کرنے کے اِرادے سے باز رکھا۔ جنات کے بادشاہ کی دختر کی مداخلت کے بعد کشو کو بادشاہ کے پاس پیش کیا گیا۔ جب کشو کا حال اور اس کا حسب ونسب معلوم ہو گیا تو بادشاہ کے جنات نے اپنی دختر کی شادی اُس کے ساتھ کر دی۔ کشو اور میری کے اولاد کی تعداد جب بڑھ گئی تو کشو اور میری کے ناموں کا انضمام ہوا اور یہ کشمیر بن گیا۔ مصنفِ گوہرِ عالم اِس بات کا تذکرہ یوں کرتا ہے:

''چون خلقت آں کشور را ایں دو کس مادر و پدر بودہ اند، عقلامی آں زمان اسمین زوج وزوجہ را باہم انضمام دادہ، واوِ کشو و یای میری حذف کردہ اندیار ''کشمیر'' نامیدند۔ ازاں

زمان الیٰ یومنا بدین اسم متعارف است۔

تاریخ حسن کا مصنف غلام حسن شاہ گامرو بھی اپنی تواریخ میں بحوالہ ملا احمد، مترجم رتن پوران کشپ ریشی کے متعلق ایک اور بات کی جانب یوں اِشارہ کرتے ہیں کہ ایک بزرگ جس کا نام امرت ساگر تھا، وندیا چل پہاڑی پر باری تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا۔ اِسی زمانے میں کاشم ویر نام کا ایک طاقت ور پہلوان بھی تھا۔ ایک روز یہ پہلوان پہاڑیوں میں شکار کر رہا تھا۔ اِس دوران اُسے پیاس لگی۔ پانی کی تلاش میں یہ اُس بزرگ عابد کے پاس پہنچ گیا۔ پہلوان نے بڑے ہی غرور اور عونت کے ساتھ بزرگ سے پانی مانگا۔ بزرگ نے اُسے برتن دیا اور اِشارے سے کہا کہ وہ کنویں سے پانی نکالے۔ پہلوان نے برتن کنویں میں ڈال دیا لیکن وہ پانی نہیں نکال دیا۔ وہ سخت پریشان ہوگیا اور پریشانی کے عالم میں بزرگ کے پاؤں پڑ گیا۔ بزرگ نے کنویں کی طرف دیکھ کر آواز لگائی کہ اِس بہادر کو پانی دو۔ اس کے بعد کاشم ویر نے کنویں سے برتن نکالا جس میں پانی بھرا ہوا تھا اور اپنی پیاس بجھائی۔ کاشم ویر اس بزرگ سے متاثر ہوا اور اس کی خدمت میں جُٹ گیا۔ مرشد کے ارشاد کے مطابق عبادت میں محو ہوگیا اور ایک روز اپنے مرشد سے عرض کیا کہ ماضی میں اُس سے بہت بڑا جرم سرزد ہوا اور وہ عفو و درگزر کا طالب ہے۔ مرشد نے کہا کہ جب تم شری امرناتھ جی سوامی کے طواف کرو گے اُسی صورت میں تمہیں مُکتی مِل پائے گی۔ یہ بات سُن کر کاشم پہلوان جنوب پہاڑوں کی طرف چلا گیا اور کوہِ امرناتھ پہنچ گیا جہاں اُس نے سارے مراسم بجا لائے اور اُسے اطمینانِ قلب حاصل ہوگیا۔ اس کے بعد کاشم ویر پہلوان نے دیگر تیرتھوں کا بھی طواف کیا اور بارہ مولہ پہنچ گیا۔ اُس نے اپنے مرشد سے اِس جگہ کی اہمیت دریافت کی۔ مرشد نے کہا کہ جو اس استھاپن پر نہائے اُسے ستی سر میں موجود ایک ہزار تیرتھوں کا طواف کرنے کا ثواب ملے گا۔ کاشم ویر نے کہا کہ اِن تیرتھوں کا کِس طرح طواف کیا جائے۔ جواب ملا کہ جب ستی سر سے پانی باہر نکالا جائے اور اِس کے لئے ضروری ہے کہ بے پناہ ریاضت کی جائے۔ یہ سُن کر کاشم ویر کوہِ قیصر ناگ پر چلا گیا اور وہاں باری

تعالیٰ کی عبادت میں محو ہو گیا۔ ایک روز اُس نے دیکھا کہ ایک چوہا اُس کے عبادت خانے میں سوراخ کر رہا ہے۔ کاشم ویر نے اِسے غیبی اشارے سے تعبیر کیا۔ وہ بارہمولہ کے نزدیک کھادن یار چلا گیا وہاں پہاڑ کھود کر اِس میں سوراخ بنا دیا۔ جہاں سے پانی باہر نکلنا شروع ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ سوراخ راجہ سُندر سین کے زمانے تک موجود تھا۔ اسکے بعد کاشم ویر نے تمام تیرتھوں کا طواف کیا اور وہیں بود و باش اختیار کی۔ آہستہ آہستہ وہاں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئیں اور اِس جگہ کا نام کاشمی مر پڑ گیا جو زمانے اور زمانے کے تغیر سے ''کشمیر'' بن گیا۔

حسن لکھتا ہے:

''یہ نیروی ہمتِ کاشم ویر سرزدہ بود، بنابرآں ابنای زمان نام ایں مکاں را کاشی مرے گفتند تا کہ بمرورِ ایام کشمیر گفتند۔''

وجیز التواریخ کا مصنف غلام نبی خانیاری ایک اور بات یوں لکھتا ہے:

''اِک روز جب حضرتِ سلیمان ہوا میں اڑنے والے تخت پر سوار ہو کر کشمیر میں اُس پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے جسے تختِ سلیمان کہتے ہیں۔ اُس وقت کشمیر زیرِ آب تھا۔ صرف اونچی چوٹیاں نظر میں آ رہی تھیں۔ بعض لوگ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسیرا کرتے تھے۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کشتیوں میں جاتے تھے۔ جب حضرتِ سلیمان یہاں پہنچے اُنہوں نے اپنے ساتھ دو جنوں جن کے نام کشپ اور میر تھے، کھادن یار کے نزدیک پہاڑ کاٹ کر پانی باہر نکالنے کا حکم دیا۔ کشو اور میر نے حکم کی تعمیل کی اور پانی باہر نکال دیا۔ لہٰذا اِن دو جنات کے ناموں کی مناسبت سے اِس جگہ کا نام کشپ میر پڑ گیا جو بعد میں کشمیر بن گیا۔''

یہ بات غلام نبی خانیاری یوں لکھتا ہے:

بموجب حکمِ سلیمانؑ دو نفر جن یکی کشف دویم میر مامور بہ بیرون کردن آب شدند و آنہا در کھادن یار متصل درۂ بارہ مولہ بدرو بہم رسانیدند۔''

☆☆☆

☆......عبدالغنی شیخ

لداخ کے بعض عقائد اور اوہام

لیہہ میں سنسنی پھیلی تھی۔ گھر گھر میں ایک ہی چرچا تھا۔ بات یہ تھی کہ ایک آدمی پُراسرار طور غائب ہوا تھا۔ چار روز بعد وہ شکستہ اور خستہ حال گھر لوٹا۔ اس چار روز میں وہ بالکل بدل گیا تھا۔ آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں۔ گال پچک گئے تھے اور چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔

اس کے اہلِ خانہ کا کہنا تھا کہ رات کے آخری پہر وہ اپنے بستر میں نہیں تھا۔ سرہانے کے پاس اس کے جوتے جوں کے توں پڑے تھے۔ وہ نہایت ہی سراسیمہ نظر آتا تھا۔ گھبرایا گھبرایا اس نے بیان دیا کہ رات کے اندھیرے میں ایک غیر مرئی طاقت اس کے بستر میں سے لے گئی اور لیہہ سے چار کلومیٹر دور سپتک کی کھریا مٹی کے ٹیلے کی ایک کھائی میں رکھا اور کھانے کو کھریا مٹی دی۔

قصبے میں گاہے گاہے ایسی وارداتیں ہوتی تھیں۔ تب لیہہ کی آبادی چار ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اور ہر واقعہ آگ کی طرح قصبے میں پھیل جاتا تھا۔

رات کو کسی کے پراسرار طور غائب ہونے کی واردات کے لئے لداخی زبان میں 'ڈیپ ٹیت' کی اصطلاح ہے۔ جس کا لفظی مطلب شیطان یا بھوت پریت کا کسی کو بھگا کر لے جانا ہے۔ اُن دنوں لوگ کہتے تھے کہ سپتک کی کھریا مٹی کے ٹیلوں میں بھوت پریت

رہتے ہیں۔عجب عجب کہانیاں سننے کو ملتی تھیں۔لوگ باگ سرِ شام وہاں چلنے سے گھبراتے تھے۔آج کل ان ٹیلوں کے آس پاس فوجی بارکیں بنی ہیں اور لیہہ کا ہوائی اڈہ اس کے بالکل سامنے ہیں۔

لمبا عرصہ ہوا۔'ڈیپ ٹیت' کا ایک واقعہ میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ہم لیہہ سے سرینگر بس میں سفر کر رہے تھے۔دراس میں ہم نے رات گزاری۔صبح مسافروں میں ہل چل سی مچی۔ایک مسافر اپنے بستر سے غائب تھا۔اس کے جوتوں کی جوڑی بستر کے پاس پڑی تھی۔وہ دوپہر کو لوٹا۔اس کی حالت بری تھی۔دونوں پیر زخمی ہوئے تھے۔اس کا کہنا تھا کہ ایک غیر مرئی طاقت اس کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ساری رات اس کو پہاڑوں پر گھمایا۔بیچ بیچ میں چند لمحوں کے لئے اس کو ہوش آجاتا تھا اور وہ سوچتا تھا کہ میں کہاں آیا ہوں۔اسے پہلے کہ وہ واپس اپنی جگہ لوٹے۔اس پر مدہوشی اور خود فراموشی کی سی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔یہ مسافر لیہہ کے پاس ایک گاؤں کا رہنا والا تھا۔وہ بہت خوفزدہ تھا۔میں نے سنا۔سرینگر میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران وہ خاموش رہا اور روتا رہا۔

ایک اور واقعہ مجھے یاد ہے۔لیہہ کی پہاڑی پر پوجا ہورہی تھی۔جو ایک غیر معمولی بات تھی۔لوگ لیہہ بازار سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔پوجا کا جواز یہ دیا جارہا تھا کہ پہاڑی کی چوٹی پر واقع مٹھ میں ایک متحرک انسانی ڈھڑ پوتر چراغ دان کے تیل کو ضائع کررہا تھا۔اس کا چشم دید گواہ مٹھ کا پجاری تھا۔چھوٹے سے قصبے میں یہ خبر پھیل گئی تھی۔تب لوگ اس خبر کو اس طرح لے رہے تھے گویا یہ ایک معمول کا واقعہ ہے۔آج ذرائع ابلاغ اس واقعہ کو ساری دنیا میں پہنچادیتے۔

بھوت پریت کا چرچا ہر سماج اور ہر جگہ ہوتا ہے۔انگریزی میں بھوت کے لئے کئی الفاظ ہیں۔جن میں ghost اور spirit زیادہ مقبول ہیں۔یہ عموماً مرنے والے کی روح کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔جو دُنیا میں مرئی یا غیر مومرئی صورت میں واپس آتی ہے اور زندوں کو ہراساں کرتی ہے۔کوئی کوئی روح اچھی ہوتی ہے جو زندوں کی مدد کرتی ہے لیکن

اکثر بے چین روحیں ہوتی ہیں۔ جن کی اکثریت بے گناہ مہلوکین یا مقتولین کی ہوتی ہے۔

عام طور پر ایک بدروح مکان پر ڈیرہ جماتی ہے اور مکینوں کو مکان سے نکالنے کے لئے سرگرداں اور کوشاں ہوتی ہے۔ ہر شہر اور ہر قصبے میں ایسے آسیب زدہ Hounted House مکان یہ مکانات ہوتے ہیں جن کو مکینوں نے مجبوراً خالی چھوڑا ہے۔ آسیبی مکان سے آسیب اتارنے کے لئے جانکاروں اور پجاریوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ مغرب میں بھوت پریت پر تحقیقی کام ہوا ہے اور کتابیں چھپی ہیں۔ کئی ٹی وی چینلوں سے بھوت پریت پر فلمیں دکھائی جاتی ہیں اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ سچے واقعات پر مبنی ہیں۔ انٹرنیٹ پر بھوتوں سے متعلق بڑی معلومات دی گئی ہیں۔ جنوبی انگلینڈ کا ایک گاؤں پلک لے (Pluckley) سے زیادہ آسیب سے متاثرہ گاؤں قرار دیا گیا ہے۔ یہاں بیک وقت بارہ بھوت اور بھوتنیاں دیکھی گئی ہیں۔ جن میں دو مہلوکین اور دو خودکش افراد ہیں۔ ایک بے چین اور مضطرب عورت کی بھتنی اپنے گم شدہ بچے کی کھوج میں لگی ہے۔ ایک فریب نظر (Phantom) بگھی بھی نظر آتی ہے۔ اسی طرح امریکہ کی ریاست چیکاگو کا شہر CRESTWOOD بھوتوں کی بھرمار کی وجہ سے بھوتوں کا شہر کہلاتا ہے۔ یہاں سائنس خاموش ہے۔ ایسے میں ان واقعات کو مابعد الطبیعیات (Metephysical) مافوق الفطرت (Supernatural) اور واہمہ کہہ کر ٹالنا مشکل ہے۔

بھوتوں کی دو اقسام بتائی جاتی ہیں۔ ایک مرنے والے کی روح یا بدروح اور دوسری ایک اور ایذا رسان مخلوق ہے جس کو شیطان یا Devil کہا جاتا ہے۔ اردو اور انگریزی میں ان دو قسموں کو واضح نہیں کیا گیا ہے۔ اُردو لغت میں مرنے والے کی بدروح کے لئے نُشور کا لفظ دیا گیا ہے جو عام مستعمل نہیں ہے۔ لداخ زبان میں ان کو واضح کیا گیا ہے۔

اول الذکر کو شینڈے کہا جاتا ہے۔ جس کا لفظی مطلب مرنے والے کا بھوت ہے جبکہ دوسرے کو لنڈے کا نام دیا گیا ہے۔ ڈے بھوت کو کہتے ہیں۔ بستر سے مذکورہ سوئے آدمی کو بھگا کر لے جانے والا اور مٹھ کے چراغ کو نقصان پہنچانے والا لنڈے ہوسکتا ہے۔

روایات کے مطابق لنڈے مختلف شکلوں اور بھیس میں نمودار ہوتا ہے۔

میں نے لداخ میں یہ کہتے سنا ہے کہ جہاں پیڑ پودے ہوں، وہاں لنڈے نہیں ہوتے ہیں۔ لداخ میں پیڑ پودے کم ہیں۔ اس لئے لنڈے زیادہ ہیں۔ لوگ کہتے تھے کہ رات کو سفر کرتے وقت اپنے ساتھ کھانے کی کوئی چیز رکھنی چاہیئے۔ راستے میں آنے والے یا پیچھا کرنے والے بھوت پریت کو ٹرخانے کے لئے اس کی راہ میں تھوڑا تھوڑا کھانا پھینکتا ہوا اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھانا چاہیئے۔

لداخ میں شینڈے اور لنڈے کی واردات اور روایات پر روشنی ڈالنے سے پہلے اس موضوع پر میں ان بیرون لداخ کی چند مثالیں دوں گا تاکہ اس تناظر مین لداخ میں بھوت پریت کی وارداتوں کو سمجھا جاسکے۔

ابرہیم لنکن کو کون نہیں جانتا؟ وائٹ ہاؤس میں ابراہیم لنکن کے بھوت کی آمد کا بہت تذکرہ ہوا ہے۔ بہتوں نے اس کی شہادتیں دی ہیں۔ صدر لنکن کو ۱۹۶۵ء میں ایک شخص ویکس بوتھ نے واشنگٹن کے ایک تھیئٹر میں قتل کیا تھا۔ سیاہ کپڑے میں ملفوف ان کے تابوت کو تجہیز و تکفین کے لئے ایک ریل گاڑی میں لیا گیا۔ اس کے فوراً بعد ایک اور ریل گاڑی دیکھی گئی تھی جس میں ہو بہو وہیں تابوت تھا۔ یہ محض نظر کا فریب Phantom تھا۔

کم سے کم دو امریکی صدور کی خاتونِ اوّل کی بھتنیاں بھی وائٹ ہاؤس میں دیکھی گئی ہیں۔ اہم شخصیتوں میں برطانوی وزیر اعظم بنجمن ڈزراٹیلے (۱۸۰۴ء-۱۸۸۱ء) کو مرنے کے بعد اپنے مکان میں دیکھا گیا۔ عام طور پر وہ مکان کی بالائے منزل پر چلتا ہوا نظر آتا تھا۔

امریکی ادیب واشنگٹن اروینگ کے ایک دوست ابھانجے اور اس کے دو بیٹیوں نے گواہی دی ہے کہ انہوں نے نیویارک میں واقع اروینگ کے مکان اور لائبریری میں ان کی روح کو انسانی جثہ میں دیکھا۔

ملکہ وکٹوریہ کی سب سے بڑی بیٹی ملکہ الزبتھ اوّل اور ہنری ہشتم کی چھتی بیوی جین سیمور کی بھتنیاں دیکھی گئی ہیں۔ جین سیمور ہر ۱۲/۱۱ اکتوبر کو لندن کے مضافات میں واقع

ہیمپٹن کورٹ پیلس میں نمودار ہوتی تھی۔۱۵۳۷ء میں اس روز اس کا بیٹا ایڈورڈ پیدا ہوا تھا۔
پندرھویں صدی کے نامور انگریز جہاز ران اور محقق سر والٹر ریلے کو لندن میں ملکہ کی قیام گاہ اور خونی ٹاور کے درمیان پشتے پر چلتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔اس ٹاور میں وہ تیرہ سال قید رہا تھا۔
عام طور پر مقتول، مظلوم، مغموم اور بے تاب روحیں دنیا میں منڈلاتی رہتی ہیں۔ جنہیں مرنے کے بعد شاید دوسری دُنیا میں چین نہیں ملا ہے۔
انگلینڈ کے بادشاہ چارلس اوّل کا بلا سر کا بھوت اکثر دیکھا گیا ہے۔۱۶۴۹ء میں چارلس کا سر تن سے جدا کیا گیا تھا۔
ملکہ میری کے ایک درباری کی بیوی الزبتھ کی پشیماں روح اپنے بچے کا خون صاف کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس نے اپنے بچے کو قتل کیا تھا۔
Titanic فلم مشہور ہے۔اس نام کا سمندری جہاز ۱۹۱۱ء میں سمندر میں غرقاب ہوا تھا اور پندرہ سو سے زائد انسانوں کی جانیں چلی گئی تھیں۔ایک کتاب میں لکھا ہے۔اس میں ایک ممی کو نیویارک میوزم بھیجا جارہا تھا۔ ممیائی گئی نعش ۱۶۰۰ء قبل مسیح ایک مصری شاہزادی کی تھی۔ڈوگلس مورے نام کے ایک انگریز نے ۱۹۱۰ء میں اسے قاہرہ میں خریدا۔ اس کے بعد مورے اور اس سے وابستہ کئی افراد پر مصائب کا سلسلہ شروع ہوا۔سات لوگ مر گئے۔ ہر ایک نے اس کی وجہ اسی ممی کو قرار دیا اور اس سے نجات حاصل کی گئی۔ برٹش میوزیم سے یہ نیویارک میوزم منتقل ہوئی۔اسی طرح انسانی کھوپڑی نے بھی اس کے مالک کا جینا حرام کیا ہے اور زندہ انسانوں سے انتقام لیا ہے۔
تاہم سارے بھوت بُرے نہیں ہوتے۔اچھے بھوت بھی ہیں۔ایک ماں کی ممتا بھری بھوتنی نے ایک ڈاکٹر کو اپنے بیمار بیٹے کے علاج کے لئے گھیر لیا تھا۔ ہوائی جہاز کے حادثے میں مرے ہوئے ایک ہواباز کی روح نے انسانی صورت میں آکر دوسرے ہواباز کو بروقت اطلاع دے کر اس کے ہوائی جہاز کو حادثے سے بچایا تھا۔ایک بھوتنی نے ایک آدمی

کی وساطت سے اپنے شوہر کو ضروری پیغام بھیجا تھا۔ شمالی انگلینڈ کے یارک شہر میں ایک عورت کی بھوتنی گاڑیوں کے آگے دوڑتی تھی۔ جہاں خطرہ ہوتا، وہ گاڑیوں کی رفتار کو کم کر دیتی تھی۔ اس عورت کو اس کے شوہر نے چھوڑ دیا تھا۔ ایک ڈرائیور نے ترس کھا کر اس کو اور اس کے بچے کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ مرنے کے بعد اس کی روح دوسرے ڈرائیوروں کے تئیں اپنا احسان چکا رہی تھی۔

سترھویں صدی کی ایک ادیبہ Patience Werter سے متعلق میں نے یہ پڑھا کہ اس نے بعد مرگ J.A. Curran نام کی ایک عورت کو املا دے کر ناول لکھوائے۔ warter امریکہ میں ماری گئی تھی۔

مغرب نے بھوت پریتوں کی وارداتوں کو ڈھکے چھپے بغیر بلا چوں و چرا منظرِ عام پر لایا ہے۔ مشرق کے معاشرہ میں بھوت کا آنا اور ذکر کرنا اس خاندان کے لئے باعث بدنامی اور معیوب سمجھا جاتا ہے۔

پاکستان کے ایک جریدہ میں لکھا ہے کہ کراچی میں امریکی سفارتخانہ کو بھوت سے ہراساں اور نالاں ہو کر خالی کرنا پڑا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کراچی پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ انگریزی اخبارات میں کبھی بھی مرنے والے کے بھوت کی آمد کے بارے میں خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔

بہت سال پہلے انگریزی جریدہ Illustrated weekly of India اور اردو رسالہ 'بانو' میں تصویروں کے ساتھ ایک سنسنی خیز مضمون چھپا تھا۔ یہ کراچی کی ایک لڑکی طاہرہ کے بارے میں تھا جو گاڑی کے ایک حادثے میں ہلاک ہوئی تھی۔ ایک پولیس افسر گاڑی میں جا رہا تھا۔ ایک لڑکی نے لفٹ مانگی۔ افسر نے لڑکی کو پچھلی نشست پر بٹھایا۔ لڑکی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کے بدن پر زخم تھا۔ جس سے خون رس رہا تھا۔ پولیس افسر نے پوچھا کہ وہ کیسے زخمی ہوئی تھی تو اس نے پولیس افسر کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ ایک مکان کے پاس لڑکی گاڑی سے اتر گئی اور اندر چلی گئی۔ پولیس افسر نے مکان کو نوٹ کیا اور

دوسرے روز لڑکی کی خیر خیریت پوچھنے آیا۔ ستر سالہ ایک بزرگ نے اس کا خیر مقدم کیا۔ کمرے میں لڑکی کا فوٹو آویزاں تھا۔ جب پولیس افسر نے لڑکی سے متعلق دریافت کیا تو بزرگ بولا ''یہ میری بیٹی طاہرہ ہے۔ دوسال پہلے ایک سڑک حادثہ میں وہ چل بسی تھی۔'' پولیس افسر بھونچکا رہ گیا۔

ایک سال پہلے اسی تاریخ کو ایک فارسٹ افسر سے لڑکی نے لفٹ مانگی تھی۔ وہ فارسٹ افسر ایک حادثے میں ہلاک ہوا۔

اب کے پورے کراچی شہر میں یہ خبر پھیل گئی۔ اور شہر کی پوری آبادی اس دن کا انتظار کرنے لگی۔ جب وہ لڑکی اپنے مرنے کے بعد دو مرتبہ نمودار ہوئی تھی اور لفٹ مانگی تھی۔

مجھے بھوت پریت سے متعلق ہمیشہ تجسس رہا ہے۔ میں نے لیہہ میں ان اشخاص سے 'شینڈرے' سے متعلق دریافت کیا۔ جن کو رہائش گاہیں آسیب زدہ تھیں اور غالباً یہ شینڈرے تھے۔

ایک مکان کے ایک کمرے میں بھوت آتا تھا اور مکینوں پر مٹی پھینکتا تھا۔ مالک مکان نے مجھے بتایا۔ میں نے بذاتِ خود اس کی تصدیق کرنا چاہی۔ بھوت سے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ کمرے میں مٹی پھینکتا ہے۔ ہم تین آدمیوں نے اس کمرے میں ایک رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے اپنے ساتھ ٹارچ رکھے۔ پھر ہم نے کمرے میں مٹی، دھول اور گرد جھاڑ پونچھ کر صاف کیا۔ چھت پر جھاڑو پھیری۔ کھڑکی اور دروازے کو بند کیا اور سو گئے۔ اچانک اندھیرے میں کچھ چیز پھینکنے کی آواز سنی۔ ہم ہڑبڑا کر آناً فاناً کھڑے ہوئے۔ ٹارچ جلایا۔ کمرے میں تازہ مٹی پھینکی تھی۔ کھڑکی دروزے بند تھے۔ ہم گھبرائے گھبرائے دوبارہ لیٹ گئے۔ ہمیں جو اندیشے تھے، وہ ہو کے رہے۔ دوبارہ مٹی پھینکی۔ ٹارچ جلایا اور مٹی پھینکی گئی تھی۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا کہ اس کو تھپڑ بھی مارا اور تصدیق ہوگئی کہ کمرے میں ایک غیر مرئی مخلوق مٹی پھینکتی ہے۔ اس کے بعد کسی نے اس کمرے میں رات نہیں گزاری۔

دوسرے آسیب زدہ مکان کا بھوت اسے کہیں زیادہ تیز و طرار تھا۔ دونوں

مکانوں کے درمیان ایک کلومیٹر سے کم فیصلہ تھا۔اس میں میاں بیوی رہتے تھے۔میاں نے مجھے بتایا:

''بھوت ہمیں بڑا تنگ کرتا تھا۔اس کی شرارتیں رات کی تاریکی میں ہوئی تھی۔کبھی دروازہ کھٹکھٹاتا تھا۔کبھی طاق سے برتن گراتا تھا۔ایک رات چولہے پر گوشت کا ایک ٹکڑا رکھا تھا۔دیا جلاتا تو کچھ نہیں ہوتا تھا۔'' ان دنوں لیہہ میں بجلی نہیں تھی۔

پھر وہ بولا ''ایک رات میں ایک کمرے دفتری کام کرر ہا تھا۔میری بیوی اور دوسری عورت دوسرے کمرے میں اون دُھن رہی تھی۔اچانک انہوں نے چیخ ماری۔میں فوراً اُن کے پاس پہنچا۔دونوں بڑی خوف زدہ تھیں۔کسی غیر مرئی وجود نے بکری کی کھال زور سے انکے سامنے پٹخ دی تھی۔ایک رات بھوت نے نیچے جانے کے دروازے کو کنڈی ڈالے بغیر یوں بند رکھا تھا۔کہ زور لگانے سے تھوڑا کھل جاتا تھا۔ہمیں بیت الخلاء جانے کی ضرورت تھی۔ہم نے مجبوراً اپنے پڑوسی کو پکارا اور ان کی مدد چاہیں۔اس کی چھت سے نیچے جانے کی ہماری سیڑھی نظر آتی تھی۔اس نے چھت پر سے دیا دکھایا اور دروازہ یک لخت کھل گیا۔اس رات ہم نے بالشتیا نما ایک مخلوق کو سیڑھی سے نیچے جاتے دیکھا۔بھوت ہمیں اس مکان سے نکالنے کے لئے پیچھے پڑا تھا۔ہم بڑے سراسیمہ تھے۔روز بروز اس کی شرارت میں اضافہ ہورہا تھا۔ہم رات کو دیا اور ماچس اپنے سرہانے کے سامنے رکھتے تھے۔ایک رات زناٹے دار آواز کے ساتھ طاق سے برتن گرا۔میں نے دیا جلانے کے لئے ماچس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔دیا اور ماچس نہیں تھے۔ہم بڑے خوف زدہ ہوئے۔کھڑکی کا چلمن ہٹایا۔ہلکی سی روشنی آئی۔پو نہیں پھٹی تھی۔سردی کا موسم تھا۔اس کے باوجود ڈر کے مارے جسم پسینہ پسینہ ہوگیا۔نیند آنکھوں سے غائب تھی۔رضائی لپیٹے بیٹھے بیٹھے صبح کے اجالے کا انتظار کرنے لگے۔جب کمرے میں روشنی آئی تو یہ دیکھ کر ہم بڑے حیران ہوئے کہ بھوت نے ماچس اور چراغ چوکی سے اٹھا کر طاق پر لئے تھے اور چراغ کی لو کو نیچے کیا تھا۔''

میں نے سوچا کہ بھوت کتنا چالاک اور سمجھدار ہے۔

''ہم نے ہار مان لی اور اس مکان کو خالی کیا۔ ہم نے سنا ہمارے بعد اس کرایے کے مکان میں ایک لداخی میاں اور بیوی ٹھہرے تھے اور دوسرے روز مکان خالی کیا تھا۔ عورت کے مطابق ایک عجیب الخلقت مخلوق دروازے کے پاس آکر بیٹھی اور اس کی طرف حیرت سے نظریں جمائے دیکھتی رہی۔ غالباً وہ اس مکان میں ایک اجنبی کو دیکھ رہی تھی۔ ڈر کے مارے عورت کی گھگی بند ہوگئی اور کسی کو مدد کے لئے پکارنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس رات اس کا شوہر نہیں تھا۔ روشنی آنے پر وہ مخلوق غائب ہوگئی۔ میں نے سنا انہوں نے دوسرے روز مکان کو خالی کیا۔''

اب اس مکان کا تعمیر نو ہوا ہے اور بھوت بھی غائب ہوا ہے۔

ایک اور آسیب زدہ مکان کی مالکن نے مجھے بتایا کہ اس کے مکان کے کمرے میں بھوت آتا تھا۔ جو اس نے کرایہ پر دے رکھا تھا۔ کرایہ دار کچھ مدت کے بعد کمرہ چھوڑ کر چلا جاتا تھا۔ کرایہ داروں کے مطابق کمرے میں ساڑھی پہنی ہوئی ایک عورت آتی تھی۔ یہ عورت کون ہوسکتی ہے اور اس کے پیچھے کون سی کہانی ہے؟ کہنا مشکل ہے۔ وزیر زور آور سنگھ کی لداخ پر فوج کشی کے دوران لداخیوں نے کئی دفعہ بغاوتیں کی تھیں اور ڈوگرہ سپاہیوں کا قتل عام کیا تھا۔ ایک مرتبہ کچھ افسروں اپنی بیویاں ساتھ لائیں تھیں۔ جنہوں نے اپنی شوہروں کے ہمراہ کیلاش اور جھیل مانسرور کی یاترا کی تھی۔ اپنی بیویوں کو لیہہ چھوڑ کر وہ تبت کے محاذ پر لڑنے گئے تھے۔ تبت کے محاذ پر ناکامی کے بعد ایک اور بغاوت ہوئی تھی۔ شاید اس میں کوئی عورت ماری گئی ہو۔ یہ محض قیاس آرائی ہے۔ ایک کرایہ دار کی بیوی شوہر کی غیر موجودگی میں اس کمرے میں رہنے سے ڈرتی تھی۔ اور مالک کے پاس آئی تھی۔ بعد میں نیا کرایہ دار عورت سے پہلے پوچھتا تھا کہ کمرے میں بھوت تو نہیں آتا ہے۔ اس کے سارے کرایہ دار غیر مقامی ہوتے تھے۔ عورت نے اعتراف کیا کہ اس نے ایک کرایہ دار کو ٹوکا کہ وہ کیوں اس کے گھر کو بدنام کر رہا ہے۔ وہ کمرہ اس کی آمدنی کا ایک وسیلہ تھا۔

اسی اثناء میں ایک اور آدمی اپنی بیوی کے ساتھ کرایہ پر رہنے آیا۔ اس کے کان

میں بھنک پڑی تھی کہ اس کمرے میں بھوت آتا ہے۔ وہ نووارد بولا کہ بھوت پریت پر یقین نہیں رکھتا ہے۔ بھوت پریت نرا واہمہ ہے۔

آدھی رات کے لگ بھگ ان کے کمرے سے چیخنے کی آوازیں آئیں اور دونوں میاں بیوی باہر بھاگ آئے۔ بھوت نے ان میں ایک کا گلا دبایا تھا۔

اس عورت نے بتایا کہ بعد میں ایک بڑے لاما نے آسیب اتارا۔ تب سے اس کمرے میں کوئی بھوت نہیں آیا۔

یہ سارے واقعات نصف صدی پہلے کے ہیں۔ زمانہ حال میں ایسے چند اور وارداتیں سنیں۔

ایک لڑکی کو اس کے شوہر اور نند نے ایذائیں دی تھیں اور وہ پُراسرار طور چلی بسی تھی۔ اس کی بے چین روح میکہ اور غالباً سسرال میں آکر مکینوں کو ہراساں کرنے لگی۔ ایک کرایہ دار نے مجھے یہ حیران کُن واقعہ سنایا اور وہ بُری طرح جُٹی تھی کہ میں کمرہ چھوڑ کر چلا جاؤں۔ پھر میں نے صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے ایک لڑکے کو ساتھ رکھا۔ روح نے بھی ایک ساتھی لایا۔ تب کمرے میں اندھیرا تھا۔ لڑکا بولا "دیکھ چاچا وہ آج کسی اور کو بھی لایا ہے۔" دونوں اوپر طاق پر ایسے بیٹھے تھے جیسے دو مرغابیاں بیٹھی ہوں۔ میں روز بروز کمزور ہو رہا تھا۔ ایک مولوی صاحب بولے کہ روح نے اپنے ساتھ ایک جن لایا ہے، کمرہ چھوڑ کر جاؤ، نہیں تو گھٹ گھٹ کر مر جاؤ گے۔ اسی اثناء میں ایک عورت کرایہ دار دوسرے کمرے میں رہنے کے لئے آئی تھی۔ رات کو عورت نے میرے کمرے میں آکر شکایت کی میں نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ میں نے کہا کہ میں نے دستک نہیں دی۔ وہ دوبارہ آئی اور یہی شکایت کی۔ میں نے کہا، "میرے دروازے پر کنڈی لگاو اور صبح کھول دو"۔ عورت نے کنڈی نہیں لگائی البتہ ہم تاک میں رہے کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ پھر ہم دونوں نے دیکھا کہ سفید لباس میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی ہوا کے دوش پر زمین سے بالا بالا چل رہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ہم دونوں نے بہتیری تلاش

کی۔ بیت الخلاء تک دیکھا لیکن نظر نہیں آئی۔

بھوت سے متعلق میں نے پڑھا ہے کہ یہ انسان کی طرح زمین پر پیر رکھ کر نہیں چلتا ہے بلکہ زمین سے float کرتا ہے۔ بھوت کو کمرے میں داخل ہونے کے لئے دروازے مطلوب نہیں ہے۔ وہ کہیں سے بھی کمرے میں گھس سکتا ہے۔ نیز بھوت چھت کے ساتھ چھوٹی سی جگہ پر رہ سکتا ہے۔

عورت نے اس کے دوسرے روز کمرہ خالی کیا اور اس کے بعد پہلا کرایہ دار بھی وہاں سے نکل گیا۔ اور مکان کے دروزے پر ایک بڑا سا تالا لگا تھا۔

ایک لڑکی ڈرائیور لیہہ کے ایک گاؤں ہمس سے لیہہ لوٹ رہا تھا۔ ہمس کے پاس پل کے خاکے پر ایک جوان مرد اور عورت نے اس سے لفٹ مانگی۔ ڈرائیور نے انہیں بٹھایا۔ راستے میں عورت نے ایک عجیب سے بات کہی۔ میرا بچہ لیہہ کی ہاوسنگ کالونی میں کئی ماہ سے دودھ کے لئے ترس رہا ہے۔

ڈرائیور نے کیبن کی روشنی چلائی اور پیچھے مڑ کو دو سواریوں کو دیکھا۔ عورت مرد سے چمٹتی ہوئی بولی۔ "یہ آدمی کیا کرر ہا ہے! یہ آدمی کیا کر رہا ہے!"

ڈرارئیور نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ عورت نارمل انسان نہیں لگتے ہیں اور سہمے سہمے گاڑی چلانے لگا۔ راستے میں ایک گاؤں آیا جہاں اس کا جانا پہچانا آدمی تھا۔ اس نے بہانہ کیا کہ گاڑی میں کچھ خرابی ہوئی ہے۔ اپنے دوست کے گھر سے سامان لاکر ٹھیک کریگا۔ وہ گاڑی سے نکل کر اس گھر میں گھس گیا اور اہل خانہ کو بتایا کہ اس کی گاڑی میں دو بھوت ہے۔ انہوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ وہ ایک آدمی کے ہمراہ گاڑی تک آیا۔ گاڑی میں کوئی نہیں تھا۔ بقول ڈرائیور اس نے پھڑ کی آواز کے ساتھ کسی کو گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے سنا۔

ڈرائیور سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ اس مکان کے مالک نے تصدیق کی کہ ڈرائیور نے اس کے ٹرک میں دو بھوتوں کی موجودگی کا ذکر کیا۔ خوفزدہ ڈرائیور کو اس رات گاڑی چلانے کی ہمت نہیں ہوئی اور رات اسی مکان میں گزار دیں۔

اسے کچھ عرصہ پہلے ہمس کے پُل سے ایک گاڑی دریا میں گری تھی اور چند مرد اور عورتیں اس حادثے میں مر گئے تھے۔ یہ لوگ ہمس میلہ دیکھنے جا رہے تھے۔ ان میں ایک بدنصیب ماں بھی تھی جو اپنے دودھ پیتے بچے کو چھوڑ کر آئی تھی۔

لیہہ۔ چنگ تھانگ کے ایک دورافتادہ راستے پر ایک تنہا گھوڑسوار کا تذکرہ میں نے اکثر سنا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے آنے والا اکیلا گھوڑسوار اس کو خوش ہوتا تھا کہ ایک ہم سفر ملا ہے۔ وہ اپنے گھوڑے کو تیز چلا کر اسے جا ملتا تھا اور اس کے ہم رکاب چلتا تھا۔ پہلا گھوڑسوار جو دراصل اسی جگہ گھاٹی میں گھوڑے سے گر کر ایک مرے ہوئے بدطینت آدمی کا بھوت ہوتا ہے۔ کسی ڈھلان موڑ پر دوسرے گھوڑسوار کو دھکا دے کر نیچے گہری گھاٹی میں گرا دیتا ہے۔ یہ واقعہ مشہور تھا۔ چنانچہ تنہا گھوڑسوار ویران مقام پر دوسرے تنہا گھوڑسوار سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔

لداخ میں لنڈے پر بہت ساری روایتیں اور حکایتیں ہیں جو زیادہ تر اساطیری اور دیومالائی (Mythology) نوعیت کی ہیں۔ لیہہ محل سمیت اور کئی مقامات لنڈے کے مسکن تھے۔ لنڈے کے مختلف شکلیں اور مختلف نام تھے۔

زن۔ جس کے سامنے کا رُخ اتنا خوبصورت اور دلکش ہے کہ انسان دیکھتا ہی رہ جائے۔ لیکن پشت پر اس کی شکل اتنی بدنما، کریہہ اور بھیانک ہے کہ آدمی کراہت اور ڈر کے مارے دم توڑ بیٹھے۔

ڈُگ ڈُگ پا۔ جورات کے وقت گھر کی نچلی منزل میں ڈُگ ڈُگ کی آواز پیدا کرتا ہے۔

شاتھپا۔ انسانی دھڑ والا بھوت۔

دیو کی طرح لمبا تڑنگا بھوت، تین آنکھوں اور بیلی کے سر والا بھوت، سر کٹا اور پچھل پاؤں والا بھوت، لمبے لمبے دانتوں اور لمبے لمبے سینگوں والا بھوت۔ نئی نسل ان بھوتوں سے ناآشنا ہے۔

ماضی میں ایسے افراد ہوتے تھے جو یہ بتاتے تھے کہ رات کو سفر کے دوران ان کا لنڈے سے آمنا سامنا ہوا۔لنڈے راہ میں آجاتا تو گھوڑا آگے نہیں چلتا تھا۔ایک شخص نے مجھے بتایا کہ وہ گھوڑے پر سوار رات کو کہیں جارہا تھا۔ایک جگہ آگے نہیں گیا۔چابک مارا تب بھی آگے نہیں بڑھا اور زمین پر زور زور سے ٹاپیں مارنے لگا۔سامنے یخ جما تھا۔وہ بولا، ''مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سفید یخ پر ایک سایہ تھا۔سامنے کوئی درخت یا چٹان نہیں تھی، جس کا سایہ پڑے۔میں نے دل ہی دل میں دعا پڑی اور یہ سایہ غائب ہوا اور سامنے پہاڑ پر سے ایک ہولناک آواز آئی اور گھوڑا اپنے راستے پر چلا۔''

ایک آدمی نے جس کو میں معتبر سمجھتا ہوں مجھے بتایا، ''ایک مرتبہ رات کو اپنے گاؤں ستوق جارہا تھا، گاؤں کے پاس ننگے چٹیل میدان کی طرف سے ایک دیو قامت مخلوق لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے آرہی تھی۔وہ میدان میں تھا۔دائیں بائیں یا پیچھے فرار ہونا بے کار تھا۔خوف کے مارے میں اپنے راستے پر چلتا رہا۔وہ مخلوق نزدیک پہنچی تو سفیدہ کا ایک لمبا پیڑ لگ رہی تھی۔''اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا''میرا کلیجہ منہ میں آیا۔اس دیو قامت جاندار نے میری طرف ایک نظر ڈالی اور آگے بڑھا۔کچھ دور جاکر میں نے مڑکر دیکھا وہ چھشوت گاؤں کے پاس پہنچ چکا تھا۔''

ان دنوں لمبی تڑنگی مخلوق نظر آنے کی باتیں ہم سنتے تھے۔ہم نے خود نہیں دیکھا ہے۔اس لئے اس کی صحت اور حقیقت پر تبصرہ کرنا مشکل ہے۔یہ اب قصۂ پارینہ بنا ہے۔

شینڈے اور لنڈے کے علاوہ چند اور عجیب الخلقت مخلوقات بڑا چرچا تھا۔ان میں ایک منمو تھی۔منمو ایک حسین وجمیل عورت تھی۔جس سے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ وہ کسی مرد کو بہکا پھسلا کر لے جاتی اور اپنی جنسی پیاس بجھاتی تھی۔چنانچہ ماضی کے لداخ میں ایسے بھی اشخاص تھے جن کی منمو سے وابستگی بتائی جاتی تھی۔

میرے بچپن کا واقعہ ہے جب لیہہ میں تیراندازی کا ایک بڑا تہوار لگتا تھا۔دن کو تیراندازی اور رات کو کھیل تماشا ہوتا تھا۔یہ آرغون تیراندازی کے نام سے جانا جاتا تھا۔

تہوار کے اکثر شرکاء آرغون مسلمان ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ رات کو میلے کے منتظمین پٹرومیکس ہاتھ میں اٹھا اٹھا کر سامنے کی پہاڑی پر نظر ڈال رہے تھے۔ تماشائیوں کو تجسس تھا کہ یہ کیوں پہاڑی پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ ہم نے سنا پہاڑی پر دومنموگزر رہی تھیں۔ تب لوگ ایسی باتوں پر یقین رکھتے تھے۔

ایسی میں ایک عجیب وغریب مخلوق 'بالوئی یا بالشتیا تھی جس کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک عصا ہوتا تھا۔ یہ روایت مشہور تھی کہ اگر کوئی بالشتیا کا عصا چھین لے تو وہ اس آدمی کا بے دام غلام بن جاتا تھا۔ وہ خوش قسمت بالشتیا سے اس طرح کام لیتا تھا۔ جس طرح نیک خصلت دین کا چراغ پانے والا دیو سے کام لیتا تھا۔

لیہہ میں ایک غیر آباد جگہ تھی۔ کہا جاتا تھا کہ یہ جگہ بالشتیاؤں کا مسکن ہے لیکن ایک خوش قسمت آدمی کو ہی بالشتیا نظر آتا تھا۔ اس زمانے میں ایسے راوی مل جاتے تھے جو بالشتیا کے وجود کی تصدیق کرتے تھے۔ قصبے میں کھمبا یا لٹھ پر سوار ہو کر رات کو چلنے والی عورتیں تھیں۔ جن کو 'ڈونگ جون پا' یا لٹھ سوار کہا جاتا تھا۔ انہیں چڑیل اور ڈائن سمجھا جاتا تھا۔ یہ عورتیں لٹھ پر سوار ہو کر تیز رو گھوڑے کی طرح دوڑتی تھیں۔ جو کوئی ان کی زد میں آجائے تو اس کی ہڈی پسلی ٹوٹ سکتی تھی۔ اگر کوئی من چلا ایسی کسی عورت کو پکڑ لیتا تو اس آدمی کی منت سماجت کرتی۔ پاؤں پڑتی اور مٹھی گرم کرتی تھی کہ اس کا نام اخفائے راز میں رکھ جائے۔

ایک بزرگ نے میرے سامنے دعویٰ کیا اس نے ایسی عورت کو پہچان لیا تھا جو ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ بقول بزرگ اس نے اس عورت کو ان غلط حرکات کے لئے سرزنش کی تھی۔

ان کے علاوہ باپو اور باموتھے۔ باپو مرد اور باموعورت ہوتی تھی۔ یہ عام لوگ تھے لیکن بقول راوی متوازی زندگی گزارتے تھے۔ ان کی خفیہ زندگی تخریبی ہوتی تھی جس سے بالواسطہ طور لوگوں کو گزند پہنچتی تھی۔ کئی دیہی علاقوں میں باپو اور باموکا زیادہ چرچا تھا حتیٰ کہ ان کی نشان دہی کی جاتی تھی اور ان پر انگشت نمائی ہوئی تھی۔

انہیں یاد کر کے مجھے یورپ کا تاریک دَور یاد آتا ہے جب عورتوں پر witch یا جادوگرنی کا الزام لگایا جاتا تھا۔ انگلینڈ میں سولہویں صدی میں اس الزام میں ہزاروں بے گناہ عورتوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

پھر پری تھی۔ بقول راوی، پانی میں پری کا عکس دیکھنے سے کسی کسی عورت پر ہسٹریائی کیفیت طاری ہوتی تھی۔لوگ تو اس کے لئے کسی مرد یا عورت کو معتوب قرار دیتے تھے۔کہا جاتا ہے کہ متاثرہ عورت یا مریضہ کو دانٹ ڈپٹ پلانے، دھمکی دینے اور مارنے سے وہ جس آواز اور زبان میں جواب دیتی، وہ اس کی آواز نہیں بلکہ معتوب شخص کی آواز ہوتی ہے۔

آج بھی خاص کر عورتیں ایسے عارضہ کا شکار ہوتی ہیں۔نفسیاتی اور ذہنی امراض کے معالج اور ماہرینِ نفسیات اسے ایک پیچیدہ ذہنی مرض قرار دیتے ہیں اور علاج کرتے ہیں۔تب مسلمان جنوں کے بڑے قائل تھے اور جنوں سے گلوخلاصی پانے کے لئے عامل سے رجوع ہوتے تھے۔عامل جنوں کو اپنے قابو میں رکھتے تھے۔کوئی کوئی عامل آسیب زدہ افراد کو ہمزاد سے نجات دلانے کے لئے مخصوص عمل کرتے تھے۔بودھ اپنے مسائل کے حل کے لئے اکثر کاہن Oracle کے پاس جاتے تھے۔

لداخ کی نئی نسل منمو، بالو، باپو، باموا اور پری جیسے کرداروں اور ان کے ناموں سے ناواقف ہیں۔یہ ماضی کے قصے ہیں جو لداخی ثقافت اور تاریخ کی دین ہیں۔نئے دَور کے لوگ اور تاریخ دان ان کی توجیہات اور تاویلات جس طرح کریں یہ ان کے اختیار میں ہیں۔

البتہ شنینڈے یا SPIRIT کی وارداتوں کا ذکر آج کل بھی ہوتا ہے۔ایسے مذہبی اس اعتقاد کو تقویت ملتی ہے کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ پیدا ہوگا اور اس کے اعمال کا احتساب ہوگا۔

☆☆☆

☆......اصل: پروفیسر فدا محمد حسین
ترجمہ و تلخیص: ایشان شالیماری

یوسف شاہ چک اور مغل۔ بعض نئے مباحث

محمد یوسف شاہ اور اس کے چچا ابدال چک کے درمیان شاہی تخت کو حاصل کرنے کی دوڑ کو لے کر جنگ کی وجہ سے ۱۵۷۹ء میں یوسف شاہ کی شاہی تخت پر جانشینی اچھا شگون ثابت نہیں ہوا۔ یہ سعید مبارک تھا جس نے نوہٹہ کے میدانِ جنگ میں ابدال چک کو ہرانے اور اس کا خاتمہ کرنے میں محمد یوسف شاہ کی مدد کی۔ سُلطان کی حکومت صرف دو ماہ کیلئے قائم رہ پائی تھی کیونکہ ایک کشمیری رئیس ابدال بٹ نے اس کے خلاف بغاوت کی تھی۔ مغل دوریا اس کے اثر ور سوخ میں رقم کی گئیں تاریخوں میں اس طرح کی بغاوتوں کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ سلطان انتظامیہ کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دیتے تھے اور سارا وقت رقص و موسیقی کی سنگت میں برباد کرتے تھے۔ ایک تاریخ دان چاڈورہ کے ملک حیدر سلطان کو کنجوس شخص بھی قرار دیتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سلطان علی شاہ کی اچانک موت کے نتیجے میں مستقبل کے حکمران اور شاہی تخت کے بسیار دعوے داروں کا سوال پیدا ہوا۔ علاوہ ازیں شاہی محل میں اندرونی بحران نے کشمیری اُمراء کی کارستانیوں کی وجہ سے مزید سنگین صورت اختیار کر لی جن میں ابدال بٹ اور اس کے ہم خیال لوگوں کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ سعید مبارک کا اُتار اور چڑھاؤ حقیقی طور پر لالچی لوگوں کے سیاسی کھیل کا بدترین نتیجہ تھا۔ یہاں تک کہ لوہر چک کو کشمیر کے تخت پر بٹھانا بھی ابدال چک کی سیاسی چال تھی جو نام نہاد بادشاہ کی آڑ میں خود حکومت کرنا چاہتا تھا۔

کشمیر کے تخت وتاج پر لوہر شاہ کی رسائی نے محمد یوسف شاہ کے دِل کو درد و کرب سے بھر دیا۔ کشمیری اُمراء کے غیر مخلصانہ رویئے نے اس کے دماغ پر جیسے تاریکی مسلط کردی۔ راجوری میں کشمیر کی سرحدوں پر قیام کرنے کے دوران اُس نے دعوتیں ملنے کے خواب دیکھے تھے لیکن اس کی تمام اُمیدوں پر پانی پھرتا دکھائی دے رہا تھا۔ لاچار و نا اُمید ہو کر اس کو ایک طاقتور شخص سے مدد لینے کی سوجھی اور وہ مغل شہنشاہ اکبر کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ سعید مبارک کے بھتیجوں نے اُسے یہ معاونت لینے کی صلاح دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے خدام اور حشم کے ہمراہ فتح پور سکری پہنچے اور اکبر کے دربار میں پیش ہوئے۔ معزول بادشاہ محمد یوسف شاہ مغل شہنشاہ کی عدالت میں تقریباً ایک سال تک مدد کی گزارش کرتے رہے جبکہ اکبر اپنی حکمتِ عملی سے کسی بھی مثبت جواب کو ٹالتے رہے۔ اُنہوں نے اِس التجا پر کسی دوسرے موقعے پر مستقبل میں غور کرنے کے لئے رضامندی ظاہر کی۔[۲]

اِس کشمیری معروف شخص کے ساتھ نہایت شائستگی سے عالی شان مہمان کی طرح برتاؤ کیا گیا۔ نیز مرزا یوسف خان اور راجہ مان سنگھ کو یوسف شاہ کو کشمیر کا تخت واپس دلانے میں مدد کیلئے نامزد کیا گیا۔[۳] دریں اثناء مفرور بادشاہ کو اطلاع ملی کہ کافی کشمیری لوگوں کو سلطان لوہر شاہ چک کی حکومت کے فریب کا احساس ہو گیا ہے اور وہ سابق بادشاہ سلطان محمد یوسف شاہ چک کی جماعت میں شامل ہونے کیلئے کشمیر سے بھاگ گئے ہیں۔ اُس کو خبر ملی کہ کشمیری اُمراء خصوصاً شمس چک اور عالم شیر خان اس کی حمایت کرنے کے لئے کشمیر چھوڑ چکے ہیں۔ اپنے اہلِ خانہ اور فرزندوں کی بے تحملی کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ باہلولر کی جانب روانہ ہوئے۔

یوسف شاہ چک، مرزا یوسف خان اور راجہ مان سنگھ کے ہمراہ لاہور پہنچ گئے۔ لیکن اُنہیں بہت قلیل فوجی طاقت کے ساتھ روانہ کیا گیا تھا۔ مغلوں کی اِس مدد کے بارے میں جب کشمیری اُمراء نے سُنا تو وہ بے قرار ہو گئے کہ کہیں مغل اپنے خفیہ ایجنڈا کو بروئے کار لا کر کشمیر کو اپنا غلام نہ بنالیں۔ کشمیر کے نامور امیر ابدال بٹ نے وقت ضایع کئے بغیر سابق

☆......اصل: پروفیسر فدا محمد حسین
ترجمہ و تلخیص: ایشان شالیماری

یوسف شاہ چک اور مغل ۔ بعض نئے مباحث

محمد یوسف شاہ اور اس کے چچا ابدال چک کے درمیان شاہی تخت کو حاصل کرنے کی دوڑ کو لے کر جنگ کی وجہ سے ۱۵۷۹ء میں یوسف شاہ کی شاہی تخت پر جانشینی اچھا شگون ثابت نہیں ہوا۔ یہ سعید مبارک تھا جس نے نوہٹہ کے میدانِ جنگ میں ابدال چک کو ہرانے اور اس کا خاتمہ کرنے میں محمد یوسف شاہ کی مدد کی۔ سُلطان کی حکومت صرف دو ماہ کیلئے قائم رہ پائی تھی کیونکہ ایک کشمیری رئیس ابدال بٹ نے اس کے خلاف بغاوت کی تھی۔ مغل دور یا اس کے اثر ورسوخ میں رقم کی گئیں تاریخوں میں اس طرح کی بغاوتوں کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ سلطان انتظامیہ کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دیتے تھے اور سارا وقت رقص و موسیقی کی سنگت میں برباد کرتے تھے۔ ایک تاریخ دان چاڈورہ کے ملک حیدر سلطان کو کنجوس شخص بھی قرار دیتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سلطان علی شاہ کی اچانک موت کے نتیجے میں مستقبل کے حکمران اور شاہی تخت کے بسیار دعوے داروں کا سوال پیدا ہوا۔ علاوہ ازیں شاہی محل میں اندرونی بحران نے کشمیری اُمراء کی کارستانیوں کی وجہ سے مزید سنگین صورت اختیار کر لی جن میں ابدال بٹ اور اس کے ہم خیال لوگوں کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ سعید مبارک کا اُتار اور چڑھاؤ حقیقی طور پر لالچی لوگوں کے سیاسی کھیل کا بدترین نتیجہ تھا۔ یہاں تک کہ لوہر چک کو کشمیر کے تخت پر بٹھانا بھی ابدال چک کی سیاسی چال تھی جو نام نہاد بادشاہ کی آڑ میں خود حکومت کرنا چاہتا تھا۔

کشمیر کے تخت وتاج پر لوہر شاہ کی رسائی نے محمد یوسف شاہ کے دِل کو درد و کرب سے بھر دیا۔ کشمیری اُمراء کے غیر مخلصانہ رویئے نے اس کے دماغ پر جیسے تاریکی مسلط کردی۔ راجوری میں کشمیر کی سرحدوں پر قیام کرنے کے دوران اُس نے دعوتیں ملنے کے خواب دیکھے تھے لیکن اس کی تمام اُمیدوں پر پانی پھرتا دکھائی دے رہا تھا۔ لاچار و نااُمید ہو کر اس کو ایک طاقتور شخص سے مدد لینے کی سوجھی اور وہ مغل شہنشاہ اکبر کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ سعید مبارک کے بھتیجوں نے اُسے یہ معاونت لینے کی صلاح دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے خدام اور حشم کے ہمراہ فتح پور سیکری پہنچے اور اکبر کے دربار میں پیش ہوئے۔ معزول بادشاہ محمد یوسف شاہ مغل شہنشاہ کی عدالت میں تقریباً ایک سال تک مدد کی گزارش کرتے رہے جبکہ اکبر اپنی حکمتِ عملی سے کسی بھی مثبت جواب کو ٹالتے رہے۔ اُنہوں نے اِس التجا پر کسی دوسرے موقعے پر مستقبل میں غور کرنے کے لئے رضامندی ظاہر کی۔[۲]

اِس کشمیری معروف شخص کے ساتھ نہایت شائستگی سے عالی شان مہمان کی طرح برتاؤ کیا گیا۔ نیز مرزا یوسف خان اور راجہ مان سنگھ کو یوسف شاہ کو کشمیر کا تخت واپس دلانے میں مدد کیلئے نامزد کیا گیا۔[۳] دریں اثناء مفرور بادشاہ کو اطلاع ملی کہ کافی کشمیری لوگوں کو سلطان لوہر شاہ چک کی حکومت کے فریب کا احساس ہو گیا ہے اور وہ سابق بادشاہ سلطان محمد یوسف شاہ چک کی جماعت میں شامل ہونے کیلئے کشمیر سے بھاگ گئے ہیں۔ اُس کو خبر ملی کہ کشمیری اُمراء خصوصاً شمس چک اور عالم شیر خان اس کی حمایت کرنے کے لئے کشمیر چھوڑ چکے ہیں۔ اپنے اہلِ خانہ اور فرزندوں کی بے تحملی کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ باہلولر کی جانب روانہ ہوئے۔

یوسف شاہ چک، مرزا یوسف خان اور راجہ مان سنگھ کے ہمراہ لاہور پہنچ گئے۔ لیکن اُنہیں بہت قلیل فوجی طاقت کے ساتھ روانہ کیا گیا تھا۔ مغلوں کی اِس مدد کے بارے میں جب کشمیری اُمراء نے سُنا تو وہ بے قرار ہو گئے کہ کہیں مغل اپنے خفیہ ایجنڈا کو بروئے کار لا کر کشمیر کو اپنا غلام نہ بنا لیں۔ کشمیر کے نامور امیر ابدال بٹ نے وقت ضایع کئے بغیر سابق

بادشاہ کو خفیہ خطوط ارسال کئے اور اُنہیں مغل شہنشاہ کے ارادوں کی نسبت اپنے شبہات سے آگاہ کیا۔ اِس کے ساتھ ساتھ ابدال بٹ نے سابق بادشاہ کو خبردار کیا کہ وہ مغلیہ فوجوں سے ہوشیار رہیں۔ جو ان کی مدد کرنے کی آڑ میں کشمیر پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ اپنے سابق وزیرِ اعلیٰ کی صلاح موصول ہوتے ہی سابق بادشاہ چوکنے ہو گئے اور مغلیہ عہدیداران مرزا یوسف خان اور راجہ مان سنگھ پر اعتماد نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے خفیہ طور پر اُن سے الگ ہونے کا ارادہ کیا۔ لاہور میں انہوں نے تاجروں سے ایک بڑی رقم اُدھار لی اور تقریباً آٹھ سو فوجیوں پر مشتمل ایک جمعیت تیار کی اور اپنے حمایتی کشمیری اُمراء اور اپنے فرزندوں سے ملنے بہلول پورہ کی جانب روانہ ہوئے۔ یہ شاہی ریاست میں صورتِ حال پر نگاہ رکھنے کیلئے انہوں نے ولی عہد کو مقرر کیا اور اُسے کشمیر کی جانب روانہ ہونے کی ہدایت دی۔

اب سابق بادشاہ محمد یوسف شاہ کو یقین ہو گیا کہ مغل بادشاہ اکبر اس کی مدد کرنے میں مخلص نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ہمراہ یہاں تک آنا کشمیر پر قابض ہونے کی ایک حکمت عملی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اپنی ٹانگوں پر خود کھڑا ہونے اور اپنے حقوق کی خاطر خود لڑنے میں ہی عافیت ہے۔ اُسے کشمیری امراء کی جانب سے خفیہ خطوط موصول ہوئے تھے جن میں اِس بات کی تاکید کی گئی تھی کہ وہ مغلوں کی مدد کو ٹھکرا دیں اور کشمیر پہنچ جائیں جہاں ہر ایک اُن کا خیر مقدم کرنے کیلئے تیار ہے۔ چنانچہ سابق بادشاہ نے مغلوں کو چکمہ دے کر اپنے حقوق کیلئے لڑنے کی خاطر کشمیر کی راہ اختیار کر لی۔ بعد میں اہلِ خانہ کو پونچھ قلعے میں چھوڑ کر خود راجوری کی پہاڑیوں میں پہنچ گئے۔ جب مغل شہنشاہ کو اِس بات کی اطلاع ملی تو وہ کافی ناراض ہو گئے اور صورتِ حال کو سنبھالنے میں لاپرواہی برتنے کی پاداش میں راجہ مان سنگھ اور مرزا یوسف خان کی نکتہ چینی کی۔ [۵]

کشمیر کی طرف کوچ کے وقت سابق بادشاہ محمد یوسف شاہ کے ساتھ کئی کشمیری اُمراء شامل ہوئے۔ ایک ہزار فوجیوں کے شامل ہونے سے جو اس کے سابق وزیرِ اعلیٰ محمد بٹ نے لائے تھے، شاہی فوج کی تعداد لگ بھگ چھ ہزار ہو گئی جس میں چار ہزار گھڑ

سوار اور دو ہزار پیادہ فوجی شامل تھے۔ اب وہ کشمیر میں اپنے دُشمن کے ساتھ لڑنے کے قابل ہو گیا تھا۔ تاہم سلطان لوہر شاہ چک اور اس کے وزیر اعلیٰ نے دفاع کے لئے بھر پور تیاریاں کیں۔ آغاز میں ہیبرہ پور درّے پر دفاعی مورچہ بندی کرنے کا فیصلہ لیا گیا جسے پیر پنچال پہاڑیوں پر واقع کشمیر کا دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ اِس درّے کے مکمل دفاع کو یقینی بنانے کے لئے یوسف خان ولد حُسین شاہ کی سربراہی میں یہاں ایک فوجی دستہ تعینات کیا گیا۔ لیکن اس فوجی دستے نے، جسے سابق بادشاہ کے خلاف لڑنے کیلئے بھیجا گیا تھا، دفاعی چوکیوں سے راہِ فرار اختیار کرلی اور فوراً محمد یوسف شاہ کی فوج میں شامل ہو گیا۔ دریں اثناء دو نامور کشمیری اُمراء میر حسن چاڈورہ اور شمس دونی بھی اپنی فوجوں سمیت محمد یوسف شاہ کے ساتھ شامل ہونے کیلئے چلے گئے۔ اس کے بعد گھڑ سوار اور توپ خانہ دِن رات اپنی جگہوں سے بھاگتے رہے اور حملہ آور فوجوں کے ساتھ شامل ہوتے رہے۔ اس دھچکے کے باوجود ابدال بٹ نے حملہ آور فوجوں کو دندان شکن جواب دینے کی خاطر مکمل تیاریاں کیں۔ اُس نے وادی کی طرف کھُلنے والے تمام درّوں کو بند کروادیا۔ محمد یوسف شاہ کا خیر مقدم کرنے کے اپنے کئے گئے وعدوں کو توڑ کر اُس نے خود ہیر پور میں قیام کیا تا کہ وہ سابق بادشاہ کا مقابلہ پوری طاقت کے ساتھ کر سکے۔ اُس نے احتیاطاً ایک پیشگی فوجی دستے کو دو تجربہ کار کمانڈروں یوسف اور حسین کی سربراہی میں نوشہرہ میں تعینات کیا تا کہ محمد یوسف شاہ کی حملہ آور فوجوں کو روکا سکے۔ لیکن یہ دو کمانڈر بھی فوراً ہی سابق بادشاہ کے جھنڈے تلے آ گئے۔ ے

سابق بادشاہ محمد یوسف شاہ نے حتمی دھاوا بولنے سے پہلے فیصلہ کیا کہ وہ پہلے کشمیر کے سب سے زیادہ ذی اثر امیر سعید مبارک کی ہمدردی حاصل کرے گا جسے لوہر شاہ چک نے نظر بند رکھا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ابدال بٹ نہ صرف چالاک تھا بلکہ عیار بھی۔ وہ اپنی چال بازی اور خوشامد سے سعید مبارک کی اخلاقی ہمدردی اپنے حق میں حاصل کر لے گا۔ اُس نے سیاسی حکمتِ عملی کے ایک اقدام کے طور پر سعید مبارک کو ایک خط ارسال کیا جس میں یہ درج تھا:۔

"اپنے وجود کو مستحکم کرنے اور اپنے خود غرضانہ مفادات کی تکمیل کی خاطر ابدال بٹ جناب والا کو اِخلاقی حمایت کی فراہمی کیلئے اصراف کرے گا۔ اُمید ہے کہ حضورِ والا اس کی بات نہ رکھ کر اُسے کوئی تحفظ فراہم نہ کریں گے۔ میں نے اپنی کاوشوں کا نتیجہ خدا پر اِس اعتماد کے ساتھ چھوڑا ہے کہ حضورِ والا کی دُعائیں میرے ساتھ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ابدال بٹ کے تمام کارنامے ناکام ہونے والے ہیں کیونکہ اُن پر حضورِ والا کا ہاتھ نہیں ہے۔"

سعید نے محمد یوسف شاہ کا خوش کُن پیغام نہایت سنجیدگی سے سُنا اور اِس پر ہمدردانہ غور کرنے کی رضامندی ظاہر کی۔ اُس نے محبت کے جذبات کا جواب محبت سے یہ کہہ کر دیا کہ اپنے تخت کو واپس حاصل کرنے کے لئے سابق بادشاہ کی سعی قابلِ سراہنا ہے۔ سعید مبارک کی دُعائیں اور حوصلہ افزائی سابق بادشاہ کیلئے باعثِ مسرت بنی۔ اُس نے کشمیر کی جانب دم خم کے ساتھ مزید آگے بڑھنے کا آغاز کیا۔ ہیراپور درّے کے بجائے اُس نے چراہار درّے کی جانب پیش قدمی کی اور یہاں لوہر شاہ چک کے محافظوں کو شکست دی۔ اس طرح وہ سوپور اور ملحقہ علاقوں پر فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ پراجیہ بھٹ اور شُک نے اپنی راج ترنگنی میں سابق بادشاہ کی آمد کو اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"اب بادشاہ یوسف ایک سال کے عرصے کے بعد کشمیر لوٹ آئے۔ اُنہوں نے سویاپورہ گاؤں میں پناہ لی جس طرح سورج مشرقی چوٹی پر آرام کرتا ہے۔ وتستا کے پانی کی وجہ سے اِس گاؤں تک رسائی مشکل تھی۔ بادشاہ پھر کافی لوگوں کو ساتھ لے کر شہر کی جانب نکل پڑے۔ جیسے کوئی شیر پہاڑ میں اپنے بڑے غار سے نکلتا ہے۔"

سوپور کی لڑائی:

سوپور میں اپنی بنیاد کو مضبوط کرتے ہوئے محمد یوسف شاہ نے ایک اور سیاسی چال

چلی۔ اُس نے ابدال بٹ کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنے کیئے ہوئے وعدوں کو پورا کرتے ہوئے خود کو اس کے سامنے پیش کرے اور کشمیر کا شاہی تخت دوبارہ حاصل کرنے میں اس کے ساتھ تعاون کرے۔

اب ابدال بٹ نے ایک اور چال چلی۔ اس نے سعید مبارک اور علی چک کو نظر بندی سے آزاد کر دیا۔ اِس چال کا مقصد یہ تھا کہ اُسے سعید مبارک کی ہمدردی حاصل ہو جسے کشمیر کی بادشاہت کے تئیں گراں قدر خدمات اور معمر ہونے کے سبب کشمیری نوابوں میں کافی وقار حاصل تھا۔ لیکن سعید مبارک جو ابدال بٹ کو ایک مکار اور دھوکہ باز انسان کے طور پر جانتا تھا نے خاموشی اختیار کرنے اور عبادت و ریاضت میں مشغول رہنے کو ہی ترجیح دی۔ اب بادشاہ لوہر شاہ چک اور اس کے لالچی وزیر ابدال بٹ نے اِس خیال کو ترک کیا اور ایک اور منصوبہ سابق بادشاہ کی حوصلہ شکنی کیلئے تیار کیا۔ انہوں نے شاہی تخت کا دعویٰ کرنے اور یوسف شاہ چک کے خلاف آگے آنے کی خاطر علی چک کی حوصلہ افزائی کی۔ اب اِن تینوں لوہر شاہ چک، ابدال بٹ اور علی چک نے محمد یوسف شاہ کو دندان شکن جواب دینے کے لئے آپس میں ہاتھ ملائے۔[11] لوہر شاہ چک نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنی پوری قوت سے ابدال بٹ اور علی چک کی مدد کے ساتھ مقابلہ کرے گا۔ یہاں تک کہ محمد یوسف شاہ کے فرزند یعقوب کو بھی لوہر چک کی جماعت میں شامل ہو کر اپنے ہی والد کے خلاف دُشمنانہ رویہ اختیار کرنے کیلئے اُکسایا گیا۔ ابدال بٹ نے اپنی ہتھیار بند فوج کے ساتھ سوپور کی جانب پیش قدمی کی۔ اس گاؤں تک وتستا کے پانیوں کی وجہ سے رسائی مشکل تھی۔ لوہر شاہ نے بھی دارالحکومت سے اپنی فوج کے ہمراہ پیش قدمی کی۔ حیدر چک کو معلوم تھا کہ وتستا کے پانی کی وجہ سے سوپور تک رسائی مشکل ہے لہٰذا اس نے محمد یوسف شاہ تک پہنچنے کے لئے دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔[12]

ابدال بٹ نے لالچی بھیڑیئے کی مانند ایک اور فریب سے کام لیا۔ اُس نے بابا خلیل سے کہا کہ وہ درج ذیل پیغام محمد یوسف شاہ تک پہنچائے:۔

"آپ کا یہ حقیر خادم اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ مرحوم

سلطان علی شاہ ہی تھے جنہوں نے مجھے ذلت سے اُٹھا کر فیاضی کے بلند مقام تک پہنچادیا۔ چنانچہ مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ میں آپ کو مفسد عناصر کے حکومت میں بدنظمی برپا کرنے کے ناپاک منصوبوں سے آگاہ کروں۔ میں آپ کو نہایت عاجزی کے ساتھ مطلع کرتا ہوں کہ کشمیر کے کچھ رئیسوں اور کمانڈروں نے میدانِ جنگ میں آقا کا ساتھ چھوڑ دینے کی سازش رچائی ہے۔ منصوبے کے مطابق لوہر شاہ چک نے اپنی فوجوں سمیت دریا پار کرنے کا فیصلہ کیا ہے جبکہ حیدر چک کو دو ہزار جوانوں کے ساتھ حضورِ والا پر پیچھے سے دھاوا بولنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ یا یہ حقیر خادم حضورِ والا کو یہ صلاح دیتا ہے کہ آپ فوراً پونچھ کی طرف روانہ ہو جائیں۔ بصورتِ دیگر یہ بات یقینی ہے کہ دُشمن حضورِ والا کو قیدی بنالیں گے۔"[۱۳]

ابدال بٹ نے سابق بادشاہ محمد یوسف شاہ کو مذکورہ پیغام بھیج کر ایک لالچی بھیڑیئے اور ایک خونخوار شیر کا کردار نبھایا تھا۔ ایک طرف وہ چاہتا تھا کہ محمد یوسف شاہ کے ذہن میں کشمیری نوجوانوں کی ایمانداری کے تئیں شبہات پیدا ہوں۔ دوسری جانب وہ اپنے حریف پر اپنی اعلیٰ طاقت کا رعب جمانا چاہتا تھا اور اس پیغام کا تیسرا پہلو یہ تھا کہ وہ محمد یوسف شاہ کے ذہن پر خوف طاری کرنا چاہتا تھا تا کہ وہ سوپور سے راہِ فرار اختیار کر کے پونچھ میں پناہ لینے کیلئے تیار ہو جائے۔ لیکن محمد یوسف شاہ جو ابدال بٹ کے مکار ذہن سے بخوبی واقف تھا، نے اس کی توقع کے خلاف اس کے ساتھیوں کو مطلع کیا کہ میدانِ جنگ میں بہادُر کا انجام خُدا کے چاہنے کے مطابق ہوتا ہے۔

محمد یوسف شاہ نے اپنے کمانڈروں کے ساتھ تبادلۂ خیال کے بعد لوہر شاہ چک پر فوجی حملے کا ایک منصوبہ تیار کیا۔ اُس نے اپنی فوجی طاقت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جبکہ چار جوانوں کو بائیں اور گھڑ سواروں کو دائیں طرف تعینات کیا۔ خود ایک گھوڑے پر سوار ہو کر

وتستا کے پانی کو پار کر کے اس نے لوہر چک کی فوجوں پر ایک شدید حملے کی سربراہی کی۔ اب ابدال بٹ محمد یوسف شاہ کے روبرو نمودار ہوا اور دونوں نے زبردست جنگ لڑی، جس نے تمام زندہ جانوں کو دہشت زدہ کیا۔ لیکن محمد یوسف شاہ نے اِس کالے سانپ پر اپنا نیزہ پھینکا اور وہ اِس حملے میں ہلاک ہو گیا[14]۔ ابدال بٹ کی ہلاکت نے شاہی فوج میں الجھن پیدا کی اور ہر جوان میدان جنگ سے بھاگ کر اپنی زندگی بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اِس صورتحال میں محمد یوسف شاہ اور اس کے شجاع کمانڈروں یوسف خان، حسین خان، شمس چک، میر حسن، عالم شیر، شمس دونی اور سید سیف بھاگتے ہوئے فوجیوں پر شیروں کی طرح جھپٹ پڑے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کئے۔ اُنہوں نے لوہر شاہ کے اردگرد فوجیوں کے دائرے کو توڑ کر اُسے لاچار کر دیا۔ فوجی جان بچانے کے لئے بھاگنے لگے اور شاہی سواری کو میدانِ جنگ میں اکیلا چھوڑ دیا۔ حبیب خان ولد ابدال خان جسے ابدال بٹ نے قید کیا تھا، کو میدانِ جنگ میں زنجیروں میں جکڑا ہوا پایا گیا۔ محمد یوسف شاہ نے زنجیروں کو توڑ کر اُسے آزاد کرنے کا حکم دیا۔ اِس کے بعد سابق بادشاہ نے فتح کا جھنڈا بلند کر کے ایک جلوس کی صورت میں دارالخلافہ کی جانب رُخ کیا۔ یہ صرف محمد یوسف شاہ کی اپنی ہمت اور شجاعت کا نتیجہ تھا کہ اُس نے شاہی تخت کو دوبارہ واپس حاصل کیا تھا۔[15]

محمد یوسف شاہ کی فتح نے حیدر چک کی فوجوں میں اُلجھن پیدا کی۔ حیدر چک کے حوصلے پست ہوئے اور اُس نے جنگل میں پناہ لی۔ تاہم شاہی سپاہیوں نے اُنہیں ڈھونڈ نکالا۔ ایک خوفناک جنگ ہوئی اور خون کی ندیاں بہادی گئیں۔ حیدر چک حقیقی طور پر ایک بیچارے کی طرح مغل شہنشاہ اکبر سے مدد مانگنے کیلئے بھاگ گیا۔[16]

دُشمنوں کو شکست دینے کے باوجود سلطان محمد یوسف شاہ کو کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ سابق حکمران لوہر شاہ چک اپنے کمانڈروں اور سپاہیوں سمیت جن کی تعداد تقریباً پانچ ہزار تھی دارالخلافہ اور آس پاس کے دیہات میں چھپے بیٹھے تھے۔ بادشاہ اُنہیں کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتے تھے۔ حیدر چک بھی اپنے سپاہیوں کو چرہار کے جنگلوں میں چھوڑ کر فرار ہو گیا

تھا۔ تاہم یہ ضروری تھا کہ لوہر چک کے حامی نوابوں، جنہوں نے یوسف شاہ کے خلاف لڑائی لڑی تھی کو ڈھونڈ نکالا جائے۔ نئے وزیرِ اعلیٰ محمد بٹ جو بادشاہ کا وفادار تھا، نے صلاح دی کہ باغیوں اور اُن کے لیڈران کو تلاش کیا جائے جو شاہی ریاست میں چھپے ہوئے تھے۔ وزیرِ اعلیٰ کی صلاح سے اتفاق کرتے ہوئے بادشاہ نے باغی لیڈروں اور اُن کے حامیوں کو ڈھونڈ نکالنے کی خاطر زبردست تلاشی کارروائی شروع کرنے کا حکم دیا۔ اِس کیلئے جاسوسوں کی خدمات طلب کی گئیں تا کہ مجرموں کو پکڑا جائے۔ معزول بادشاہ لوہر چک کو ڈھونڈ نکالنا اِس سلسلے میں پہلا قدم تھا اور اُسے قاضی موسیٰ کے گھر میں روپوش پایا گیا۔ معزول بادشاہ اور قاضی موسیٰ کے اعلیٰ مقام کا احترام کرتے ہوئے بادشاہ نے اپنے دو اُمراء کو گھر کے اندر جانے کا حکم دیا۔ لوہر چک کو پکڑتے ہی سلطان محمد یوسف شاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کے برادر محمد چک کو میران سعید برخوردار کے گھر میں روپوش پایا گیا۔ اُسے بھی پکڑ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ ایک اور کشمیری رئیس حسی چک جو ہمیشہ اپنی شیخی بگارتا پھرتا تھا کو جمشی باسو کی کوٹھی میں پایا گیا۔ بکچا گنائی جس نے باغیوں کو اُکسانے میں سب سے بڑا کردار ادا کیا، کو یوسف خان کے گھر سے گھسیٹ کر نکالا گیا اور بادشاہ کے دربار میں مقدمے کیلئے پیش کیا گیا۔ دیگر سرغنہ لیڈروں اور سپاہیوں کو بھی جو دیہات میں روپوش بیٹھے تھے کو تلاش کر کے دربار میں پیش کیا گیا اور ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔

سلطان محمد یوسف چک طبعیتاً انصاف کے اصولوں اور شفافیت پر یقین رکھتے تھے۔ وہ ایک فیض رساں حکمران تھا جو معاف بھی کر سکتا تھا اور رنجشوں کو بھول بھی سکتا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ بادشاہت میں افراتفری پیدا کرنے اور قتل وغارت کے مرتکب عناصر کو سزا ملے۔ جب اہم مجرموں اور باغیوں کو اُن کے سامنے پیش کیا گیا تو بادشاہ نے اُن پر چار فردِ جرم عائد کئے اور اپنا دفاع کرنے کی اجازت دی۔ اُس نے حکومت کے خلاف اُن کے جرائم ایک ایک کر کے ثبوت سمیت اس طرح گنوائے:۔

(۱) امن اور مفاہمت کی راہ ترک کر کے آپ نے بغض اور دُشمنانہ رویہ اختیار کیا اور

میرے ساتھ بے وفائی کی۔ اپنے بادشاہ کا ساتھ چھوڑ کر آپ نے گڑبڑ اور افراتفری کی علم کو بلند کرنے کیلئے سعید مبارک شاہ کے ساتھ ہاتھ ملایا اور اُسے مختلف تکالیف میں مبتلا کرنے کیلئے آپ ذمہ دار ہو۔[۱۷]

(ب) اس امر کے باوجود کہ ذی احترام سعید آپ کے محسن رہے تھے۔ آپ منافرت اور لوگوں کو تقسیم کرنے کے عمل میں ملوث رہے۔ مجھے شاہی تخت کی زینت بڑھانے کیلئے برتھال سے آنے کی دعوت دی اور پھر اپنے وعدوں سے پھر گئے۔ یہاں تک کہ لوہر شاہ کے ساتھ مل کر اُسے بادشاہ کے عہدے تک پہنچایا۔[۱۸]

(ج) جس وقت میں نے کشمیر کو فتح کرنا چاہا آپ نے مجھے گمراہ کُن خطوط بھیج کر دھوکہ دیا، میری حمایت کرنے کے وعدے کئے اور مجھ سے شاہی افواج واپس بھیجنے کی التجا کی۔ شاہی حمایت کو چھوڑ کر جب میں اِس سرزمین پر پہنچا تم اپنے وعدے بھول گئے اور میرے خلاف لڑنے کیلئے فوجوں کا اہتمام کیا۔[۱۹]

(د) اپنی فراخ دلی کی وجہ سے میرے قابلِ احترام والد مرحوم بادشاہ نے آپ کو خاک سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچایا تھا۔[۲۰] میں نے بھی مزید فیاضی کا مظاہرہ کر کے آپ کے ساتھ آزادانہ رویّہ روا رکھا۔ مگر آپ نے میرے خلاف دُشمنانہ اور نافرمانبردارانہ راہ چُن کر ناشکری کا مظاہرہ کیا۔ اس طرح آپ نے دانستہ طور پر شریعتِ محمدیؐ کی خلاف ورزی کی ہے اور اس طرح قرانِ مجید کی آیاتِ مبارکہ پر عمل نہیں کیا ہے:۔

> ''اللہ کی اطاعت کرو، اس کے پیغمبر کی اطلاعت کرو اور اس کی فرمانبرداری کرو جو تم میں سے حکومت چلا رہا ہو''۔ چنانچہ تم اپنے غلط اعمال کی وجہ سے باغیوں اور شرانگیز عناصر کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ لہٰذا تمہیں تمہارے خون اور جائیداد سے قانون کے مطابق محروم کر کے اُسے بادشاہت کے حق میں ادا کیا جا رہا ہے۔''[۲۱]

باغی یہ الزامات سُن کر ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ بکچا گنائی جو مصائب پیدا کرنے

والے لیڈروں میں سرِ فہرست تھا، نے شاہی عدالت میں بیوقوف کلامی کی اور غیر محتاط تبصرہ کیا تاہم بادشاہ نے اعلیٰ ضبطِ نفس کا مظاہرہ کیا۔ سرکردہ سازشی ابدال بٹ نہایت پریشانی میں مبتلا ہو گیا اور اپنے دفاع میں کچھ نہ کہہ سکا۔ دیگر سازشی افراد کو شرمندگی محسوس ہوئی اور وہ چُپ چاپ کھڑے رہے۔ اس کے بعد بادشاہ نے سابق بادشاہ لوہر شاہ اور اس کے بھائیوں محمد خان اور حسی چک پر رحم کرنے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے تاہم اُن کی بینائی چھیننے کے لئے کہا تا کہ وہ بادشاہت کا دعویٰ کرنے کے قابل نہ رہیں۔ یکچا گنائی، فتح خان جنڈو اور حُسین کوکا کی ٹانگیں جسم سے الگ کر کے اُنہیں ان کے جرائم کی سزا دینے کا حکم دیا گیا۔ یوسف لنڈو، سری گام کے علی خان اور علی بٹ جیسے دیگر مجرموں کو ہرجانہ بھرنے کا حکم دیا گیا۔ بادشاہ نے علی خان، نوروز چک اور یوسف خان جیسے دوسرے باغیوں کو بھی موت کی سزا نہیں دی۔ اس کے بجائے اُنہیں جیل میں قید کیا گیا۔ بادشاہ اُن سپاہیوں اور گاؤں والوں کو عام معافی دینے کے حوالے سے کافی رحم دِل تھے جنہوں نے اس کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا۔ اُنہیں سزا دینے کی بجائے بادشاہ نے اُن پر رحم کیا اور ان کی زمین اور جاگیر بحال کر دی۔

بادشاہ نے اُس سعید مبارک کے ساتھ نمٹنے میں عظیم فراخ دلی کا مظاہرہ کیا جس نے کشمیر کے شاہی تخت پر قلیل مدت کیلئے قبضہ بھی کیا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ حالات اور دشمنوں کی سازشوں نے سعید مبارک کو اُس کے مقابلے میں کھڑا کیا تھا۔ سلطان محمد یوسف شاہ نے بذاتِ خود سعید مبارک سے ملاقات کی اور حکومتی امور میں اس کی صلاح مانگی۔ یہاں تک کہ اُس نے سعید کے پوتے کو اپنی بیٹی رشتے میں دے کر اُس کے ساتھ خاندانی رشتہ جوڑا۔ اپنی حکومت کو دوام بخشنے کیلئے اُس نے سعید کے فرزندوں کے ساتھ پُر تپاک تعلقات قائم کئے۔ اِس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے بادشاہ اکثر سعید کے گھر جاتے اور اُنہیں بھی کبھی کبھار شاہی محل آنے کی دعوت دیتے تھے۔ [۲۲]

غیر معمولی حکمران:

سلطان محمد یوسف شاہ ذہن وقلب کی غیر معمولی خوبیوں کے مالک حکمران تھے۔ حضرت بابا داؤد خاکی اپنے قصیدہ غسلیہ یوسف شاہی میں بادشاہ کی تعریف اِن الفاظ میں کرتے ہیں کہ وہ ایک معروف حکمران، شفقت اور سخاوت کی زندہ مثال، دانشوروں کے سرپرست اور دین داروں اور نیک بختوں کے عظیم دوست ہیں۔ [۲۳] ایسا لگتا ہے کہ حبہ خاتون کے بغیر ان کی کئی بیویاں تھیں۔ ایک ولی عہد ہونے کی حیثیت سے اُس نے کشتواڑ کی ایک شہزادی سے شادی کی تھی۔ فتح پور سکری میں قیام کے دوران اکبر بادشاہ نے اُسے دو لونڈیاں عطاء کیں۔ ان کی تیسری بیوی سے ہوئی بیٹی کی سعید مبارک کے پوتے سے شادی کرادی گئی۔ اُس نے آخر کار حبہ خاتون کو اپنی اہلیہ بنالیا۔ بہارستانِ شاہی کے مصنف لکھتے ہیں کہ سلطان محمد یوسف شاہ کو اللہ نے حسین چہرے اور خوش وضع جسم سے نوازا تھا۔ وہ نہایت تعلیم یافتہ اور کشمیری زبان کے علاوہ اُنہیں ہندی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ موسیقی کے نہایت شوقین ہونے کی وجہ سے اُس نے ہندوستان سے کئی شعراء اور موسیقاروں کو یہاں آنے کے دعوت دی تھی۔ وہ جب بھی آرائشی محفلوں میں فن وموسیقی سے لطف اندوز ہوتے تو یہ مصرعے دوہراتے:۔

> ''لطف اٹھاؤ، کیونکہ پلک جھپکتے ہی بہار اوجھل ہوجائے گی اور
> خزاں اس کی جگہ لے گی۔'' [۲۴]

سلطان محمد یوسف شاہ نے اپنی حکومت کا آغاز ایک فیض رساں بادشاہ کے طور پر کیا۔ اُنہوں نے محمد بٹ کو اپنا وزیر اعلیٰ مقرر کیا۔

> ''بادشاہ نے مُلک پر اس طرح حکومت کی جس طرح سورج
> کنول کی پتیوں کو صُبح سویرے اپنی نور کی کرنوں سے جگمگاتا ہے۔ جب
> بادشاہ نے مُلک پر اپنی حکمرانی کا آغاز کیا، اِندر بھگوان نے بارش کا

اہتمام کیا۔ ہواؤں نے فضا کو معطر کر دیا اور سوریہ دیوتا خود جلوہ گر ہو گئے۔اس کی شہرت دُنیا بھر میں ہوئی۔ لیکن اس کی کامرانیوں نے اس کی اچھائیوں کو گھر کے اندر ہی قیام کیا اور کہیں باہر نہیں بھٹکیں۔"[۲۵]

ملکہ حبہ خاتون:

علی شاہ نے کشمیر کے شاہی تخت کو 1571ء میں سلطان یحییٰ الدین محمد علی غازی کے نام سے رفعت بخشی۔ 1573ء میں بادشاہ نے کشتواڑ کے تخت وتاج پر غلبہ حاصل کرنے کی خاطر اپنی فوجیں بھیجیں۔ وہاں کے حکمران راجہ بہادر سنگھ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سلطان محمد علی پادشاہ غازی کو ریاست کا فرماں روا تسلیم کرنے کا اقرار کیا اور خراجِ عقیدت ادا کرنے کیلئے راضی ہوئے۔ اپنی فرمانبرداری کے ثبوت کے طور اُس نے اپنی بہن شنکر دیوی کو بادشاہ کے پوتے شہزادہ محمد یعقوب کو رشتے کے لئے پیش کیا۔ 1573ء میں کشتواڑ کے راجہ کے خلاف ایک اور کارروائی کی گئی جس نے اِس مرتبہ بھی ہتھیار ڈال دیئے اور فرمانبرداری کی علامت کے طور پر اپنی بیٹی کو کشمیر کے بادشاہ کیلئے روانہ کیا۔ شادی کے وقت اُسے فتح خاتون کا لقب عطاء کیا گیا۔ سلطان ظہیر الدین محمد علی پادشاہ غازی کا 1579ء میں انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ یوسف پادشاہ غازی نے لے لی۔ تخت نشین ہونے سے قبل شاہزادے نے دو شادیاں کی تھیں۔ 1547ء میں اس کی پہلی شادی سے دو بیٹے ہوئے جن کے نام یعقوب اور ابراہیم تھے۔[۲۶] پہلی بیوی کے فوت ہونے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو موسیقی اور شعروشاعری کی نذر کرلیا۔ افسردگی کے انہی دِنوں میں اس کی ملاقات ایک اعلیٰ اقدار والی خاتون حبیبہ سے ہوئی جو سیّد کمال الدین کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ بی بی حبیبہ عرف حبہ خاتون قابلِ احترام سید خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اُن کے خاندانی شجرۂ نسب کا ایک کشمیری سکالر نے خاکہ تیار کیا ہے جسے یہاں قاری کی دلچسپی کیلئے پیش کیا جا رہا ہے:

سید فخر الدین

|

سید رکن الدین

|

سید بہاؤ الدین عرف بہار شاہ

سید جعفر — بی بی حبیبہ عرف حبہ خاتون

سید فخر الدین اور اُن کے برادر سید فرید الدین تقریباً 1364ء میں واردِ کشمیر ہوئے اور دارالحکومت کے ایک علاقہ جمالٹہ میں آباد ہوئے۔ وہ خوارزم سے میر سید حیدر الکُبروی کے ہمراہ یہاں آئے تھے۔ سید فخر الدین کو میر سید علی ہمدانی کے ایک مشہور مرید کے طور پر جانا جاتا ہے، جس نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کیلئے اونتی پورہ گاؤں کو مرکز بنالیا تھا۔ اِس کام میں اُن کے فرزند سید رُکن الدین نے اُن کی مدد کی۔ یہ دونوں اپنی نیک ولی اور علمیت کیلئے کافی مشہور تھے۔ سید فخر الدین کا یومِ وصال کسی کو بھی معلوم نہیں ہے البتہ اُنہیں نیوہ، چارتھ، پلوامہ کشمیر میں دفن کیا گیا تھا۔ ۲۷

سید فرید الدین، جو جسمانی طور پر کمزور تھے، دارالحکومت کے شہر جمالٹہ میں آباد ہوئے تھے۔ اُن کا شجرۂ نسب یوں ہے۔

سید فرایدالدین

|

سید محمد جعفر

سید محمد جعفر — بی بی بدیع اُلجمال

مریم بی بی — سید کمال الدین

پیدائش اور تعلیم:

ملا محمد حسین عرف حسام الدین اپنی تصنیف گُلستانِ کشمیر میں لکھتے ہیں کہ نیوہ اور جمالٹہ میں رہائش پذیر یہ دونوں سید خاندان اپنی تیسری پُشت سے باہمی رشتہ میں جُڑ گئے۔ بدیع الجمال کی شادی سید بہاؤالدین عرف سید بہار شاہ کے ساتھ کردی گئی۔ اُن کے یہاں ایک بیٹی بی بی حبیبہ پیدا ہوئی جس کے مقدر میں کشمیر کی ملکہ بننا تھا۔ اس کی دوسری شادی کے وقت شہزادہ یوسف شاہ نے اُسے حبہ خاتون خطاب سے نوازا۔[۴۸]

یہ بات کافی دلچسپ ہے کہ ملکہ حبہ خاتون اپنے سلسلہ نسب کے بارے میں ہمیں خود ان اشعار میں بتاتی ہیں:

مألس ناو چھُم سیّدالبہارو
ماجے ناو چھُم بدرُ الجمال
سیّد کوُر چھس پُر کمالو
ووتھہِ لالو نیٚندرِ رے

☆

مالِن مےٚ ارباب أسی
توے دورہم حبہ خاتون ناو

''میرے والد کا نام سیّد بہار ہے۔ والدہ کا نام بدرُ الجمال۔ میں کمالوں والی سادات کی لڑکی ہوں۔ میرے پیارے نیند سے جاگ جاؤ، میرے میکے والے حاکم تھے۔ لہذا میرا نام حبہ خاتون رکھا گیا تھا''۔

پیدا ہونے کے وقت والدین نے اس کے نام حبیبہ رکھا تھا، جسے بعد میں سلطان نے اس کے ساتھ شادی کے وقت تبدیل کیا۔ دراصل یہ لقب تھا جو اُسے شہزادے کی جانب سے عطا ہوا تھا اور حبہ خاتون کا مطلب محبوب عورت ہے۔

بی بی حبیبہ کی پیدائش کے فوراً بعد اُس کی والدہ بدرُ الجمال کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ

اُسے ایک آیا نے پالا پوسا، جو کو کلتاش عابدی راتھر ساکنہ چند ہارہ کی اہلیہ تھی۔ حبیبہ نے قرآنِ مجید کی تعلیم ایک مقامی مسجد کے مولوی سے حاصل کی۔ بعدازاں اُس نے فارسی سیکھی اور شیخ سعدی کی مشہور تصانیف گلستان اور بوستان پڑھیں۔ اُس نے فِکر اور ذکر کی صوفیانہ طرز پر ریاضت میں دلچسپی لی۔ ایک وقت آیا جب اس نے صوفی سلسلے میں ایک عارفہ کا درجہ حاصل کیا۔[۳]

اُس نے کشمیری، شِنا اور فارسی زبانوں میں نظمیں لکھنا شروع کیں۔ خدا نے اُسے خوبصورت آواز عطا کی تھی اور وہ نعتِ شریف اور گانے میں مہارت رکھتی تھی۔ اس کے سرپرستوں نے بھی اُسے موسیقی کے اُساتذہ کے پاس بھیجا جس نے اُسے کئی مقام اور راگنیاں سکھائیں۔

پہلا نکاح:

جب بی بی حبیبہ بالغ ہوئی تو اس کی شادی چچیرے بھائی سید کمال الدین کے ساتھ کی گئی، جو جمالٹہ میں رہتا تھا۔ یہ شادی گھر کے بڑوں کی جانب سے دو کنبوں کو متحد کرنے کے لئے منظّم کی گئی تھی۔ دُلہا اور دولہن طبیعتاً دونوں ایک دوسرے کی ضِد تھے۔ سید کمال الدین حبیبہ کے مقابلے میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ وہ شریعت اور سُنت کا نہایت ہی پابند تھا اور اِن ہی اصولوں کے تحت زندگی نہایت نظم وضبط کے ساتھ گوارنے کا متمنی تھا۔ اِس کے برعکس بی بی حبیبہ کو جذباتی اور ذہنی طور پر اپنے شوہر پر سبقت حاصل تھی۔ وہ طبیعتاً آزاد خیال تھی جو مہربان، انسان دوست اور رحم دِل صوفی اصولوں کے بیچ پلی بڑی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حبیبہ اور سید کمال الدین کی شادی ناکام ثابت ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کو ناپسند کرنے لگے۔ اِدھر ایک اور شخص اِن دونوں کے بیچ میں آ گیا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ سید کمال الدین کی بہن مریم بی بی تھی۔ وہ یہ برداشت نہیں کرتی تھی کہ ایک خاتون کو موسیقی اور شعرو شاعری سے دلچسپی ہو۔ دونوں خواتین نے آپس میں جھگڑے شروع کئے جس سے آگ مزید بھڑک اٹھی۔ آخر کار حبیبہ نے اپنے شوہر سے طلاق لی اور اپنے سرپرستوں کے گھر نیوہ

چارتھ پلوامہ واپس آ گئی۔ [۳۱]

بی بی حبیبہ کا دوسرا نکاح:

شہزادہ محمد یوسف نے حبیبہ کی اندوہ ناک زندگی کے بارے میں سُنا تھا، جسے لوگ ایک عظیم شاعرہ، معروف گلوکارہ اور صوفی کے طور پر جانتے تھے۔ شہزادے کے نمائندوں نے اس کی پہلی ملاقات کا حبیبہ کے ساتھ انتظام کیا۔ شہزادے کو اُس سے پہلی نظر میں ہی محبت ہو گئی اور وہ اس کی دانائی اور سمجھداری سے متاثر ہوا۔ اس کی حسین و جمیل صورت، میٹھی آواز اور دلکش شخصیت نے شہزادے کو مسحور کر دیا اور اُس نے فوراً اس کے ساتھ نکاح کا فیصلہ کیا۔ شہزادے نے اُسے حبہ خاتون یا خاتونِ محبت کا لقب عطا کیا۔ شادی کے بعد اُس نے ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا حیدر نام رکھا۔ جب محمد یوسف پادشاہ غازی نے 1579ء میں کشمیر کی حکومت دوبارہ سنبھالی تو حبہ خاتون ملکہ بنیں۔

پراجیہ بھٹ اور شُک اپنی راج ترنگنی میں سلطان محمد یوسف شاہ کے عظیم دورِ حکومت کے بارے میں بڑھا چڑھا کر لکھتے ہیں کہ:

> "بادشاہ یوسف نے مُلک پر اس طرح حکومت کی جس طرح سورج کنول کی پتیوں کو صبح سویرے اپنے نور کی کرنوں سے جگمگاتا ہے۔ جب بادشاہ نے مُلک پر اپنی حکمرانی کا آغاز کیا، اِندر بھگوان نے بارش کا اہتمام کیا، ہواؤں نے فضا کو معطر کر دیا اور سوریہ دیوتا خود جلوہ گر ہو گئے۔ اس کی شہرت دُنیا بھر میں ہوئی لیکن اس کی کامرانیوں نے اس کی اچھائیوں کے گھر کے اندر ہی قیام کیا اور کہیں باہر نہیں بھٹکیں۔ بادشاہ کئی خوبیوں کے مالک تھے لیکن اس کی غلطی صرف اتنی تھی کہ وہ خوشحالی کو پناہ نہیں دیتے تھے۔ جس کے نتیجے میں اُن کے گھر میں تذبذب پایا جاتا تھا اور جس کی وجہ سے اُس نے ابدی شہرت پائی۔" [۳۲]

سلطان محمد یوسف چک نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ شفاف اور منصفانہ اصولوں کے

تحت حکومت کا کام انجام دے۔ اُس نے بلالحاظ ذات ونسل رعایا کی بہبودی کے لئے بھی کافی محنت کی۔ وہ جمہوری سوچ کا بادشاہ تھا جس نے جزیہ ٹیکس کو کالعدم قرار دیا جو ہندو لوگوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ بادشاہ نے وہ بیشتر محصولات ختم کروادیئے جو سابق بادشاہوں نے عائد کئے تھے۔ چونکہ گائے کو ذبح کرنے سے ہندوؤں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اسلئے بادشاہ نے ایک فرمان جاری کیا جس کے مطابق گائے کو ذبح کرنے پر پابندی عائد کی گئی۔ فطرت کا شیدائی ہونے کے ناطے سے اُس نے جنگلوں کے تحفظ پر زور دیا۔ اُس نے اپنی فوج کو نظم وضبط قائم کرنے اور غیر قانونی سرگرمیوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیا۔[۳۴]

اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں سلطان محمد یوسف شاہ نے بلالحاظ ذات، رنگ و نسل اپنے ماتحتوں کو انصاف کی فراہمی یقینی بنائی۔ اُس نے اعلان کیا کہ قانون کے سامنے سب برابر ہیں۔ سپاہیوں اور اُمراء کو آمدن کا دسواں حصہ محصول کے طور دیئے جانے کے عمل کو کالعدم قرار دینے کے سلسلے میں بادشاہ کے بڑھتے رُجحان کو نوابوں اور اُمراء نے ناپسند کیا۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ عوام کے خلاف کوئی بھی غیر قانونی سرگرمی برداشت نہیں کی جائے گی۔ اُس نے بعض ایسی بدعات ختم کیں جو گزشتہ حکمرانوں نے لاگو کی تھیں۔ جزیہ کو خارج کرنے اور گائے کو ذبح کرنے پر پابندی کے عمل نے مزید آگ بھڑکا دی۔ کشمیری اُمراء پھر سے بے قرار ہوگئے اور اُنہوں نے معمول کی عادت کے مطابق سازشیں اور بغاوتیں شروع کیں۔ وہ مغل شہنشاہ اکبر کے ارادوں سے باخبر تھے جو کشمیر کو کسی بھی صورت میں ہڑپنا چاہتا تھا۔ کشمیری اُمراء کو معلوم تھا کہ اُن کی سازشوں اور کاروائیوں کو اکبر کی سرپرستی حاصل ہوگی۔ حیدر چک، شمس چک، عالم شیر خان، سید خان، محمد ملک لانگ اور سیف خان سازشی لوگوں میں شامل تھے۔ اِن میں سے حیدر چک فتح پور سکری تک اکبر سے مدد مانگنے چلا گیا تھا۔ اس کا مقصد کشمیر کے بادشاہ کے خلاف اکبر کی فوجی مدد طلب کرنا تھا۔[۳۵]

دریں اثناء بادشاہ کو شمس چک، عالم شیر خان، سید سیف خان اور محمد ملک لانگ کے ناپاک ارادوں کی خفیہ اطلاع ملی۔ بادشاہ نے اُنہیں گرفتار کر کے جیل میں بند کرنے کا

چارتھ پلوامہ واپس آ گئی۔ [۳۱]

بی بی حبیبہ کا دوسرا نکاح:

شہزادہ محمد یوسف نے حبیبہ کی اندوہ ناک زندگی کے بارے میں سُنا تھا، جسے لوگ ایک عظیم شاعرہ، معروف گلوکارہ اور صوفی کے طور پر جانتے تھے۔ شہزادے کے نمائندوں نے اس کی پہلی ملاقات کا حبیبہ کے ساتھ انتظام کیا۔ شہزادے کو اُس سے پہلی نظر میں ہی محبت ہوگئی اور وہ اس کی دانائی اور سمجھداری سے متاثر ہوا۔ اس کی حسین و جمیل صورت، میٹھی آواز اور دلکش شخصیت نے شہزادے کو مسحور کر دیا اور اُس نے فوراً اس کے ساتھ نکاح کا فیصلہ کیا۔ شہزادے نے اُسے حبہ خاتون یا خاتونِ محبت کا لقب عطا کیا۔ شادی کے بعد اُس نے ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا حیدر نام رکھا۔ جب محمد یوسف پادشاہ غازی نے 1579ء میں کشمیر کی حکومت دوبارہ سنبھالی تو حبہ خاتون ملکہ بنیں۔

پراجیہ بھٹ اور شُک اپنی راج ترنگنی میں سلطان محمد یوسف شاہ کے عظیم دورِ حکومت کے بارے میں بڑھا چڑھا کر لکھتے ہیں کہ:

> "بادشاہ یوسف نے مُلک پر اس طرح حکومت کی جس طرح سورج کنول کی پتیوں کو صبح سویرے اپنے نور کی کرنوں سے جگمگاتا ہے۔ جب بادشاہ نے مُلک پر اپنی حکمرانی کا آغاز کیا، اِندر بھگوان نے بارش کا اہتمام کیا، ہواؤں نے فضا کو معطر کر دیا اور سوریہ دیوتا خود جلوہ گر ہو گئے۔ اس کی شہرت دُنیا بھر میں ہوئی لیکن اس کی کامرانیوں نے اس کی اچھائیوں کے گھر کے اندر ہی قیام کیا اور کہیں باہر نہیں بھٹکیں۔ بادشاہ کئی خوبیوں کے مالک تھے لیکن اس کی غلطی صرف اتنی تھی کہ وہ خوشحالی کو پناہ نہیں دیتے تھے۔ جس کے نتیجے میں اُن کے گھر میں تذبذب پایا جاتا تھا اور جس کی وجہ سے اُس نے ابدی شہرت پائی۔" [۳۲]

سلطان محمد یوسف چک نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ شفاف اور منصفانہ اصولوں کے

تحت حکومت کا کام انجام دے۔ اُس نے بلالحاظ ذات و نسل رعایا کی بہبودی کے لئے بھی کافی محنت کی۔ وہ جمہوری سوچ کا بادشاہ تھا جس نے جزیہ ٹیکس کو کالعدم قرار دیا جو ہندو لوگوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ بادشاہ نے وہ بیشتر محصولات ختم کروادئے جو سابق بادشاہوں نے عائد کئے تھے۔ چونکہ گائے کو ذبح کرنے سے ہندوؤں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اسلئے بادشاہ نے ایک فرمان جاری کیا جس کے مطابق گائے کو ذبح کرنے پر پابندی عائد کی گئی۔ فطرت کا شیدائی ہونے کے ناطے سے اُس نے جنگلوں کے تحفظ پر زور دیا۔ اُس نے اپنی فوج کو نظم و ضبط قائم کرنے اور غیر قانونی سرگرمیوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیا۔[۳۴]

اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں سلطان محمد یوسف شاہ نے بلالحاظ ذات، رنگ و نسل اپنے ماتحتوں کو انصاف کی فراہمی یقینی بنائی۔ اُس نے اعلان کیا کہ قانون کے سامنے سب برابر ہیں۔ سپاہیوں اور اُمراء کو آمدن کا دسواں حصہ محصول کے طور دیئے جانے کے عمل کو کالعدم قرار دینے کے سلسلے میں بادشاہ کے بڑھتے رُجحان کو نوابوں اور اُمراء نے ناپسند کیا۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ عوام کے خلاف کوئی بھی غیر قانونی سرگرمی برداشت نہیں کی جائے گی۔ اُس نے بعض ایسی بدعات ختم کیں جو گزشتہ حکمرانوں نے لاگو کی تھیں۔ جزیہ کو خارج کرنے اور گائے کو ذبح کرنے پر پابندی کے عمل نے مزید آگ بھڑکادی۔ کشمیری اُمراء پھر سے بے قرار ہوگئے اور اُنہوں نے معمول کی عادت کے مطابق سازشیں اور بغاوتیں شروع کیں۔ وہ مغل شہنشاہ اکبر کے ارادوں سے باخبر تھے جو کشمیر کو کسی بھی صورت میں ہڑپنا چاہتا تھا۔ کشمیری اُمراء کو معلوم تھا کہ اُن کی سازشوں اور کاروائیوں کو اکبر کی سرپرستی حاصل ہوگی۔ حیدر چک، شمس چک، عالم شیر خان، سید خان، محمد ملک لانگ اور سیف خان سازشی لوگوں میں شامل تھے۔ اِن میں سے حیدر چک فتح پور سکری تک اکبر سے مدد مانگنے چلا گیا تھا۔ اس کا مقصد کشمیر کے بادشاہ کے خلاف اکبر کی فوجی مدد طلب کرنا تھا۔[۳۵]

دریں اثناء بادشاہ کو شمس چک، عالم شیر خان، سید سیف خان اور محمد ملک لانگ کے ناپاک ارادوں کی خفیہ اطلاع ملی۔ بادشاہ نے اُنہیں گرفتار کر کے جیل میں بند کرنے کا

حکم دیا۔ کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے سیف خان اور محمد ملک لانگ کی رہائی کا حکم دیا تاہم دیگر دو سازشی شمس چک اور عالم شیر خان بدستور نظر بندر کھے گئے۔ اسی دوران حبیب خان پنجاب کی پہاڑیوں کی جانب بھاگ گیا۔ تقریباً تین ماہ بعد حیدر چک جو ہندوستان سے لوٹا تھا اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس طرح وہ شمس چک کو بادشاہ کے خلاف اُکسانے اور بولر کے قلعے سے باغیوں کا جھنڈا بلند کرنے کے قابل ہوئے۔ تاہم شاہی فوجوں نے قلعے کے اردگرد گھیرا ڈالا اور اُسے گرفتار کر لیا۔ شمس چک کو بادشاہ کے سامنے زنجیروں میں جکڑ کر لایا گیا۔ قریبی رشتہ دار ہونے کے باوجود بادشاہ نے اُسے معاف کرنے سے انکار کیا۔ باغیوں کا سرغنہ ہونے کی وجہ سے اُسے جیل میں بند کرنے کا حکم دیا گیا۔[۳۶]

حبیب چک:

شمس چک کو قید کرنے کے فوراً بعد بادشاہ کو ایک اور بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ افراتفری کے دوران یوسف خان ولد علی خان اور نوروز چک جنہیں نظر بند رکھا گیا تھا پہاڑوں کی جانب بھاگنے اور بادشاہ کے خلاف بغاوت کے رابطہ کار حبیب خان کے ساتھ شامل ہونے میں کامیاب ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد مزید کشمیری اُمراء جو بادشاہ سے ناخوش تھے اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اب اِن سب نے حبیب خان، حیدر چک اور یوسف خان کی رہنمائی میں سلطان یوسف شاہ چک کو برباد کرنے کے طور طریقوں پر توجہ مرکوز کی۔ چنانچہ بلتستان کے حکمران سے مدد طلب کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بلتستان کے بادشاہ غازی میر جس کا دارالحکومت اسکردو میں تھا، نے لداخ، شیغر، پوریگ اور کھپلو کے راجاؤں کو شکست دی تھی۔ جب کشمیری اُمراء کا ایک وفد حیدر چک کی سربراہی میں سکردو پہنچا اور بادشاہ سے مدد مانگی تو کھپلو کے گورنر نے رائے مہرام نے بادشاہ کے حکم کے مطابق چار سے پانچ ہزار سپاہیوں کو گھوڑوں پر سوار ہتھیاروں سے لیس اُن کے تابع رکھا۔ جب محمد یوسف شاہ نے یہ خبر سُنی اُس نے وزراء، اُمراء اور کمانڈروں کو مشاورت کیلئے طلب کیا۔ اُس نے تمام شاہی جنگجوؤں کو ہتھیاروں سے لیس کرنے کا حکم دیا تا کہ وہ باغیوں کا مقابلہ کر سکیں۔ بادشاہ نے

حملہ آوروں کو پیچھے دھکیلنے کیلئے فوج بھیجی۔ شاہی فوجوں کی پیش قدمی کی اطلاع سُن کر حبیب خان کے اُدھار کے گھڑسواروں میں افراتفری پیدا ہوگئی۔ اس کے کچھ سپاہیوں نے ہم وطنوں کے خلاف فرقہ وارانہ منافرت کا جھنڈا بلند کیا۔ اس مایوس کن صورتِ حال میں بکتی فوج کشمیری شاہی فوجوں کے ساتھ لڑنے کے بغیر ہی اپنے وطن لوٹ گئی۔ اس طرح حیدر چک کے منصوبوں پر پانی پھر گیا اور وہ کشتواڑ بھاگ گیا۔ حبیب خان نے اپنے آپ کو شاہی فوجوں کے چنگل میں پایا اور وہ کئی کشمیری اُمراء سمیت دارالخلافہ میں روپوش ہوگیا۔ تلاشی کی زور دار مہم کے دوران حبیب خان کو اس کے 10 باغی ساتھیوں سمیت سونہ وار میں دھر لیا گیا۔ یوسف خان کو بھی اس کے برادران سمیت پرنگ سے گرفتار کیا گیا۔ تمام باغی لیڈران کو بادشاہ کے سامنے فیصلہ سنانے کیلئے پیش کیا گیا۔ [۳۸]

بادشاہ نے حکومت میں انتشار پیدا کرنے کیلئے باغیوں کی ملامت کی۔ بادشاہ نے کہا کہ جن لوگوں نے فتنہ فساد کو ہوا دی اُنہیں آگ میں زندہ جلانا اُن کے لئے مناسب سزا ہے۔ بادشاہ حبیب خان اور اس کے ساتھیوں کے خلاف آگ بگولہ ہوگئے تھے۔ چنانچہ ان کی آنکھیں نکال دینے کا حکم صادر کیا گیا۔ [۳۹] اس کے بعد یوسف خان اس کے برادران اور رشتہ داروں کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے اُن کی ٹانگیں کاٹ ڈالنے کا حکم دیا۔ علی خان ولد نوروز چک کے معاملے میں بھی بادشاہ نے اس کی آنکھیں نکالنے کا حکم دیا تاکہ وہ انتظامی امور کے قابل نہ رہیں۔

محمد بٹ:

محمد بٹ ایک نامور امیر تھا جس نے 1572ء میں شہزادہ یوسف خان کو اس کے والد سلطان علی شاہ کے خلاف بغاوت پر اُکسایا۔ یہ اس کی صلاح کا نتیجہ تھا کہ شہزادے نے ایبہ خان کو قتل کر کے علی شاہ کو گہرا صدمہ پہنچایا۔ تاہم سلطان اور شہزادے کے درمیان سید مبارک نے دوبارہ خوشگوار حالات پیدا کئے تھے۔ اس کے بعد محمد بٹ کو ضرر رساں سرگرمیوں کیلئے قید کیا گیا۔ بعد میں علی شاہ کے انتقال کے بعد اُسے رہا کیا گیا۔ جب ابدال

بٹ شاہی تخت حاصل کرنے کیلئے آگے آیا تو اُس وقت سید مبارک اور محمد بٹ نے بادشاہ بننے کیلئے محمد یوسف شاہ کا ساتھ دیا۔ ابدال چک کے انتقال کے بعد محمد یوسف شاہ اگلا سلطان بننے کا دعویدار تھا۔ تاہم نئے بادشاہ نے اپنے لئے وزیرِ اعظم کا عہدہ منتخب کیا۔ بدقسمتی سے ابدال بٹ کی بغاوت کی وجہ سے سلطان کو تخت سے ہاتھ دھونے پڑے اور وہ زندگی کی خیر منانے کیلئے پہاڑوں کی جانب بھاگ گیا۔

1580ء میں دوسری مرتبہ تخت واپس حاصل کرنے کے بعد محمد یوسف شاہ نے محمد بٹ کو اپنا وزیر اعلیٰ بنایا۔ محمد بٹ حالانکہ قابل اور لایق شخص تھا تاہم اُس پر انانیت کا بھوت سوار ہو گیا اور وہ بردباری کا شعور کھو بیٹھا۔ وہ دوسرے اُمراء پر ہر لحاظ سے حاوی ہونا چاہتا تھا۔ شمس دونی کی نسبت خصوصاً اور دیگر اُمراء کی نسبت عمومی طور پر بُغض اور حسد سے پُر محمد بٹ نے ہر ممکن کوشش کی کہ بادشاہ بھی اُن کے تئیں اِسی طرح کا رویہ اپنائے۔ چنانچہ سلطان یوسف شاہ بنیادی طور پر دِل کا نیک اور طبیعتاً نرم انسان تھا۔ اُس نے اس طرح کسی بھی معاملے کو نظر انداز کیا اور کسی کے خلاف کوئی تعصّبانہ اقدام کرنے پر راضی نہیں ہوا۔ وزیرِ اعلیٰ بادشاہ کو اپنے ذاتی مقاصد کیلئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ بعد میں اُس نے اپنے ماتحتوں کی کوئی بھی بات ماننے سے انکار کیا۔ مجموعی طور پر باہمی انتشار کا نتیجہ یہ نکلا کہ محمد بٹ اپنے بادشاہ کا خفیہ دشمن بن گیا۔ وہ سلطان سے بدلہ لینے کیلئے مناسب موقعے کی تلاش میں تھا۔ وہ موقعہ اُسے یوسف خان ولد حسین شاہ کی صورت میں فراہم ہوا جو سلطان کو قتل کرنے کے سلسلے میں ایک مہم چلا رہا تھا۔ محمد بٹ نے نہ صرف یوسف خان کے ساتھ ہاتھ ملایا بلکہ سید مبارک کے بیٹوں کو بغاوت میں شریک ہونے کیلئے راضی کرنے لگا۔ اُسے کشمیر کے دیگر اُمراء کی حمایت حاصل کرنے کی کافی جلدی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سازش کا پردہ فاش ہو گیا اور سلطان کو اِن ناپاک عزائم کے بارے میں خبر ہو گئی۔ جب یوسف خان کو یہ پتہ چلا تو اُسے بادشاہ کی کارروائی کا شبہ ہوا اور وہ ڈر کے مارے اوڑی کے پہاڑوں کی جانب بھاگ گیا۔ سید مبارک کے فرزندوں کی سربراہی والی فوج نے باغیوں کا تعاقب

کر کے اُن پر حملہ بول دیا۔ خونین جھڑپ میں محمد بٹ کا بھائی حسی بٹ شدید زخمی ہو گیا اور اس کی فوج کو شکست ہوئی۔ محمد بٹ کو گرفتار کر لیا گیا۔ کچھ باغی فوجیں کشتواڑ کی جانب بھاگ گئیں اور حیدر چک کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔ کشمیری سپاہیوں کی اِس بڑی تعداد کے شامل ہونے سے حیدر چک کی حالت مستحکم ہو گئی۔

شہزادہ یعقوب:

شہزادہ یعقوب نافہمی اور کم عمری کی وجہ سے مُفسِد عناصر کے زیرِ اثر آ گیا اور اُس نے اپنے مثالی والد کی پالیسیوں پر بے اطمینانی ظاہر کی۔ بادشاہ کے سامنے اپنی جرأت کا مظاہرہ کرنے کے لئے وہ کشتواڑ کی جانب بھاگ گیا اور ابیہ چک کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ اس کے اسی اقدام سے باپ کے دِل کو کافی ٹھیس پہنچی۔ کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد باشاہ نے ملا حسن آسود کو کشتواڑ اپنے بیٹے کے پاس سفیر کے طور پر بھیجا تا کہ شہزادے کو راہِ راست پر آنے کے لئے راضی کیا جا سکے۔ ملا آسود ایک عقلمند انسان ثابت ہوا، جو اپنی دانائی اور نرم لہجے کی بدولت شہزادے کا دِل جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس نے شہزادے کو صلاح دی کہ وہ بزرگوں سے صلاح لے اور نوجوانوں کی سنگت کو ترک کرے جن کے پاس تجربے اور مہارت کا فقدان ہوتا ہے۔ اُس نے شہزادے کو صلاح دی کہ وہ شکاریوں کے چنگل میں نہ پھنسے جو اُسے پکڑ کر نگلنا چاہتے ہیں۔ اِس حکمتِ عملی سے وہ شہزادے کو اس کے والد کے شاہی محل میں پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ [۱۴]

حیدر چک کے کارنامے:

1580ء میں حیدر چک جو لوہر چک کے ساتھ مل گیا تھا کشتواڑ کی طرف نکل گیا۔ بادشاہ کے غیض و غضب سے خود کو بچانے کیلئے ابیہ چک بھی کشتواڑ بھاگ گیا اور حیدر چک کے ساتھ شامل ہو گیا۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد شمس چک جسے محمد یوسف شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد قید میں رکھا گیا تھا، جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور وہ بھی کشتواڑ جا کر حیدر چک کے ساتھ مل گیا۔ اس طرح کشتواڑ کشمیر کے بادشاہ کے خلاف

بغاوت کا مرکز بن گیا۔

اِس صورتِ حال نے بادشاہ کو بہت کمزور کر دیا۔ شرپسند عناصر اور حکومت کو حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے اور نقائص کو دور کرنے کیلیئے بادشاہ نے سرحدی چوکیوں کو مضبوط بنانے کا فیصلہ کیا۔ اِس مقصد کو حاصل کرنے کیلیئے اس نے شیر علی بٹ اور ناجی رینہ کو ہدایت دی کہ وہ حیدر چک کے قریب کنال گاؤں تک پہنچ جائیں۔[۱۴] چنانچہ جب حیدر چک نے اُنہیں اپنے فرائض میں لاپرواہی برتتے محسوس کیا۔ اُس نے اپنے کشتواڑ والی فوجی جمعیت کے ہمراہ اُن پر رات کے اندھیرے میں شدید حملہ بول دیا۔ اِس لڑائی میں شمس چک نے شیر علی بٹ کو ہلاک کیا جبکہ حیدر چک نے ناجی رینہ کو زندہ پکڑ لیا۔ اِس جھڑپ کے بعد شاہی فوج میں سے کافی لوگ باغیوں کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ مزید استحکام حاصل کرنے کے بعد باغیوں نے حیدر چک، شمس چک اور ایبہ چک کی سربراہی میں دارالخلافہ کی جانب پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کیا اور ڈکسم میں خیمہ زن ہو گئے۔[۴۲]

اِس صورتِ حال کو بھانپ کر محمد یوسف شاہ نے حیدر چک کے خلاف بذاتِ خود پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے سپاہیوں کے ایک پیشگی دستے کو شہزادہ یعقوب کی سربراہی میں روانہ کیا تاکہ باغیوں کی توجہ کو ہٹایا جائے۔ شہزادے کی مدد کیلیئے دو سید برادران ابوالمعالی اور ابراہیم خان کو تعینات کیا گیا۔ بادشاہ ایک بہت بڑی فوجی جمعیت کی سربراہی کرتے ہوئے باغیوں سے لڑنے کیلیئے دارالخلافہ سے باہر آ گیا۔ تاہم پیشگی فوجی دستے کو اُس وقت زبردست دھچکہ لگا جب باغیوں نے اُس پر پہاڑیوں کے بیچ گھپاؤں اور کمین گاہوں سے شدید حملے کیئے۔ خوف وہراس کی وجہ سے بیشتر شاہی فوجی اہلکار پسپا ہو گئے۔ تاہم سید برادران شہزادے کو سہارا دینے کیلیئے اپنی جگہوں پر قائم رہے۔ انہوں نے شہزادہ یعقوب کو صلاح دی کہ وہ باغیوں کو شکست دینے کیلیئے اپنے مقصد پر ڈٹا رہے اور پسپا ہو کر بادشاہ کے پاس ناکام لوٹنے سے پرہیز کرے۔

شاہی فوجیوں نے باغیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، حالانکہ اُن کی تعداد باغیوں کے

مقابلے میں کم تھی اور فتح حاصل کی۔ اُدھر بادشاہ کو شہزادہ یعقوب اور سید بھائیوں کے بارے میں افسوس کُن افواہوں کی اطلاع ملی اور اُنہوں نے میدانِ جنگ کی جانب مزید پیش قدمی کا حکم دیا۔ خون ریز لڑائی میں، جو ایک جنگل میں لڑی گئی، شاہی اور باغی دونوں فریقین کے کافی اہلکار مارے گئے۔ تاہم بادشاہ کے بہادر سپاہی میدانِ جنگ میں پورے حوصلے کے ساتھ ڈٹے رہے اور باغیوں کو دندان شکن شکست دی۔ حیدر چک نے جب خطرہ محسوس کیا تو وہ میدانِ جنگ سے فرار ہو گیا اور اپنی فوج کو شاہی سپاہیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ جب سید برادران نے فتح کا جھنڈا بلند کیا تو شاہی فوجی دستوں نے حیدر چک کے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو زیر و زبر کر دیا۔ محمد یوسف شاہ اور حیدر چک کے درمیان جنگل میں لڑی گئی اِس جنگ میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔[۴۳]

اس عظیم فتح کے بعد بادشاہ شہزادہ کے ہمراہ دارالخلافہ کی جانب لوٹ گیا۔ بادشاہ نے سید برادران کی عزت افزائی کی۔ اس کے علاوہ بہادر سپاہیوں اور اُن کے کمانڈروں کو مناسب انعامات سے نوازا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اپنی توجہ انتظامی امور اور رعایا کی جانب مبذول کی۔[۴۴] کچھ عرصہ بعد شمس چک، ایبہ خان اور دیگر لوگوں نے حکومت کے تیئں اپنے رویہ پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے بادشاہ کے ساتھ معافی مانگنے کے لئے رابطہ کی۔ بادشاہ نے نہ صرف اُنہیں کُھلے دِل سے معاف کیا بلکہ اُنہیں نوشہرہ اور بھیمبر کی جاگیریں بھی عطا کیں۔

حیدر چک:

میدانِ جنگ میں شکست کھانے کے بعد حیدر چک، یوسف چک اور علی چک کے ہمراہ کشتواڑ پہنچ گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے خُدام کو ساتھ لے کربلتستان پہنچ گئے۔ راجاؤں کی جانب سے مادی مدد نہ ملنے کے بعد حیدر چک نے مغلوں کی محافظت میں جانے کا فیصلہ کیا۔ آخر کار وہ لاہور پہنچ گیا اور خود کو پنجاب کے مغل صوبے دار راجہ مان سنگھ کے سامنے پیش کیا۔ چونکہ یہ مغلوں کیلئے تحفظ مانگنے والے کو چک خاندان کے خلاف ایک آلہ

کے طور پر استعمال کرنے کا سنہری موقعہ تھا، صوبیدار نے حیدر چک اور اس کے ساتھیوں کو تمام سہولیات فراہم کیں۔ راجہ نے حیدر چک کو مغل شہنشاہ کے دربار میں ایک باوقار جگہ بھی دلائی۔

مُغلوں کی مداخلت:

مغل شہنشاہ اکبر ہندوستان میں کسی چھوٹے موٹے سربراہ کی گستاخی برداشت کرنے کے موڑ میں نہیں تھا، خصوصاً کشمیر کے سلطان محمد یوسف شاہ کی جس نے 1580ء میں دوبارہ تخت نشین ہونے کے بعد اپنے آپ کو پادشاہ غازی یا بہادر بادشاہ کا لقب دیا تھا۔ یہ اُنہی دِنوں کی بات ہے جب مغلوں نے افغانستان سے بنگال تک اپنی حکومت قائم کی۔ لہٰذا وہ اپنی عروج پا رہی شہنشاہیت کی راہ میں کسی بھی خود مختار حکمران کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ کشمیر وادی کو سِلک روڑ پر جنگی محاذ کے اعتبار سے ایک خصوصی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے مغلوں نے اسے تابعِ فرمان رہنے کی فرمائش کی۔ حیدر چک، یوسف چک اور علی چک کا لاہور میں وارد ہونا اور راجہ مان سنگھ کا تحفظ طلب کرنا اِس بات کا واضح اشارہ تھا کہ مغل شہنشاہ اکبر اُنہیں کشمیر کے محمد یوسف شاہ کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔[۱۷]

حیدر چک اور اس کے ساتھیوں کی لاہور میں آمد کے سبب محمد یوسف شاہ کافی پریشان ہو گیا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اکبر اُنہیں میرے خلاف استعمال کرے گا۔ اُسے معلوم تھا کہ اکبر پہلے ہی اُسے ناخوش ہے اسلئے یہ ضروری تھا کہ دُشمن کی چالوں سے دفاع کیا جائے۔ بادشاہ نے خواجہ قاسم ولد خواجہ حیدر کو اعتماد میں لے کر اُسے اپنے خدشات کے بارے میں بتایا۔

اُس نے کہا:

"یہ دُور اندیشی اور عقلمندی کی بات نہیں ہے کہ دُشمنوں اور عیار لوگوں سے ناواقف رہا جائے اور دُشمن کو ایک عام غیر نقصان دہ فرد کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔"

بادشاہ کی رائے تھی کہ اس صورتِ حال میں یہ ضروری تھا کہ حیدر چک کے خفیہ منصوبوں کا دفاع کیا جائے۔ خواجہ قاسم نے بادشاہ کی رائے سے اتفاق کیا اور اپنی طرف سے بادشاہ کو اِن خدشات سے نکالنے کیلئے ہر ممکن تعاون کی پیش کش کی۔ منصوبے کے عین مطابق خواجہ قاسم غنی کابلی کے ہمراہ لاہور میں راجہ مان سنگھ کے پاس گئے اور راجہ اور مغل افسران کیلئے بیش قیمتی تحائف لے گئے۔ کچھ دِن بعد خواجہ قاسم نے راجہ اور اس کے افسران کے ساتھ حیدر چک کے خلاف بات کرنے کا موقعہ ڈھونڈ نکالا۔ تاہم وہ راجہ کو حیدر چک کے خلاف باور کرانے میں ناکام ہوا۔ اِس کے برعکس اس کا یقین اِس بات کیلئے مزید پختہ ہوگیا کہ حیدر چک کو محمد یوسف شاہ کے خلاف ایک مہرے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

کشمیر کے بادشاہ کیلئے راجہ مان سنگھ کی کوئی بھی حمایت حاصل کرنے میں ناکامی کے بعد خواجہ قاسم شاہ واپس لوٹ گیا۔ اپنی ناکامی کے اعتراف کرنے کے برعکس اُس نے بادشاہ کے سامنے مان سنگھ کی بلاواسطہ حمایت حاصل کرنے کا ڈھونگ رچایا۔ چنانچہ خوشامد اور جھوٹ کی مدد سے اُس نے بادشاہ کو اسی درجہ بے وقوف بنایا کہ بادشاہ نے اُسے مرزا کے لقب سے نوازا۔ اُسے وزیرِ اعلیٰ کا عہدہ بھی عطا کیا گیا۔ شہزادہ یعقوب جسے خُدا نے دانائی و دور اندیشی کی فراوانی سے نوازا تھا، سمجھ گیا کہ خواجہ قاسم ایک جھوٹا انسان ہے اور اُس نے اپنے خود غرضانہ مفادات کی تکمیل کے لئے بادشاہ سے جھوٹ بولا ہے۔ یہاں تک کہ شہزادے نے اُسے بادشاہ کے دربار میں بھی لعن طعن کا شکار بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خواجہ قاسم اس کا دشمن بن گیا اور اُس نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ اسی دوران لاہور کے صوبیدار راجہ مان سنگھ نے تیمور بیگ کو اکبر بادشاہ کا صفیر بنا کر یوسف شاہ کے پاس بھیجا اور اُس پیغام کے الفاظ اس طرح تھے:

"آپ پر شاہی سرپرستی کی توجہ مرکوز کی جارہی ہے کیونکہ آپ کی کشمیر سے روانگی کو خلوص اور سچائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شاہی دربار میں ریاستی امور سے متعلق کوئی بھی رپورٹ داخل نہیں کی گئی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ باغیوں نے فتح حاصل کی ہے۔ لہٰذا حقیقی

صورتِ حال سے متعلق امور کی تفاصیل کسی بھی لیت و لعل کے بغیر داخل کی جانی چاہئیں۔ علاوہ ازیں ہم چاہتے ہیں کہ آپ بذاتِ خود شاہی دربار میں حاضر ہو جائیں۔''

مغلیہ صفیر نے کشمیری بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ وہ خود کو فرمانبرداری کے ساتھ سیکری فتح پور میں مغل بادشاہ اکبر کے سامنے پیش کرے۔ تیمور بیگ کے دورے نے خواجہ قاسم کو شہزادہ یعقوب سے بدلہ لینے کا اچھا موقعہ فراہم کیا۔ اُس نے بادشاہ پر زور دیا کہ اکبر بادشاہ کی فرمانبرداری کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ شہزادہ یعقوب کو مغلیہ دربار میں تحائف کے ساتھ بھیجا جائے۔ سلطان محمد یوسف شاہ جو اکبر کے خوف سے دوچار تھا، خواجہ قاسم کی اِس خود غرضانہ صلاح پر راضی ہو گیا۔ چنانچہ بادشاہ کا جانشین یعقوب مغل دربار میں پہنچ گیا اور اکبر کی خدمت میں دو سال گُزارے۔ دریں اثناء جب راجہ نیل کنٹھ بندیلا نے اکبر کی بالادستی کے خلاف بغاوت کی اُس نے اپنے فوجی کمانڈروں کو باغی پر حملہ کرنے کیلئے تیاریاں کرنے کا حکم دیا۔ شہزادہ یعقوب نے کئی محاذوں پر جنگ لڑی تھی اور اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُس نے پیش کش کی کہ وہ باقاعدہ جنگ لڑنے کے بغیر ہی باغی راجہ کا خاتمہ کرے گا۔ اکبر نے کشمیری شہزادے کو اپنی صلاحیت دکھانے کی اجازت دی۔ ایسا کرنے سے اکبر کو دو مقاصد حاصل ہو سکتے تھے۔ یا تو اُس کی صلاحیت کی آزمائش ہو گی یا پھر اپنے ہی فعل سے اس کا خاتمہ ہو گا۔ یعقوب سوداگر کے لباس میں اپنے مشن کیلئے روانہ ہوا اور راجہ نیل کنٹھ بندیلا کے کیمپ میں داخل ہو گیا۔

جب راجہ کو اطلاع کی گئی کہ ایک جوہری اُسے اپنے بیش قیمتی لعل و جواہر دکھانا چاہتا ہے تو یعقوب کو راجہ کی قیام گاہ کے اندر جانے کی اجازت دی گئی۔ راجہ اُس وقت غسل کر رہا تھا۔ اُس وقت کمرے میں چند برہمنوں اور نوکروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ یعقوب نے راجہ کو پسپا کر دیا اور کہا ''میں یعقوب خان کشمیری ہوں اور میں تمہیں مغل بادشاہ کے دربار میں لے جانے آیا ہوں، اگر تم بغیر کسی چالاکی کے خود چلنے کیلئے راضی ہوئے تو ٹھیک ورنہ میں تمہارا سر قلم کر کے بادشاہ کے دربار میں پیش کروں گا۔'' راجہ کے پاس یعقوب کی

بات رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور وہ اس کے ساتھ اکبر کے دربار میں پہنچ گیا۔ بادشاہ نے راجہ کو قید کرنے کا حکم دیا۔ ۴۹ جس وقت سلطان یوسف شاہ نے اپنے بیٹے کو مغل بادشاہ کے دربار میں بھیجا تھا اُس نے اکبر کیلئے نہایت قیمتی تحفے بھیجے تھے۔ اکبر کو اُسی وقت پتہ چلا تھا کہ کشمیر کے بادشاہ کے پاس کافی دولت ہے۔ اُس دور کے تاریخ دان شوکا کے مطابق اکبر نے اُسی وقت کشمیر پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

شہنشاہیت:

ہندوستان میں داخل ہونے کے وقت سے ہی مغل عہدیدار جاگیروں اور لوگوں پر اپنا قبضہ جمانے کی پالیسی پر کاربند رہے۔ وہ تیمور اور چنگیز خان کا جانشین بابر تھا جس نے ہندوستان پر حملہ کر کے مغلیہ خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اکبر تیسرا مغل بادشاہ تھا جو دلی کے مشرقی و مغربی حصوں کی وسیع فتح کے بعد ایک شہنشاہ کی حیثیت سے اُبھر آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب راجستھان، دکن اور بنگال کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں نے اپنی خود مختاری کھو دی تھی اور مُغلیہ سلطنت میں مدغم ہوگئیں تھیں۔ اکبر چک خاندان جیسی کسی بھی خود مختار حکومت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے محمد یوسف شاہ کو شاہی تخت واپس دلانے میں مدد کی تھی اور اب وہی شخص اپنے نام کے سکے چھاپ کر اور اپنے آپ کو پادشاہ غازی لقب دے کر ایک خود مختار حکمران کے طور پر اُبھر رہا تھا۔ [۵۱]

شہزادہ یعقوب نے مغل دربار میں اپنے قیام کے دوران کشمیری حکومت اور حکمران کے تیئں اکبر کے عزائم کو پوری طرح سے بھانپ لیا تھا۔ وہ اپنے والد کو اکثر و بیشتر خطوط ارسال کر کے اُسے آنے والے ممکنہ خطرے کے بارے میں آگاہ کرتا رہتا تھا۔ مگر ہر بار خواجہ قاسم سلطان محمد یوسف شاہ کی، اِن تنبیہات کو نظر انداز کرنے کی گمراہ کُن رہنمائی کرتا تھا۔

اِسی دوران کابُل کے گورنر مرزا حکیم کے اچانک انتقال کی خبر مُغل دربار میں فتح پور سکری پہنچی۔ خطے میں ممکنہ افراتفری کے خطرات لاحق ہوگئے۔ شہنشاہ نے بذاتِ خود شاہی طاقتوں کے سربراہ کے طور پر وہاں جانے کا فیصلہ کیا تاکہ کابُل میں ان کی حکومت کا

دعویٰ کر سکیں۔ شاہی عہدیداروں میں دیگر لوگوں کے علاوہ شہزادہ یعقوب بھی شامل تھا۔ اکبر نے کابُل جاتے ہوئے ہر پڑاؤ پر یعقوب سے محمد یوسف شاہ کے تئیں یہ کہہ کر ناراضگی جتائی کہ کشمیر کا بادشاہ مغل شہنشاہ کے احسانات کا بدلہ چُکانے میں ناکام رہا۔ اس نے نوجوان شہزادے کو سمجھایا کہ وہ اپنے والد سے مغلیہ دربار میں بذاتِ خود پیش ہو کر اپنی فرمانبرداری کا ثبوت دینے کے لئے کہے۔ اکبر کی جانب سے کسی بھی امکانی انتقامی کاروائی سے خوف زدہ ہو کر شہزادہ یعقوب نے ہر پڑاؤ پر اپنے والد کے پیغامات بھیجے تاکہ اُسے حالات کی شدت کا اندازہ ہو جائے۔ تاہم ہر بار محمد یوسف شاہ نے اپنے فاسق وزیر خواجہ قاسم کی وجہ سے یعقوب کے پیغامات کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ شہزادہ یعقوب کو یقین ہو گیا کہ اُس کا والد خواجہ قاسم کی بُری محبت کے نتیجے میں حالات کی شدت کو نہیں سمجھ پایا ہے۔ جب اکبر کا کاروان بہلول پور پہنچا تو یعقوب نے اسے خود اپنے والد کو مطلع کرنے کیلئے کشمیر آنے کی اجازت طلب کی۔ تین دن اور تین رات انتھک سفر کرنے کے بعد وہ دارالخلافہ پہنچا اور اپنے والد کے سامنے پیش ہو گیا۔ اُس نے بادشاہ کو اپنی تشویش اور اکبر کے ارادوں سے آگاہ کیا۔ تاہم خواجہ قاسم نے ایک مرتبہ پھر یوسف شاہ کو گمراہ کُن مشورہ دیا۔

مغلوں کا مقصد:

1581ء میں کابُل میں لوٹنے کے بعد اکبر نے اپنے خاص ایلچی حکیم علی اور صالح عاقل کو سلطان یوسف شاہ کے پاس سخت پیغام کے ساتھ بھیجا کہ وہ مغل دربار میں بذاتِ خود پیش ہو جائے۔ پیغام یوں تھا:

''آپ یہ بات جان لو کہ جنابِ والا اِس بات سے نہایت ناخوش ہیں کہ آپ نے ہماری مدد کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ یہاں تک کہ آپ نے ہماری امداد کا بھی شکریہ ادا نہیں کیا جو ہم نے آپ کو آپ کی جلاوطنی کے دوران فراہم کی تھی۔ آپ کو جنابِ والا نے بذاتِ خود دربار میں پیش ہونے کیلئے طلب کیا تھا لیکن آپ نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا اور اس کے بجائے اپنے پاگل بیٹے کو بھیج دیا جو ذہنی طور پر نااہل ہونے کی وجہ سے کسی کام کا نہیں

تھا۔ اگر آپ نے اِس دفعہ بھی کوئی بہانہ بنایا تو شاہی غیض وغضب کیلئے تیار رہنا جو خُدا کے غیض وغضب کے مترادف ہے۔'' [۵۲]

کشمیری سلطان نے مغل شہنشاہ کے فرمان کو چوم کر نہایت احترام اور شُکرانے کا مظاہرہ کیا۔ تاہم وہ دِل ہی دِل میں اکبر سے شدید خوفزدہ تھا۔ اُس نے اپنے وزراء اور کشمیری اُمراء کی میٹنگ طلب کی اور مغل شہنشاہ کے عزائم کے تئیں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس نے بذاتِ خود فتح پور سکری جا کر اکبر کے سامنے پیش ہونے کی رائے ظاہر کی۔ اُسے یقین تھا کہ مغل بادشاہ اُسے معاف کرے گا۔ لیکن کشمیری امراء میں سے کسی نے بھی اِس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ گویا کہ اکبر کے ایلچی خالی ہاتھ دربار واپس لوٹ گئے۔ بادشاہ نے اپنے مشیروں کے ساتھ موجودہ صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیا۔ اُن میں سے ہر ایک کی پختہ رائے یہ تھی کہ مغل شہنشاہ کشمیر پر آج یا کل اپنا غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور وہ ایک موقعے کی تلاش میں تھا۔ یہ بات بھی عیاں تھی کہ اکبر دھونس دباؤ کی حکمتِ عملی اپنا رہا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اُس نے دھمکیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

سلطان محمد یوسف شاہ کو مغل شہنشاہوں کی طاقت کا بخوبی اندازہ تھا جو اپنی سلطنت کو وسعت دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا وہ خطّے میں کسی بھی خود مختار مملکت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اکبر کی جانب سے پیغامات اور انتباہ موصول کرنے کے بعد سلطان اپنے بیٹے، ایلچی اور تحائف اکبر کیلئے بھیجا کرتا تھا۔ تاہم ہر بار اکبر یوسف شاہ کو خود حاضری دینے کی فرمائش کرتا تھا۔ اِس دفعہ سلطان نے اپنے مشیروں سے صلاح لی۔ اُن سب نے اِس خدشہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ اکبر سلطان محمد یوسف کو نقصان پہنچانے کیلئے موقعے کی تلاش میں ہے، وہاں نہ جانے کی صلاح دی۔ اُنہوں نے اِس کے برعکس دفاعی تیاریاں کرنے کا مشورہ دیا۔ [۵۳] سلطان نے ولی عہد کو اکبر کے پاس پہلے ہی بھیج دیا تھا اور اب اُس نے اپنی چہیتی بیوی ملکہ حبہ خاتون سے ہوئے سب سے عزیز فرزند شہزادہ حیدر کو فتح پور سکری کیلئے روانہ کیا۔ اس دفعہ اُس نے انتہائی بیش بہا تحائف مغل شہنشاہ کے لئے بھیج دیئے۔ [۵۴]

دعویٰ کر سکیں۔ شاہی عہدیداروں میں دیگر لوگوں کے علاوہ شہزادہ یعقوب بھی شامل تھا۔ اکبر نے کابُل جاتے ہوئے ہر پڑاؤ پر یعقوب سے محمد یوسف شاہ کے تئیں یہ کہہ کر ناراضگی جتائی کہ کشمیر کا بادشاہ مغل شہنشاہ کے احسانات کا بدلہ چُکانے میں ناکام رہا۔ اس نے نوجوان شہزادے کو سمجھایا کہ وہ اپنے والد سے مغلیہ دربار میں بذاتِ خود پیش ہو کر اپنی فرمانبرداری کا ثبوت دینے کے لئے کہے۔ اکبر کی جانب سے کسی بھی امکانی انتقامی کارروائی سے خوف زدہ ہو کر شہزادہ یعقوب نے ہر پڑاؤ پر اپنے والد کے پیغامات بھیجے تاکہ اُسے حالات کی شدت کا اندازہ ہو جائے۔ تاہم ہر بار محمد یوسف شاہ نے اپنے فاسق وزیر خواجہ قاسم کی وجہ سے یعقوب کے پیغامات کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ شہزادہ یعقوب کو یقین ہو گیا کہ اُس کا والد خواجہ قاسم کی بُری محبت کے نتیجے میں حالات کی شدت کو نہیں سمجھ پایا ہے۔ جب اکبر کا کاروان بہلول پور پہنچا تو یعقوب نے اسے خود اپنے والد کو مطلع کرنے کیلئے کشمیر آنے کی اجازت طلب کی۔ تین دِن اور تین رات انتھک سفر کرنے کے بعد وہ دارالخلافہ پہنچا اور اپنے والد کے سامنے پیش ہو گیا۔ اُس نے بادشاہ کو اپنی تشویش اور اکبر کے ارادوں سے آگاہ کیا۔ تاہم خواجہ قاسم نے ایک مرتبہ پھر یوسف شاہ کو گمراہ کُن مشورہ دیا۔

مغلوں کا مقصد:

1581ء میں کابُل میں لوٹنے کے بعد اکبر نے اپنے خاص ایلچی حکیم علی اور صالح عاقل کو سلطان یوسف شاہ کے پاس سخت پیغام کے ساتھ بھیجا کہ وہ مغل دربار میں بذاتِ خود پیش ہو جائے۔ پیغام یوں تھا:

”آپ یہ بات جان لو کہ جنابِ والا اِس بات سے نہایت ناخوش ہیں کہ آپ نے ہماری مدد کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ یہاں تک کہ آپ نے ہماری امداد کا بھی شکریہ ادا نہیں کیا جو ہم نے آپ کو آپ کی جلاوطنی کے دوران فراہم کی تھی۔ آپ کو جنابِ والا نے بذاتِ خود دربار میں پیش ہونے کیلئے طلب کیا تھا لیکن آپ نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا اور اس کے بجائے اپنے پاگل بیٹے کو بھیج دیا جو ذہنی طور پر نااہل ہونے کی وجہ سے کسی کام کا نہیں

تھا۔ اگر آپ نے اِس دفعہ بھی کوئی بہانہ بنایا تو شاہی غیض وغضب کیلئے تیار رہنا جو خُدا کے غیض وغضب کے مترادف ہے۔"[۵۲]

کشمیری سلطان نے مغل شہنشاہ کے فرمان کو چوم کر نہایت احترام اور شُکرانے کا مظاہرہ کیا۔ تاہم وہ دِل ہی دِل میں اکبر سے شدید خوفزدہ تھا۔ اُس نے اپنے وزراء اور کشمیری اُمراء کی میٹنگ طلب کی اور مغل شہنشاہ کے عزائم کے تئیں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس نے بذاتِ خود فتح پور سکری جا کر اکبر کے سامنے پیش ہونے کی رائے ظاہر کی۔ اُسے یقین تھا کہ مغل بادشاہ اُسے معاف کرے گا۔ لیکن کشمیری امراء میں سے کسی نے بھی اِس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ گویا کہ اکبر کے ایلچی خالی ہاتھ دربار واپس لوٹ گئے۔ بادشاہ نے اپنے مشیروں کے ساتھ موجودہ صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیا۔ اُن میں سے ہر ایک کی پختہ رائے پر تھی کہ مغل شہنشاہ کشمیر پر آج یا کل اپنا غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور وہ ایک موقعے کی تلاش میں تھا۔ یہ بات بھی عیاں تھی کہ اکبر دھونس دباؤ کی حکمتِ عملی اپنا رہا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اُس نے دھمکیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

سلطان محمد یوسف شاہ کو مغل شہنشاہوں کی طاقت کا بخوبی اندازہ تھا جو اپنی سلطنت کو وسعت دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا وہ خطے میں کسی بھی خودمختار مملکت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اکبر کی جانب سے پیغامات اور انتباہ موصول کرنے کے بعد سلطان اپنے بیٹے، ایلچی اور تحائف اکبر کیلئے بھیجا کرتا تھا۔ تاہم ہر بار اکبر یوسف شاہ کو خود حاضری دینے کی فرمائش کرتا تھا۔ اِس دفعہ سلطان نے اپنے مشیروں سے صلاح لی۔ اُن سب نے اِس خدشہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ اکبر سلطان محمد یوسف کو نقصان پہنچانے کیلئے موقعے کی تلاش میں ہے، وہاں نہ جانے کی صلاح دی۔ اُنہوں نے اِس کے برعکس دفاعی تیاریاں کرنے کا مشورہ دیا۔[۵۳] سلطان نے ولی عہد کو اکبر کے پاس پہلے ہی بھیج دیا تھا اور اب اُس نے اپنی چہیتی بیوی ملکہ حبہ خاتون سے ہوئے سب سے عزیز فرزند شہزادہ حیدر کو فتح پور سکری کیلئے روانہ کیا۔ اس دفعہ اُس نے انتہائی بیش بہا تحائف مغل شہنشاہ کے لئے بھیج دیئے۔[۵۴]

مُغلوں کا جارحانہ حملہ (1585ء):

کشمیر میں مغل ایلچیوں کی مسلسل آمدورفت اور سلطان کیلئے دھمکیوں اور انتباہات سے پُر پیغامات سے یہاں کے عوام اور اُمراء میں تشویش پیدا ہوگئی۔ اس ہلچل نے اُن لوگوں میں تلاطم پیدا کردیا جو نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے مُلک پر غیروں کی دعویٰ گیری ہو۔ بادشاہ تذبذب کی حالت میں اُلجھا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کے کونسلروں نے صلاح دی کہ وہ کشمیر کو مغلوں کی جارحیت سے محفوظ رکھنے کے لئے موثر اقدامات کرے۔ جب اکبر کو کشمیر کی افراتفری کے بارے میں اطلاع ملی تو اس نے کشمیر پر چڑھائی کا حکم دیا۔

دسمبر 1585ء میں جنگی سازوسامان سے لیس پچاس ہزار گھڑسواروں پر مشتمل مغلوں کی فوج نے بھگوان داس ولد راجہ مان سنگھ اور شاہ رُخ مرزا کی قیادت میں اٹوک سے کشمیر کی جانب پیش قدمی شروع کی۔ ۵۵ مغلیہ تاریخ دانوں کے مطابق شیخ یعقوب صرفی اور حیدر چک نے اِس حملے کے دوران مغل فوجوں کی رہنمائی کی۔ ۵۶ جب مغلوں کی پیش قدمی کی خبر دربار میں پہنچی تو شہزادہ یعقوب اور تمام کشمیری اُمراء نے سلطان یوسف شاہ سے دفاع کے اقدامات کرنے کی گزارش کی۔ سلطان نہایت ہچکچاہٹ کے ساتھ اُن کی بات پر راضی ہوگیا۔ اس کے بعد اُنہوں نے دُشمن کو شکست دینے کا منصوبہ بنا کر احتیاطی طور پر محفوظ مقامات کی طرف جانے کیلئے کہا۔ بادشاہ قیادت کیلئے آگے نکلا، سپاہیوں کو منظم کیا گیا اور پیڑوں پر ٹانکے گئے جھنڈے خوبصورت نظارہ پیش کررہے تھے۔ ۵۷ بادشاہ نے محمد بٹ کو جیل سے رہا کرنے کا حکم دیا اور اُس پر شہر اور شاہی محل کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری ڈال دی گئی۔ عالم شیر خان کی معاونت حاصل کرنے کیلئے اُسے بھی رہا کیا گیا۔ ۵۸ بادشاہ نے بارہ ہزار گھڑسواروں اور تین ہزار پیدل سپاہیوں کے ہمراہ ہچکچاہٹ کے ساتھ حملہ آوروں کے خلاف پیش قدمی شروع کی۔ لیکن وہ دِلی طور پر مغلیہ فوجوں کا مقابلہ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ اُس نے وراہا کے استھان میں پناہ لی اور جنگل میں قیام کیا۔ اُس نے اپنے وزراء سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"آپ کو لڑنا نہیں چاہیے۔ ہم جلال الدین کی شفقت میں پناہ لے لیں گے اور اُنہیں خدمت کی پیشکش کریں گے۔ فریقین میں سے کمزور کے پاس طاقتور کو پسپا کرنے کی قوت کہاں سے آئے گی؟۔ طوفان میں پہاڑ کو اڑانے کی طاقت نہیں ہے۔"

جب وزراء نے سلطان کی تقریر سُنی اُنہوں نے جواباً کہا:

"آپ ایسا کیوں سوچتے ہو؟ ایک انسان کبھی بھی اپنے مذہبی تقاضے پورا نہیں کرتا کیونکہ وہ اپنے مذہبی رہنما کی اچھی صلاح کی اطاعت نہیں کرتا ہے۔ اِسی طرح ایک بیمار جب طبیب کی نصیحت کو نظر انداز کرتا ہے تو وہ کبھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ ایک بادشاہ جو اپنے وزراء کی صلاح کو نظر انداز کرتا ہے کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔"

اس کے بعد وزراء حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ حسن ملک اور عالم شیر ماگرے کو کاروان کے آگے شمس الدین اور یوسف چک کو دائیں جانب اور سید عبدالمعالی اور حسین خان کو بائیں جانب تعینات کیا گیا۔ ولی عہد یعقوب، لوہر قریشی، بابا طالب اِصفہانی اور حسن بٹ کو مرکزی پوزیشن تفویض کی گئی۔ گویا کہ کشمیری آرمی وادیٔ وِتستا میں بارہمولہ کے نزدیک پُرانی سرحد کی جانب پیش قدمی کرنے لگی۔[61]

مغلوں نے کشمیر پر حملہ کرنے کیلئے شوپیاں روٹ کے بجائے پکھلی روٹ کا انتخاب کیا تھا۔ کشمیریوں کو اُس سمت سے حملے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ مغلیہ فوجیں وادیٔ وِتستا میں بُلیسا کے پہاڑی درّے تک کسی مشکل کے بغیر پہنچ گئیں۔ زمانۂ قدیم سے بولیاسا کا یا موجودہ بولیسا کشمیر کی سرحد مانی جاتی تھی۔ اور اسا سے نا اُمید لوٹنے کے بعد کشمیری فوجیں بولیاسا کا پہنچ گئی تھی۔ جہاں ایک فوجی بندرگاہ اُن کے اپنے علاقے کی سرحد پر قائم تھی۔[62]

چنانچہ جب مغل بولیسا کی سرحدی چوکی کے نزدیک ورنگا کے دلدل والے علاقے میں پہنچ گئے، اُنہیں کشمیری آرمی کے پیشگی دستے کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں دونوں اطراف کے بہادر

جنگجوؤں نے شجاعت کے ساتھ لڑائی لڑی۔ چونکہ موسمِ سرما اختتام پذیر ہوا تھا اور موسلا دھار بارش کے نتیجے میں طغیانی آئی جس نے درنگا کی دلدل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دُشمن کو کشمیریوں کے ہاتھوں جان و مال سمیت کافی نقصان جھیلنا پڑا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ حیدر ملک کے مطابق وہ سردی اور غذائی قلت کی وجہ سے مارے گئے کیونکہ اُنہیں راشن نہیں پہنچ سکا تھا۔ سیلابی صورتِ حال دوسری وجہ تھی جس نے درنگا کے دلدل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور تیسری وجہ دونوں طرف سے کثیر اموات تھی۔[۶۳] تاہم ایک اور اہم عصر تاریخ دان نے صاف طور پر لکھا ہے کہ کشمیری سپاہیوں نے مغل فوجوں کے ساتھ پہلے ہی مقابلے میں ان کے کافی سپاہیوں کو ہلاک کر دیا اور اُن کے سر کشمیر کے بادشاہ کو پیش کیۓ گیۓ۔[۶۴]

مغل آرمی کے کمانڈر راجہ بھگوان داس نے کشمیر کے بادشاہ کو ایک خفیہ خط لکھا جس میں اُس نے اپنی شکست کا اعتراف کیا تھا۔ لیکن اُس نے بادشاہ کو مغلوں کی دوسری چڑھائی سے خبردار کیا جو ہزاروں سپاہیوں کے ساتھ مستقبل قریب میں کی جائے گی۔ سلطان محمد یوسف شاہ سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ اب اپنی جان کی خیر منائے کیونکہ اگلے حملے میں اُس کی موت طے تھی۔[۶۵]

یہ خط موصول ہونے کے بعد بادشاہ نے اپنے وزیر خواجہ قاسم کے ساتھ صلاح مشورہ کیا جس نے بادشاہ کو صلاح دی کہ اِس مایوس کُن صورتِ حال میں مصالحت کا راستہ چُننا ہی بہتر ہے۔ اُس نے بادشاہ کو رازدارانہ طور پر یہ بھی کہا کہ مغل طاقتوں کا مسلسل مقابلہ کرنا ممکن نہیں لہٰذا راجہ بھگوان داس کے ساتھ بات چیت کا آغاز کرنے میں ہی عقلمندی ہے۔[۶۶] دریں اثناء بادشاہ نے اپنے وزراء کو طلب کیا اور اُن سے کہا:

> "اِندرا کی حکومت صرف مشرق میں ہے، یاما کی شمال میں، آبی دیوتا کی مغرب میں اور سونے کے دیوتا کی جنوب میں۔ جہاں یہ صرف ایک ایک دِشا میں حکومت کرتے ہیں وہیں بادشاہ جلال الدین چاروں اطراف کا حاکم ہے۔ اپنے خدشات کو دور کرو اور میری بات مان لو۔

میں جلال الدین کے رحم دِل قدموں کے نیچے پناہ لوں گا۔ میں شہنشاہ
کے خلاف دُشمنانہ رویہ کیسے اپنا سکتا ہوں؟ میں اس کی خدمت کروں گا
اور میرے مُلک میں خوش حال ہوگی۔ 67

اپنے وزیر خواجہ قاسم کے ساتھ خفیہ بحث ومباحثے کے دوران سلطان کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ مغل شہنشاہ تک پہنچنے کے لئے راجہ بھگوان داس کے اثرورسوخ کو استعمال کرسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے خواجہ قاسم کو راجہ بھگوان سے ملنے اور اس کے ساتھ ایک معاہدہ کرنے کی اجازت دی۔ بہر حال یہ طے کیا گیا کہ بادشاہ سیاسی عہد وپیماں کے بعد راجہ سے خفیہ طور پر ملے گا۔

راجہ بھگوان داس نے خواجہ قاسم کا نہایت خیر مقدم اور استقبال کیا۔ وہ کشمیری فوجوں کو ہرانے میں ناکام رہا تھا اور اب اُسے کشمیر کے بادشاہ سے روایتی فرمانبرداری حاصل کرنے کے اُمید تھی تاکہ وہ اکبر بادشاہ کو مطمئن کرسکتا۔ اپنے مقصد کو کامیاب ہوتے دیکھ کر اُس نے خواجہ کی طرف سے رکھے گئے تمام شرائط منظور کیے۔ چنانچہ فریقین نے معاہدے پر دستخط کیے جو سلطان یوسف شاہ کو پیش کیا گیا اور اُسے صلاح دی گئی کہ وہ بغیر کسی تاخیر کے راجہ بھگوان داس کے ساتھ روانہ ہو جائے۔ اُسے اپنے بیٹوں یا وزراء سے مشورہ نہ لینے کے لئے متنبہ کیا گیا تھا۔ صورتِ حال کو بھانپتے ہوئے چند اُمراء بادشاہ سے ملاقی ہوئے اور اس نے جلد بازی میں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پرہیز کیا۔ لیکن سلطان نے جلال الدین اکبر کی قوت کی تفاصیل دیتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا:

"شہنشاہ سورج کی عبادت کرتا ہے جو سچا اور نمایاں دیوتا ہے۔
اسی سورج کے تئیں عقیدت کی وجہ سے اس کی مشکلات اُس سے دور
بھاگتی ہیں۔ سب سے عقلمند شہنشاہ جلال الدین نے سوچا کہ مختلف
ویدوں کے درمیان تفاوت ہے، عظیم دیوتاؤں کی سلطنت پر ایک بار
آشورا نے حملہ کیا تھا اور گندھار و سرداروں کے غرور کو بھی عاجز ہونا پڑا

تھا۔ اِندرا اور دیگر دیوتا خوفزدہ ہو گئے تھے۔ گویا کہ برہما، ویشنو اور شِوا نے ہاتھ جوڑ کر سورج کی طرف رجوع کیا۔ شہنشاہ اسی لئے سورج کی جانب جھکتا ہے جو ایک عیاں دیوتا ہے۔ میری فوج بادشاہ اکاورا کی فوج کے ساتھ کیسے نپٹ سکتی ہے؟ یہ کتنی بے کار بات ہے کہ زمین میں گھُس آنے والی سمندری لہروں کو غلہ صاف کرنے والے پنکھے کی مدد سے واپس دھکیلنے کی کوشش کی جائے؟ سورج جو کہ ایک عیاں دیوتا ہے کو کس سے ضرر پہنچ سکتا ہے۔ کیا الّو کو چاہئیے کہ وہ اُسے شرمندہ کرے۔"[۶۹]

خفیہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے سلطان محمد یوسف شاہ اپنے شاہی یکہ سے باہر آ گیا تا کہ شاہی فوج کے پیشگی دستوں کا معائنہ کر سکے۔ اُسے بلیسا کے مقام پر اپنی فوجوں نے گارڈ آف آنر پیش کیا۔ میر بخشی نے اُسے جانکاری دی کہ پندرہ ہزار گھُڑ سواروں، پچیس ہزار پیدل فوج اور سات ہزار بندوقچیوں پر مشتمل کشمیری فوج حکومت کا دفاع کرنے کیلئے تیار ہے۔ اُن کی قیادت کرنے کے بعد وہ تین یا چار ذاتی محافظوں کے ہمراہ چُپ چاپ دُشمن کے کیمپ میں داخل ہو گیا۔ یہ تباہ کُن واقعہ 14 فروری 1586ء کو پیش آیا۔ اُس نے اپنے وزراء، کمانڈروں اور بیٹوں سے اِس سلسلے میں ایک عمدہ صلاح مانگے بنا ہی نہایت جلد بازی میں یہ قدم اٹھایا۔[۷۰] پر جیا بھاتا اور شوکا کے مطابق سلطان محمد یوسف شاہ نے آٹھ برس تک حکومت سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہی کیا جسے وہ کہتا تھا کہ جلال الدین اکبر بادشاہ کے قدموں میں پناہ لی جائے۔[۷۱] دوسرے دِن تمام وزراء، اُمراء اور کمانڈروں نے ولی عہد یعقوب کو اس کے والد کی جگہ پر کشمیر کا بادشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ اس فیصلے کو شمس چک، عالم شیر اور شمس دونی کی حمایت حاصل تھی۔ اُنہوں نے یہ فیصلہ اپنے ملک کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لئے لیا تھا۔[۷۲]

قیداورانتقال:

سلطان محمد یوسف شاہ کو مغل بادشاہ اکبر کے سامنے 28 مارچ 1586ء کو پیش کیا گیا۔ معاہدے کی سراسر عدولی کر کے اکبر نے سلطان یوسف شاہ کو قید کروایا اور اسے لاہور میں رام داس کچھواہا کی تحویل میں رکھا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اُسے راج ٹوڈار کی تحویل میں سیاسی قیدی کے طور پر رکھا گیا۔ یہ اُس معاہدے کی سراسر عدولی تھی جس میں یہ طے پایا گیا تھا کہ سلطان یوسف شاہ کو اکبر کے دربار میں حاضری دینے کے بعد اپنے مُلک واپس جانے دیا جائے گا۔ کشمیر کی تواریخی کتابوں میں درج ہے کہ اس معاہدے کی وعدہ خلافی نے راجہ بھگوان داس کو اتنا متاثر کیا کہ اُس نے بحیثیتِ راجپوت اپنی عزت رکھنے کیلئے خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ تاہم اُسے عبدالرحیم نے بچالیا۔ سلطان یوسف شاہ کو ٹوڈرمل کی نگرانی میں مقید رکھا گیا۔ کشمیر کو مکمل طور پر ماتحت رکھا گیا اور سلطان کے فرزند یعقوب جو آخری چک بادشاہ تھا، کو بھی قیدی بنا کر دِلی لے جایا گیا۔ اُسے اڑھائی سال کی مدت کے بعد راجہ مان سنگھ کی گُوارش پر رہا کیا گیا۔ اُسے راجا مان سنگھ کے پاس بھیجا گیا اور بہار میں اُسے ایک جاگیر بھی دلائی گئی۔ اُسے پانچ ہزار گھوڑوں کے منصب اور اکیس سو سے پچیس سو روپے تک فی ماہ کے حساب سے تنخواہ سے نوازا گیا۔

یعقوب نے راجہ مان سنگھ کے ہمراہ بنگال میں بھی خدمات انجام دیں اور اُڑیسہ کو فتح کرنے میں مغلوں کی جانب سے کارکردگی دکھائی۔ اُڑیسہ کی فتح کے بعد سلطان محمد یوسف شاہ جاگیاں ناتھ پور میں علیل ہوگیا اور چھ ماہ کی علالت کے بعد بدھوار 14 ذی الحج کو انتقال کر گیا۔ اُسے بہار میں سید ابوالمالی ولد سید مبارک نے دفن کیا۔ اس طرح کشمیر کے ایک نہایت مہذب بادشاہ کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔

قدروقیمت:

سلطان محمد یوسف شاہ کشمیر کے عظیم حکمرانوں میں سے ایک تھا۔ وہ ہمیشہ باقاعدگی کے ساتھ نماز قائم کرتے تھے اور امامت کے فرائض بھی خود ہی انجام دیتے۔ ہر نماز

کے بعد قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے فارسی، کشمیری اور سنسکرت زبانوں میں اشعار کہنے کے اہل تھے۔ گرامر پر عبور حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش خط لکھنے میں ماہر تھے۔ خوش نویسی کی مہارت حاصل ہونے کی وجہ سے فارسی اور عربی کی مقتدر کتابوں کے اقوالِ زریں نقش کرتے۔ موسیقی کے ساتھ ان کا معاشقہ تھا اور خود نئی طرزیں وجود میں لاتے۔ حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کے اعلیٰ درجہ کے مُرید بابا داؤدِ خاکیؒ نے 1580ء میں قصیدہ غوثیہ یوسف شاہی کی تصنیف کی۔ جس کا انتساب اس طرح ہے:

"یہ میں وقت کے سلطان، بہادر پادشاہ، فراخ دل اور خوش نصیب، علم و عالم کے محبّ، مخلص اور ایماندار نصیر الدین محمد یوسف شاہ غازی کو نہایت تشکُر کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔"

بابا داؤدِ خاکیؒ سلطان محمد یوسف شاہ غازی کے بہتر اوصاف کی سراہنا 66 اشعار میں کرتے ہیں:

"یوسف شاہ ایک مشہور بادشاہ ہے جو شاہی تخت، مُلک اور دولت کا حقیقی دعویدار ہے۔ وہ ازلی طور پر صورت و سیرت کے اعتبار سے خوبصورت ہے۔ اُسے عظیم پیغمبرؐ اُن کے اہلِ خانہ اور ساتھیوں کے ساتھ محبت ہے۔ اِن اوصاف کی بنا پر وہ مذہب اسلام کا سچا پیروکار ہے۔ وہ علم کا متلاشی ہے اور علماء سے شریعہ اور احادیث سے متعلق استفسار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ امام کے طور پر بھی جماعت کی قیادت کرتا ہے اور بڑی اور چھوٹی سورتوں کی تلاوت کرتا ہے۔ وہ نظمیں اور اشعار تحریر کرتا ہے۔ اُسے تصوف میں کافی دلچسپی ہے اور تصوف کے راز جاننا چاہتا ہے۔ اُسے لغت نویسی اور دیگر کلاکاری کی مکمل جانکاری ہے۔ مثلاً خوش نویسی اور موسیقی۔ جس میں اس نے کئی دُھنیں جیسے حُسینی اور غزل ایجاد کیں۔ قاضی اور مُفتی اس کی انصاف پسندی کا اعتراف

کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنی رعایا پر کبھی بھی ظلم برداشت نہیں کرتا ہے۔ حتیٰ کہ شہری اور دیہاتی تمام لوگ اس کی رحم دلی اور ہمدردی کی داد دیتے ہیں۔ وہ اپنی رعایا کو تعلیم دِلانے کیلئے بے قرار ہے۔ جس کے لئے اُس نے شہروں اور دیہاتوں میں سکول کھلوائے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ اس کے متحرک اور فعال طریقۂ کار کو دیکھ کر حیران و پرشیان ہیں۔"[۴۷]

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ مغلوں کی کشمیر پر فتح حاصل کرنے کے بعد تاریخیں مغل بادشاہ کے فرمان کے مطابق لکھی گئیں۔ چنانچہ ان کتابوں سے معقول تاریخی واقعات اور کشمیری بادشاہوں اور ملکاؤں کی حقیقی شبیہہ سامنے نہیں آئی۔ اس کے برعکس مغلوں کے اِن ملازموں نے اپنے آقا کی خوشنودی کیلئے تاریخ کو مسخ کر دیا۔ اس طرح کے لوگوں میں ملک حیدر چاڈورہ بھی شامل ہے جسے مغل بادشاہ جہانگیر نے رئیس الملوک کے خطاب سے نوازا۔

۲۔ ابوالفضل، آئینِ اکبری، ترجمہ بلوچمن، کولکتہ ۱۹۳۹ء، جلد (۳) صفحہ ۴۶۵۔

۳۔ بہارستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۱۵، مغلیہ تاریخ دان نے اکبر کی جانب سے شاہی مہمان کو دو کنیزیں پیش کئے جانے کے واقعے کا ذکر نہیں کیا ہے۔

۴۔ حیدر ملک، تاریخِ کشمیر۔

۵۔ بہارِستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۱۵۔

۶۔ بہارستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۱۵۔

۷۔ حیدر ملک تاریخِ کشمیر۔

۸۔ بہارستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۱۶۔

۹۔ پرجیا بھاتا اور شوکا، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۷۹ء، صفحہ ۳۹۷۔

۱۰۔ بہارستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ............۔

۱۱۔ بہارستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۱۷۔

۱۲۔ شوکا، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۷۹ء، صفحہ ۳۹۸۔

۱۳۔ بہارستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۱۷۔

۱۴۔ شوکا، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۷۹ء، صفحہ ۳۹۸۔

۱۵۔ بہارِستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۱۹۔

۱۶۔ شوکا، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۷۹ء، صفحہ ۳۹۸۔

۱۷۔ بہارِستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۱۔

۱۸۔ شوکا، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۷۹ء، صفحہ ۳۹۷۔شوکا کے مطابق حیدر چک نے ہی دیگر کشمیری اُمراء کی مدد سے لوہر چک کو کشمیر کے شاہی تخت پر بٹھایا تھا۔

۱۹۔ بہارِستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۱۔

۲۰۔ پراجیہ بھٹ اور شُک، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۷۹ء، صفحہ ۳۹۷۔

۲۱۔ بادشاہ، شریعتِ محمدیؐ یا اسلامی قوانین کی روشنی میں باغیوں پر فردِ جرم عائد کرتا ہے۔

۲۲۔ بہارِستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۱۔

۲۳۔ قصیدۂ غسالیہ یوسف شاہی (فارسی) لائبریریز اینڈ ریسرچ اور محکمہ اشاعت، جموں وکشمیر، سرینگر ۲۰۰۲ء، صفحہ ۱۱۔

صفحہ ۱۲۳۔ بہارِستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء،

۲۴ بہارِستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۳۔

۲۵ پراجیہ بھٹ اور شک، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۷۹ء، صفحہ ۳۹۸۔

۲۶ ۱۵۷۲ء میں کشتواڑ کے راجہ نے سلطان یوسف کے بیٹے یعقوب کو فرماں برداری کے نذرانہ کے طور پر اپنی بیٹی دے دی جو ابھی تخت نشین نہیں ہوا تھا۔

۲۷ ملا محمد حسین عرف حُسام الدین کی گُلستان کشمیر، فارسی مسودہ، (1147) سیّد مقبول حسین اور سید انیس کاظمی کے مجموعے کلچرل اکیڈیمی کے شیرازہ (کشمیری) میں، جلد ۱۹، نمبر ۴، 1984 اور شیرازہ (کشمیری) فروری 1997۔

''766 ہجری میں سید فخر الدین اور اُن کے برادر سید فرید الدین، میر سید حیدر الکبروی کے ہمراہ واردِ کشمیر ہوئے۔ سید فخر الدین نیوہ میں دفن ہیں اور سید فرید الدین سرینگر کے جمالٹہ علاقے میں دفن ہیں۔''

۲۸ تاریخِ کشمیر، عبدالوہاب شائق، فتوحاتِ کُبروی (فارسی خاکہ) صفحہ 706۔

۲۹ ملکہ حبہ خاتون نے کشمیری میں اشعار تصنیف کئے تھے، حوالہ حبہ خاتون (اُردو) غلام رسول بٹ، سرینگر 1999، صفحہ 160۔

۳۰ عبدالوہاب شائق اپنے شاہنامہ کشمیر میں رقمطراز ہیں:

''سلطان محمد یوسف شاہ کے پاس شرۂ آفاق گلوکار جیبہ خاتون کی صورت میں تھی جس نے عارفہ کا لقب حاصل کیا تھا۔ وہ میٹھی میٹھی دُھنیں ترتیب دیتی اور بادشاہ اس کی پُرسوز شاعری سے لطف اندوز ہوتے تھے۔''

۳۱ بشر بشیر حبہ خاتون پر ایک مقالہ، کلچرل اکیڈیمی کے کشمیری شیرازہ میں، جلد ۱۹، نمبر ۶۔

۳۲ فِدا حسنین، کشمیر سرینگر، 2007، صفحہ 212۔

۳۳ پراجیہ بھٹ اور شک، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ 1879ء، صفحہ

399تا398۔

۳۴ حیدر ملک چاڈورہ، تاریخِ کشمیر، ترجمہ رضیہ بانو، دلی ۱۹۹۱ء، صفحہ ۸۲۔۸۳۔
۳۵ شُک، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۷۵ء، صفحہ ۳۹۸۔
۳۶ بہارستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۳۔
۳۷ تبت، جس کے حکمران نے فوجی مدد کی، مطلب بلتستان کے چھوٹے تبت سے ہے جس کی راجدھانی سکردو ہے۔ چونکہ خطے میں حضرت میر شمس الدین عراقی کے پیروکاروں کا غلبہ تھا لہٰذا کشمیری اُمراء کو معاونت فراہم کرنا قدرتی بات تھی، جو غازی میر (1595-1565) بلتستان کے بادشاہ کے پاس مدد مانگنے آئے تھے۔"
۳۸ بہارستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۳۔
۳۹ پراجیہ بھٹ اور شُک، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۹۵ء، صفحہ ۳۹۹۔
۴۰ بہارستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۴۔
۴۱ کنال کشتواڑ میں ایک گاؤں ہے جہاں سے باگو اور برادِمل درے کی جانب راستہ جاتا ہے (بیٹس گیزیٹر آف کشمیر)
۴۲ ڈکسم وڈون وادی کی جانب سے کشتواڑ کے راستے میں اوپر ایک پڑاؤ ہے۔
۴۳ پراجیہ بھٹ اور شُک، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۷۹ء، صفحہ ۳۹۸۔
۴۴ بہارستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۵۔
۴۵ نظام الدین، طبقاتِ اکبری، ترجمہ کولکتہ، 29-1927، جلد ۳، صفحہ ۷۵۹۔
۴۶ حیدر ملک، تاریخ کشمیر، ترجمہ رضیہ بانو، دِلی، ۱۹۹۱ء، صفحہ ۸۲۔
۴۷ نظام الدین، طبقاتِ اکبری، ترجمہ کولکتہ، 29-1927، جلد ۳، صفحہ ۷۵۹۔
۴۸ بہارستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۶۔
۴۹ حیدر ملک چاڈورہ، تاریخِ کشمیر، ترجمہ رضیہ بانو، دلی ۱۹۹۱ء، صفحہ ۸۴۔
۵۰ پراجیہ بھٹ اور شُک، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۹۸ء، صفحہ

۳۹۹۔

۵۱ اکبر کے مغلیہ سکے، جہانگیر اور شاہِ جہاں کے پاس بھی لقب تھے، پادشاہ اور غازی۔

۵۲ حیدر ملک چاڈورہ، تاریخِ کشمیر، ترجمہ رضیہ بانو، دلی ۱۹۹۱ء، صفحہ ۸۵۔

۵۳ بہارِستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۸۵۔

۵۴ حیدر ملک چاڈورہ، تاریخِ کشمیر، ترجمہ رضیہ بانو، دلی ۱۹۹۱ء، صفحہ ۸۴۔

۵۵ جہاں شوکا کی راج ترنگنی اور بہارستانِ شاہی بھگوان داس اور شاہ رُخ مرزا کو حملہ آور فوج کے کمانڈروں کے طور ظاہر کرتی ہیں وہیں دیگر مغلیہ تاریخ دانوں نے ۲۰ دیگر کمانڈروں کا بھی ذکر کیا ہے۔

۵۶ کشمیر کے ہم عصر تواریخی رسائل، شوکا کی راج ترنگنی اور بہارستانِ شاہی میں اِس بات کا کوئی تذکرہ نہیں کہ شیخ یعقوب صرفی اور حیدر چک نے حملے کے وقت مغلوں کے رہنماؤں کے طور پر کام کیا۔

۵۷ پراجیہ بھٹ اور شُک، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۹۵ء، صفحہ ۳۹۹۔

۵۸ بہارِستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۷۔

۵۹ پراجیہ بھٹ اور شُک، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۹۵ء، صفحہ ۴۰۰۔

۶۰ پراجیہ بھٹ اور شُک، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۹۵ء، صفحہ ۴۰۰۔

۶۱ حیدر ملک چاڈورہ، تاریخِ کشمیر، ترجمہ رضیہ بانو، دلی ۱۹۹۱ء، صفحہ ۸۵۔

۶۲ کلہن، راج ترنگنی، ترجمہ اوریل سٹین، جلد ۲، لندن ۱۹۰۰ء، صفحہ ۴۰۲۔

۶۳ حیدر ملک چاڈورہ، تاریخِ کشمیر، ترجمہ رضیہ بانو، دلی ۱۹۹۱ء، صفحہ ۸۵۔

۶۴ بہارِستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۸۔

۶۵ حیدر ملک چاڈورہ، تاریخِ کشمیر، ترجمہ رضیہ بانو، دلی ۱۹۹۱ء، صفحہ ۸۵۔

۶۶ بہارِستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۸۔

۶۷ پراجیہ بھٹ اور شک، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۹۵ء، صفحہ ۴۰۰
تا ۴۰۱۔

۶۸ بہارِستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۸۔

۶۹ شوکا، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۹۵ء، صفحہ ۴۰۲۔

۷۰ بہارِستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۸۔

۷۱ پراجیہ بھٹ اور شک، راج ترنگنی، ترجمہ جوگیش چندر دتا، کولکتہ ۱۸۹۵ء، صفحہ ۴۰۲۔

۷۲ بہارِستانِ شاہی، ترجمہ غلام محمد بٹ، سرینگر ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۲۸۔

۷۳ سلطان علی شاہ اور شہزادہ یوسف شاہ اپنے مُرشد بابا ہردریشی کے پاس حاضری دینے جاتے تھے: بابا داوٗدِ خاکیؒ قصیدۂ لامیہ، غلام رسول بٹ نے قصیدۂ غوثیہ میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ صفحہ ۱۲ تا ۱۳۔

۷۴ بابا داوٗد خاکیؒ، قصیدۂ غسلیہ یوسف شاہی، مرتب کردہ غلام رسول بٹ، ریسرچ لائبریری، سرینگر، صفحہ ۱۱۔

☆ فِدا حسنین کشمیر کے جانے مانے پروفیسر ہیں۔ تاریخ اور ثقافت کی نسبت اُن کے کام کا انگریزی، روسی، اٹلی اور پرتگالی وغیرہ زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ اُنہیں ہندوستان، جاپان، سوئزرلینڈ، جرمنی اور میکسکو کی مختلف یونیورسٹیوں کی جانب سے ڈگریوں اور ایوارڈوں سے نوازا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اُنہیں جموں وکشمیر حکومت کی جانب سے ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا جاچکا ہے۔

☆☆☆

☆......غلام نبی آتش

لڈی شاہ۔۔۔۔

عوامی زندگی کا ترجمان فوک فنکار

''لڈی شاہ'' کثیر المعانی اصطلاح ہے۔عوامی فنکار، جو بیکِ وقت موسیقار لوک شاعراور ساز بجانے والا ہوتا ہے، لڈی شاہ کہلاتا ہے۔اُن اشعار کو بھی لڈی شاہ کہا جاتا ہے، جو یہ فوک فنکار، دہرہ بجا بجا کر قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں میں لوگوں کے آنگنوں اور کھیت کھلیانوں میں گاتا رہتا تھا۔دہرہ لوہے کی دو فٹ لمبی سلاخ کا کشمیری نام ہے، جس میں چھوٹے چھوٹے چھلے پڑے رہتے ہیں۔لڈی شاہ ان چھلوں کو خاص رفتار کے ساتھ ہلا ہلا کر دہرے سے چھن چھن کی آواز نکال کر ایسے طنزیہ اور مزاحیہ اشعار سنایا رہتا تھا، کہ سُننے والے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوجاتے تھے۔دہرے کی چھن چھن پر جن منظومات کے اشعار گائے جاتے تھے، وہ بعض اوقات لڈی شاہ خود تخلیق کرتا اور فنکار مزاحیہ تفریح کار کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔کسی زمانے میں اس کے خدوخال اور چال ڈال سے مزاح جھلکتا اور چھلکتا رہتا تھا۔اس کی پوشاک بھی اس کی خاص پہچان کی غماز تھی۔پاؤں میں پُولہ، کاندھوں پر سوتی چادر (جو اکثر میلی کچیلی ہوا کرتی ہے)، لمبی لمبی مونچھیں، لمبی داڑھی، سر پر پُرانی پگڑی، ایک ہاتھ میں دہرہ اور دوسرے ہاتھ میں بُقچی، جس میں مانگے (لوگوں سے حاصل کیا ہوا نذرانہ، جو عام طور پر دھان ہوتا تھا) بھر کر، لڈی شاہ کسی آنگن میں نمودار ہوجاتا، لوگ دہرے کی چھن چھن سنتے ہی جمع ہوجاتے۔بڑے بوڑھے، مرد عورتیں، جوان اور بچے

لڈی شاہ کے ارد گرد اُمڈ آتے۔ بچے کلکلیں کرتے، آنگن آنگن کھلیان کھلیان اُس کے پیچھے پیچھے دن بھر دوڑتے رہتے۔ ماضی قریب تک لڈی شاہ اکثر دیکھنے میں آتا تھا۔ موسمِ خزاں میں یہ لوک فنکار ہر گاؤں میں آنگنوں اور کھیت کھلیانوں میں لوگوں کے دِل بہلایا کرتا۔ لوگ اُسے دِل کھول کر مانگے، (جس کی صورت میں معاوضہ) دیا کرتے تھے۔ لیکن زمانہ بدل گیا، لوگوں کا مذاق بدل گیا، دل بہلائی کے جدید تر وسائل مہیا ہو گئے۔ لڈی شاہ بھی اپنی پوزِشن بحال نہ رکھ سکا۔ اب کھیت کھلیانوں میں شاذ و نادر ہی کسی دوُر علاقے میں لڈی شاہ نظر آتا ہے۔ اُس نے گھر گھر جا کر آزوقہ حاصل کرنے کی روایت توڑ دی اور روزگار کے دوسرے وسائل ڈھونڈ نکالے۔ البتہ اب لڈی شاہ کسی سرکاری تُمدنی تقریب میں کبھی کبھی خاص آیٹم کے طور پر شامل ہوتا ہے۔ سکولوں کی تمدنی تقریبات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی بعض اوقات لڈی شاہ سُننے اور دیکھنے کو ملتا ہے، لیکن راقم الحروف کے خیال میں یہ آیٹم لڈی شاہ کی باقیات ہی مانے جا سکتے ہیں، کیونکہ نئی نسل اُس کی اگلی شہرت اور مقبولیت سے بالکل ناواقف ہے اور شاید اس کا شاندار ماضی صرف لوک ادب کا حصّہ بن کر رہ گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ لڈی شاہ کشمیری شاعری کی کوئی مستقل صِنف نہیں ہے بلکہ یہ وہ کلام ہوتا ہے، جس میں سماج سدھار نظمیں، شہر آشوب، مزاحیہ اور طنزیہ کلام، مثنویاں، سیلاب نامے، بھونچال نامے، ارضی و سماوی آفات سے متعلق منظوم واقعات ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہماری ہر ایک مثنوی کو لڈی شاہ کہا جائے بلکہ صرف وہی منظومات، چاہے وہ مثنوی فارم میں ہی کیوں نہ ہوں، یہ عوامی فنکار دہرے پر استعمال کر سکتا ہے، جن میں طنز و مزاح کا عنصر زیادہ ہو، فنی رموز اور پختگی کا زیادہ خیال نہ ہو، دوسرے الفاظ میں وہ ہلکی پھُلکی شاعری کے زمرے میں آتی ہوں اور بعض اوقات تنگ بندی کی حدود میں داخل ہوتی ہوں۔ یہ ریت چلی ہے کہ جو منظومات لڈی شاہ کے دہرے پر چڑھ گئیں، اُن کو بھی ''لڈی شاہ'' کہا جاتا ہے، ورنہ یہ کوئی مستقل صنف نہیں۔

''لڈی شاہ'' اصطلاح کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں۔ اس کی اصل کے بارے میں آج

تک قیاس آرائیاں کی جاتی رہی ہیں۔ مرحوم نشاط انصاری نے لکھا ہے:

"کہا جاتا ہے کہ آج سے بہت عرصہ قبل سری نگر شہر میں "ستھرا" نام کا ایک قبیلہ رہا کرتا تھا۔ اس قبیلے کے مرد ہاتھ میں دو چھوٹی سوٹیاں اٹھا کر شہر کے کسی دوکاندار کے پاس جایا کرتے تھے۔ وہاں اُسے کوئی لوک گیت سُنا دیتے اور ان دو چھوٹی سوٹیوں سے ساز کا کام لیا کرتے تھے۔ گیت سُنانے کے بعد وہ دوکاندار سے نقدی یا جنس کی صورت میں کچھ مانگتے۔ اگر دوکاندار ستھرا کو اچھی طرح سے رضامند کرتا تو وہ دوسری دوکان پر جا کر یہی سوانگ رچاتا۔ اگر وہ دوکاندار ستھرا کو کچھ دینے سے انکاری ہوتا تو ستھرا اپنے سر سے پگڑی اُتار کر دوکاندار کے سامنے ہی اُسے آہستہ آہستہ پھاڑ دیتا تھا۔ یہاں تک کہ دوکاندار ستھرا کو اُس کی پگڑی کی پوری قیمت ادا کرنے کے علاوہ اور بھی کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ ستھرا قبیلے کے لوگ دوکانداروں سے نقدی یا جنس لڑ کر لیتے تھے۔ اس نسبت سے اُن کا نام بعد میں لڈی شاہ پڑا۔ چنانچہ ستھرا شاہی نام کا ایک چھوٹا سا محلہ آج بھی سری نگر کے نئے سیکریٹریٹ کی عمارت کے عقب میں واقع ہے۔"

(ہمارا ادب، لوک ادب نمبر، ص: ۲۱۵، ۷۷۔۱۹۷۶ء کلچرل اکاڈمی)

کاشر انسائکلو پیڈیا، جلد ۴ میں لڈی شاہ کی اصل کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ کھڑی بولی کا ایک لفظ ہے "لڑاک" جس کے معنی ہیں "لڑاکو"۔ قیاس کیا گیا ہے کہ شاید مذکورہ "لڑاک" لفظ رفتہ رفتہ صورت بدل کر "لڈی" بن گیا ہو۔ "ستھرا" لفظ کا ایک مطلب "فقیروں اور مانگنے والوں کی جماعت" ہے۔ کھڑی بولی کے "لاٹھی" لفظ کا اسم تصغیر "لٹھیا" ہے، جو ممکن ہے کہ بگڑ کر "لتھی" یا "لڈی" بن گیا ہو۔ "لڈی" لفظ کے ساتھ "شاہ" جُو جانے کے متعلق بھی قیاس بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں نے "ستھرا شاہی" محلے میں رہنے کی وجہ سے

"شاہ" لفظ اپنے "لڈی" نام کے ساتھ جوڑ دیا ہو۔"

(کاشُر انسائیکلو پیڈیا، جلد ۴۔ کلچرل اکاڈمی: ۲۰۰۲ء، ص: ۳۳۰، کشمیری سے ترجمہ)

یہاں اس بات کا ذکر شاید بے جا نہ ہوگا کہ بقول پروفیسر محی الدین حاجنی:

"سکھوں کے دورِ حکومت اور ابتدائی ڈوگرہ عہد میں شادی بیاہ کے موقعوں پر لوگوں کو سرکار کی اور ایک ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ یہ ٹیکس وصول کرنے کا کام "سُتھر اشاہ" نام کے ایک ظالم اور بے مُروّت کارندے کو تفویض کیا گیا تھا۔ لوگ بہت غریب تھے۔ پھر بھی اُنہیں ٹیکس ادا کرنے کے علاوہ "ستھر اشاہ" کو خوش اور راضی رکھنے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا۔ ٹیکس وصولنے کے بعد بھی اگر ٹیکس دہندہ "سُتھر ا شاہ" کی "خدمت" الگ سے نہ کر پاتا تو "ستھر اشاہ" دُلہن کو ڈولی میں بٹھانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ستھر اشاہ کی اس رزالت کی یادگار کے طور پر کشمیری زبان میں "لو گتھم سَہ سُتھر اشاہ؟" (تو کیا سُتھر اشاہ بن گیا؟" تلمیح وجود میں آیا ہے۔"

(مقالات: پروفیسر محی الدین حاجنی)۔

حقیقت یہ ہے کہ لڈی شاہ کا بنیادی کام لوگوں کو مزاحیہ اور ہجو یہ اشعار سُنا سُنا کر آزوقہ حاصل کرنا تھا۔ لیکن اُس کا کردار کشمیر کی عوامی زندگی پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ لوگ اُس کے اس پیشے کو معمولی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ان کے غم غلط کرنے والا ہمدرد تھا۔ خود اندر ہی اندر غمِ روزگار سے پریشان یہ شخص لوگوں کو ہنساتا پھرتا تھا۔ اُس کی بات چیت اور اداؤں سے بھی مزاح ٹپکتا تھا۔ وہ بیک وقت مداح بھی تھا، شاعر بھی، تُک بند بھی، نکتہ چین، ہزال اور حالات کا عکاس بھی۔ ہر نئی بات سے متاثر ہو کر، ہر کسی خاص واقعے کو دیکھ کر اور سُن کر اُس کی تصویر کشی کرنے میں ماہر تھا۔ سماج کا کوئی فرد اس کے طنز سے نہیں بچتا تھا، وہ ہنسی مذاق کی آڑ میں طنز کے تیر پھینکتا جاتا اور سننے والے عش عش کرتے۔ وہ حاکم، محکوم، امیر،

غریب، ظالم، مظلوم، ہرنئی چیز، دانا، نادان، ساس، بہو، خاوند، بیوی، بہن، بہنوئی، بھاوج، کوتوال، جج غرض ہر طبقے کے افراد پر طنز کے تیر پھینکتا رہتا۔ اس طرح استحصالی عناصر اور ظالم حاکموں کا کچا چٹھا پیش کرتا، لیکن کوئی اُس سے ناراض نہیں ہوتا۔ کوئی حاکم اُس کی سرزنش نہیں کرتا بلکہ سب اسے پسند کیا کرتے جو لڈی شاہ خود شعر موزون کر لیتے یا تُک بندی جانتے، وہ اپنا یہ ہنر اور اپنا پیشہ اپنی اولاد کی طرف منتقل کرتے جاتے تھے۔ قدرتی آفات خصوصاً سیلاب، بے وقت برف و باراں، وبا، زلزلے، آتش زنی، وغیرہ لڈی شاہ کے عام موضوع رہے ہیں۔ سماجی حالات پر اُس کی پوری نظر لگی رہتی، قحط ہو، کوئی لڑائی جھگڑا ہو، شادی بیاہ کے تنازعات ہوں، کسی نئے کپڑے کا چلن ہو، گھر جمائی کے مسائل ہوں، سماجی بدعات ہوں، کسی ظالم سرکاری کارندے کی من مانیاں ہوں، حکومت وقت کے خلاف شکایتیں ہوں، لڈی شاہ ان سب کو منظوم صورت میں دہرے کی چھن چھن کی رفتار پر گھر گھر، آنگن آنگن پہنچا دیتا تھا۔ لڈی شاہ اُن حالات کو نظر انداز نہیں کرتا جو عوام کی بھلائی کے لئے پیدا کئے گئے ہوں۔ سرکار کی طرف سے کوئی اچھا قدم اٹھایا جائے، عوامی بہبودی کا کوئی کام سرکار کے ذریعے عمل میں آئے یا کوئی فرد ایسا کام کرے، لڈی شاہ اُس کی سراہنا کرتا تھا اور ایسے موضوعات والے منظومات کو دہرے پر گاتے وقت ابتداء حمد باری تعالیٰ اور نعتِ نبیؐ سے کرتا تھا۔ عوامی زندگی میں رونما ہوئے تمام چھوٹے بڑے واقعات تحریری تواریخوں میں درج نہیں کئے جاتے۔ مورّخ انہیں معمولی سمجھ کر درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے لیکن یہی واقعات عام انسان کی اصل زندگی کے عکاس ہوتے ہیں۔ لوک ادب ان ہی واقعات کو سمیٹ لیتا ہے اور لوگ اجتماعی طور پر ان کو سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچا دیتے ہیں۔ لڈی شاہ چونکہ ایک فعال لوک کردار ہے، اُس کی منظومات، چاہے اُس کی طبع زاد ہوں یا دوسرے شعراء کی ایک نسل سے دوسری نسل تک سینہ بہ سینہ پہنچتی رہی ہیں۔ اس طرح وہ سماجی تاریخ کو سینوں میں محفوظ بھی کرتا رہا ہے اور منتقل کرتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر کسی زبردست بھونچال کے بارے میں مورخ اتنا لکھے گا کہ فلاں تاریخ کو جو بھونچال آیا، اُس

میں اتنے لوگ مارے گئے، اتنی عمارتیں گر گئیں۔ لیکن لڈی شاہ اس بھونچال کو نہ صرف یہ کہ جُزیات کے ساتھ پیش کرے گا بلکہ بھونچال سے آئی تباہی کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ بھونچال زدہ لوگوں کی آہیں، ٹیسیں، چیخ و پکار اور درد و عذاب کو اپنے سُننے والوں کو محسوس بھی کرائے گا۔ علاوہ اس کے باز آباد کاری اور ریلیف کے لئے مُختص رقوم کی خُرد بُرد کا احوال پیش کرے گا۔ اس طرح لڈی شاہ عوامی زندگی کی سچی ترجمانی کا حق ادا کرتا رہا ہے۔ اُس کے کلام میں صرف طنز و مزاح کا نمک مرچ ملا ہوتا ہے، وہ حالات و واقعات کے حقائق کو مسخ نہیں کرتا۔

ہمارے لڈی شاہ (وہ منظومات جو عوامی فنکار ''لڈی شاہ'' پیش کرتے آئے ہیں) شہر آشوب بھی ہیں اور سماجی تاریخ کا حصہ بھی۔ مگر کشمیری زبان کے قدیم لڈی شاہ محفوظ نہیں رہے ہیں، حالانکہ اپنے زمانے میں مقبول و مشہور رہے عوامی فنکاروں کے نام بھی موجود نہیں ہیں۔ کاش وہ قدیم لڈی شاہ (منظومات) ہمارے ہاتھ آجاتے تو ہماری سماجی تواریخ کے نہ جانے کتنے فراموش شُدہ واقعات دستیاب ہو جاتے!

ریاستی کلچرل اکادمی کے اہتمام سے آج تک کشمیری لوک گیتوں کے ۱۳ مجموعے شایع ہو چکے ہیں، جن میں پچاس سے زائد لڈی شاہ بھی شامل ہیں۔ یہاں ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ بعض منظومات میں لڈی شاہ (عوامی فنکار) نے اپنے آپ کو صرف ''لڈی'' نام دیا ہے اور منظوم واقعے کو ''لڈی نامہ''۔

اسلام علیکم لڈی شاہ ووت	گوڈٕ ون لڈیو کالہٕ کیا کھیوٚتھ
اسلام علیکم، لڈی شاہ حاضر ہے	اے لڈی، پہلے بتادو کہ کل شام کو آپ نے کیا کھایا ہے
بخت گوٚو بیدار کار سازی	دردٕ پأٹھی لڈی موٚت کرُن رأضی
اللہ تعالیٰ کی کارسازی سے قسمت جاگ گئی	پیار و محبت کے ساتھ لڈی کو راضی کردو

قہرِ قدرت چھُنہٕ وبوان کانْہہ

اپنے آپ کو بہت زیادہ عقلمند سمجھنے والے لوگ قہرِ الٰہی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ ہمیں اُن سے کیا واسطہ۔

پھوٚتِس کیتھ لڈ یِس مانگے اَن

لڈی کو بھری پُری ٹوکری بطورِ مانگے چاہیئے۔

کلچرل اکادمی کے اہتمام سے شایع شدہ لوک گیتوں کے مجموعوں میں شامل سب لڈی شاہ بقولِ محمد احسن احسنؔ:

"فنکار لڈی شاہ کے دہرے پر آسانی سے گائے جانے کے لائق نہیں ہیں، تاہم موضوعی اعتبار سے یہ سب لڈی شاہ ہی مانے جاسکتے ہیں۔ اُن میں کچھ شاعروں کی مثنوی نما نظمیں بھی بطورِ لڈی شاہ شامل کی گئی ہیں۔"

(کاشُر لُکہٕ ادب، سیمنارٕ ی مقالہٕ، ص:۱۲۶، ساہتیہ اکاڈمی، ۲۰۱۳ء)

کشمیری لوک گیتوں کے ان مجموعوں میں نظموں کے چند عنوانات یہ ہیں، جن کو لڈی شاہ مانا جاتا ہے:

کپر دزاگ (قحط کپڑوں کا)، نُنہٕ دزاگ (نمک کا قحط)، یٔنہٕ وألی (شادیاں)، بتہٕ دزاگ (قحط بھات کا)، ژھل (دھوکہ)، وندٕ (موسمِ سرما)، مکرزن، سہلاب (سیلاب)، نار (آگ)، گرِ بٹھہٕ گوٚھن (گھر جمائی بن جانا)، روگردان گوٚبُر (باغی بیٹا)، علاماتِ آخر زمان، انگریزی قونوٗن (قانون فرنگیوں کا)، بُنیُل (بھونچال)، بیگأری (کارِ بیگار)، مُجوزٕ نامہٕ (سرکار کی طرف سے شالی کا تجویز شدہ حصہ کسانوں سے حاصل کرنے کے عمل کی روئیداد)، کھراوہور (کھڑاؤں کی جوڑی)، آبہٕ دزاگ (قحطِ آب)، غلہٕ سوکال (غلّے کی فراوانی)، بتہٕ برکتھ (فراوانی بھات کی) اور مُسلہٕ بمأری (اسہال)، وغیرہ۔

میں اتنے لوگ مارے گئے، اتنی عمارتیں گر گئیں۔ لیکن لڈی شاہ اس بھونچال کو نہ صرف یہ کہ جُزیات کے ساتھ پیش کرے گا بلکہ بھونچال سے آئی تباہی کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ بھونچال زدہ لوگوں کی آہیں، ٹیسیں، چیخ و پکار اور درد و عذاب کو اپنے سُننے والوں کو محسوس بھی کرائے گا۔ علاوہ اس کے باز آبادکاری اور ریلیف کے لئے مُختص رقوم کی خُرد بُرد کا احوال پیش کرے گا۔ اس طرح لڈی شاہ عوامی زندگی کی سچی ترجمانی کا حق ادا کرتا رہا ہے۔ اُس کے کلام میں صرف طنز و مزاح کا نمک مرچ ملا ہوتا ہے، وہ حالات و واقعات کے حقائق کو مسخ نہیں کرتا۔

ہمارے لڈی شاہ (وہ منظومات جو عوامی فنکار "لڈی شاہ" پیش کرتے آئے ہیں) شہر آشوب بھی ہیں اور سماجی تاریخ کا حصہ بھی۔ مگر کشمیری زبان کے قدیم لڈی شاہ محفوظ نہیں رہے ہیں، حالانکہ اپنے زمانے میں مقبول و مشہور رہے عوامی فنکاروں کے نام بھی موجود نہیں ہیں۔ کاش وہ قدیم لڈی شاہ (منظومات) ہمارے ہاتھ آجاتے تو ہماری سماجی تواریخ کے نہ جانے کتنے فراموش شُدہ واقعات دستیاب ہو جاتے!

ریاستی کلچرل اکادمی کے اہتمام سے آج تک کشمیری لوک گیتوں کے ۱۳ مجموعے شایع ہو چکے ہیں، جن میں پچاس سے زائد لڈی شاہ بھی شامل ہیں۔ یہاں ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ بعض منظومات میں لڈی شاہ (عوامی فنکار) نے اپنے آپ کو صرف "لڈی" نام دیا ہے اور منظوم واقعے کو "لڈی نامہ"۔

اسلام علیکم لڈی شاہ ووت
اسلام علیکم ،لڈی شاہ حاضر ہے

گوڈٕ ون لڈیو کالہٕ کیا کھیوتھ
اے لڈی، پہلے بتادو کہ کل شام کو
آپ نے کیا کھایا ہے

بخت گوو بیدار کار سازی
اللہ تعالیٰ کی کارسازی سے قسمت
جاگ گئی

دردٕ پأٹھی لڈی موت کرٕن رأضی
پیار و محبت کے ساتھ لڈی کو راضی
کردو

قہرِ قدرت چھُنہٕ وبوان کا کَہن
اپنے آپ کو بہت زیادہ عقلمند سمجھنے
والے لوگ قہرِ الٰہی کو بھی خاطر
میں نہیں لاتے۔ ہمیں اُن سے کیا
واسطہ۔

پھوٗتس کبتھ لڈیس مانگنے اَن
لڈی کو بھری پُری ٹوکری بطورِ
مانگنے چاہیئے۔

کلچرل اکادمی کے اہتمام سے شایع شُدہ لوک گیتوں کے مجموعوں میں شامل سب لڈی شاہ بقولِ محمد احسن احسنؔ:

"فنکار لڈی شاہ کے دہرے پر آسانی سے گائے جانے کے لائق نہیں ہیں، تاہم موضوعی اعتبار سے یہ سب لڈی شاہ ہی مانے جاسکتے ہیں۔ اُن میں کچھ شاعروں کی مثنوی نما نظمیں بھی بطورِ لڈی شاہ شامل کی گئی ہیں۔"

(کاشُر لُکہٕ ادب، سیمنارُک مقالہٕ، ص: ۱۲۶، ساہتیہ اکاڈمی، ۲۰۱۳ء)

کشمیری لوک گیتوں کے ان مجموعوں میں نظموں کے چند عنوانات یہ ہیں، جن کو لڈی شاہ مانا جاتا ہے:

کپر دزاگ (قحط کپڑوں کا)، نُنہٕ دزاگ (نمک کا قحط)، یِنہٕ وٲلی (شادیاں)، بتہٕ دزاگ (قحط بھات کا)، ژھل (دھوکہ)، وند (موسمِ سرما)، مکرزن، سہلاب (سیلاب)، نار (آگ)، گرِ پیٹھہٕ گوٗھن (گھر جمائی بن جانا)، روگروان گوبُر (باغی بیٹا)، علاماتِ آخر زمان، انگریزی قونوٗن (قانون فرنگیوں کا)، بُنٛیل (بھونچال)، بگارٕ (کارِ بیگار)، مُجوز نامہٕ (سرکار کی طرف سے شالی کا تجویز شُدہ حصہ کسانوں سے حاصل کرنے کے عمل کی روئیداد)، کھراوٕ ہوٗر (کھڑاوں کی جوڑی)، آبہٕ دزاگ (قحطِ آب)، غلہٕ سوکال (غلّے کی فراوانی)، بتہٕ برکتھ (فراوانی بھات کی) اور مُسلہٕ بمارٕ (اسہال)، وغیرہ۔

کشمیر میں قدیم زمانے سے خشک سالی، سرکاری بدنظمی اور کسانوں پر روا رکھے گئے ظلم اور استحصال کی وجہ سے غلّے کی نایابی کے زبردست واقعات ہوتے رہے ہیں۔ قحط جھیلتے جھیلتے کشمیریوں کی زندگی دوبھر ہوجاتی تھی۔ کچھ ایسے قحط بھی پڑے ہیں کہ لوگوں نے اپنے بچوں کو فروخت کیا، لوگ بھوک مری کا شکار ہوگئے۔ ایسا ہی ایک قحط سکھوں کی حکومت کے زمانے میں پڑا تھا۔ اُس کو کشمیر کے لوگ بوڈ قحط (قحطِ عظیم) کے نام سے یاد کرتے آئے ہیں۔ شیر سنگھ ۱۸۳۱ء میں کشمیر کا صوبیدار مقرر ہوا تھا۔ وہ نہایت عیاش اور غیر ذمہ دار ثابت ہوا۔ اُس نے مالیہ جمع کرانے کی ذمہ داری وشاکھا سنگھ (کشمیری میں ''ویشہِ سنگھ'') کو سونپ دی تھی۔ اُس ظالم نے لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ شکایت لاہور دربار میں پہنچ گئی اور ویشاکھا سنگھ کو معزول کر دیا گیا۔ شیخ غلام محی الدین کو صاحب کار اور خوشحال سنگھ (خوشہِ شنگھ) کو جمعہ دار مقرر کر دیا گیا۔ شیر سنگھ نے اپنے کارندوں کے ذریعے تمام مُرغ مُرغیاں ذبح کر وادیں۔ کشمیر میں ایک بھی مُرغا موجود نہیں رہا۔ اُسی کے دور میں گاؤ کشی کے جُرم میں بارہ آدمیوں کو زندہ جلایا گیا تھا۔[1] اسی زمانے میں غضب کا قحط پڑا۔ دھان کی فصل پکنے والی تھی تو زبردست برف باری ہوگئی۔ ساری فصل ضائع ہوگئی۔ اگر کسی کے پاس کھانے کو کچھ تھا تو وہ بہ حقِ سرکار ضبط ہوگیا۔ لوگ لاشوں کو کھانے لگے۔ بچوں کو بیچنے لگے، ہر روز لوگوں کی بڑی تعداد لقمۂ اجل بن جاتی۔

سر والٹر لارنس نے اس قحطِ عظیم کے بارے میں لکھا ہے کہ شیر سنگھ کے زمانے میں پڑا یہ قحطِ عظیم تاریخ کشمیر کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے:

"Sher Singh, the reputed son of Ranjit Singh, Became nominal Governor in 1831, But amused himself and left all bussiness to Baisakha Singh. The Sher Sing is still a great mark in Kashmir History" (Valley of Kashmir, Page: 200)

1. تاریخِ حسن (فارسی) جلد:۲۔

''۱۹۳۱ء میں رنجیت سنگھ کا مشہور بیٹا شیر سنگھ کشمیر کا نام نہاد گورنر بن گیا۔ خود عیش رانی اور دِل بہلائی میں لگ گیا اور سرکار کا سارا کام کاج بیسا کھ سنگھ کے لئے چھوڑ دیا۔ شیر سنگھ کے زمانے کا قحط کشمیر کی تاریخ پر بڑا دھبہ ہے اور نمایاں واقعہ ہے۔''

''رنجیت سنگھ کی حکومت اور شیر سنگھ کی صوبہ داری کے ایام ۱۲۴۸ھ (۱۸۸۹ء بکرمی) میں موسمِ بہار کے شروع میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر کی سیر کرنے کے لئے پونچھ میں اپنی جاہ وحشمت کے خیمے نصب کئے اور ضروری تیاریوں کے لئے شیخ غلام محی الدین اور جمعہ دار خوشحال سنگھ کو پہلے کشمیر بھیج دیا۔ انہوں نے کمالِ جوش وخروش کے ساتھ غلّہ ضبط کرایا اور قحط کی آگ کے شعلوں کو آسمانوں تک پہنچایا۔ قحط کی خبر سنُتے ہی رنجیت سنگھ پونچھ سے واپس لاہور چلا گیا۔ اِدھر خوشحال سنگھ نے ظلم واستبداد اور غلّے کو ضبط کرنے کی راہ سے قحط کے بارودخانے میں آگ لگادی۔ لوگ بھوک کی آگ میں ایندھن کی طرح جل گئے۔ کتک کے مہینے میں جب دھان ابھی کاٹی نہیں گئی تھی۔ کثرت سے برف باری ہوئی۔ فصل برف کے نیچے ضائع ہوگئی۔ قحط کی تنگی ایسی سخت ہوگئی کہ لوگوں نے اپنے آلات واسباب کو مٹی کے مول بیچ ڈالا۔ زندہ بچے ہوئے لوگ مُردوں کو بے تحاشا کھالیتے تھے۔ اکثر لوگوں نے بچوں کو کوڑیوں اور چند لقموں کے عوض دوسروں کو دے دیا۔ چاول کے دو سیر ایک روپے میں بھی نہیں ملتے تھے۔ ۱۲۵۰ء میں کرنیل میاں سنگھ کشمیر کا حاکم مقرر ہوا۔ جب وہ شیر گڈھی میں داخل ہوا تو اس محل کے بڑے کمرے کی چھت پر آگیا۔ اُسے سارے شہر میں کہیں چراغ کی روشنی جلتی نظر نہیں آئی اور نہ ہی کہیں سے صُبح کے مرغ کی آواز سُنی۔ بازاروں اور سڑکوں پر اجواین اور بھنگ اُگتی دیکھی۔ یہ دیکھ کر وہ غم واندوہ میں ڈوب گیا۔ آخر بڑی کوشش اور جدوجہد کے ساتھ اُس نے پنجاب اور پہاڑی علاقوں سے دھان وغیرہ مُہیا کرائی اور یہاں بیج حراہم کئے۔ پنجاب سے انڈے منگوائے۔ بہت مہربانی اور احسان سے کام لیکر مُلک کو آباد کیا۔ قحط کی آگ کچھ ٹھنڈی پڑگئی اور دوسرے سال چیزیں سستی ہوگئیں۔''

(تاریخِ حسن، حصہ اوّل (فارسی (ص: فارسی سے ترجمہ)

عام لوگ مورخوں کا انتظار نہیں کرتے کہ وہ ایسے واقعات کو اپنی کتابوں میں کب محفوظ کرلیں۔ اگر چہ شیر سنگھ کے زمانے کے اس قحطِ عظیم کا تذکرہ مورخوں نے بھی کرلیا ہے، تاہم ہمارے لوک ادب نے اس قحط کو واقع ہونے کے فوراً بعد اس کی تمام تر جزیات سمیت محفوظ کرلیا تھا اور ''شیر سنگھُن دراگ'' (شیر سنگھ کا قحط) تلمیح آج تک لوگ دہراتے رہے ہیں۔ راقم الحروف کو ۱۹۸۹ء میں ایک لڈی شاہ ہاتھ لگا، جس میں شیر سنگھ کے زمانے کے اس بدنام قحط کا حال پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اُس کی نہ صرف یہ کہ سماجی ترجمانی کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے بلکہ وہ تواریخی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ اس مثنوی نما لڈی شاہ کے کُل ۲۲ بند ہیں۔ اس میں شیر سنگھ مذکورہ کو دراگہٕ موکل (قحط کا موکل) بتایا گیا ہے۔ اس کے چند بند معہ ترجمہ پیشِ خدمت ہیں:

کھہَن منز فصلس شِیاہ گوو   ہرُد اوس وٹہٕ ئے شینہ پیوو
ذاتن لیکھتھ پی ڈیکس تھوو   پیوُمت دلنہٕ اوس، ربہٕ بزُ گوو
مُلکِ کشمیرس کیاوُ بتھ آو
شیر سنگھ دزاگہٕ موکل بُتھ آو

(دھان کی فصل پک چکی تھی اور فصل کٹائی ہونے کو تھی، زبردست برف باری ہوگئی۔ ساری فصل کیچڑ کی نذر ہوکر ضایع ہوگئی، ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا ملکِ کشمیر پر کیا بپتا آن پڑی کہ شیر سنگھ قحط کا موکل بن کر آگیا)

فاقہٕ لگو خلقن صُبح تَے شام   دزاگن آوٕ راُدی شہر تَے گام
خون اُسکر ہاران خاص تَے عام   دزاگن لاُجکھ موتنٕ لام
ملکِ کشمیرس کیاوُ بتھ آو
شیر سنگھ دزاگہٕ موکل بُتھ آو

(لوگ بھوک مری کا شکار ہو گئے۔قحط نے ان کو لقمۂ اجل بنا دیا۔شہر و دیہات میں قحط عام ہو گیا۔خواص و عوام خون کے آنسو بہا رہے تھے۔ملکِ کشمیر پر کیا بپتا آن پڑی۔شیر سنگھ قحط کا بھوت بن کر آیا)۔

دراگہٕ دیو اںٛدٕ وںٛد گوٚو سرزور | پانژمُلہِ کاندر ییٚنہٕ خاوند مور
شُرؠ ژھٔنِن ترأوِتھ وأژ ژھٕج وور | تتہِ کھوٚت صأبرس بیٚنہٕ ہمٕن بور

ملکِ کشمیرس کیاوُ ننتھ آو
شیر سنگھ دژاگہٕ موکل ہٕنتھ آو

(قحط کا دیو ہر طرف زور دکھاتا گیا۔پانژمُلہ گاوں میں نانوائی کی بیوی نے اپنا خاوند قتل کیا۔بچوں کو وہیں چھوڑ کر ژھج وور گاوں میں پہنچ گئی، جہاں صابر نامی شخص پر اُس کے کھانے پینے کا بوجھ پڑ گیا۔ملکِ کشمیر پر یہ کیسی بپتا آ گئی کہ شیر سنگھ قحط کا موکل بن کر آیا)

مائلؠ ماجہِ شُر بن ہُنٛد سرٕ ییٚہہ مُشرِ وو | مائلؠ ترٕ وو نیچو تٔے نیچوِ مول ترٕ وو
ہاوِتھ ناڑ گُجرؠ اکہِ مول مارنوو | چایہِ کنہِ ہانہٕ ڈۄنی رس چاونوو

(والدین سے بچوں کی محبت جاتی رہی۔باپ نے بیٹے کو بھلا دیا اور بیٹے نے باپ کو تیاگ دیا۔ہاپت ناڈ گاؤں میں ایک گوجر نے اپنا باپ مروایا۔چائے کے بجائے ہانہ ڈؤن (حنزل: ایک کڑوا میوہ) کا رس پلوایا)

ویٚنٛشہِ سنگھ خوشہِ سنگھ صاحب کار | ہوان اُسی مائلیاہ دِوان اُسی مار
سلرس کولرس تُلکھ گٹہٕ کار | ییٚزارن منز ژلان نیرِتھ اِدرار

ملکِ کشمیرس کیاوُ ننتھ آو
شیر سنگھ دژاگہٕ موکل ہٕنتھ آو

(ریشہ سنگھ اور خوشہ سنگھ، دونوں صاحب کار، لوگوں کو زدو کوب کر کے مالیہ جمع کرتے تھے۔ انہوں نے سِلر اور کلر نامی دیہات میں اُدھم مچا دیا۔ لوگ پاجاموں کے اندر ہی بے خودی میں پیشاب پھیر دیتے تھے۔ ملک کشمیر پر یہ کیسی مصیبت نازل ہوگئی کہ شیر سنگھ قحط کا بھوت بن کر آ گیا)

سہر جاگیر اوس محی الدینس   اِلٰہی غضب کر بے دینس
بچارس کبہ شاہس مِسکینس   دبہ ترٚوو کوٚرنس ضمٲنس

ملکِ کشمیرس کیاہ وٲتھ آو
شیر سنگھ دزاگہٕ موکل ہُتھ آو

(الٰہی، محی الدین بے دین پر غضب کر۔ سہر گاؤں اس کی جاگیر تھا۔ بے چارے مسکین کبہ شہہ پر اُس نے غضب کیا، کیونکہ وہ مالیہ کے لئے کسی کی ضمانت دے چکا تھا۔ ملکِ کشمیر پر یہ کیسی مصیبت ٹوٹ پڑی کہ شیر سنگھ قحط کا موکل بن کر آیا)

۱۹۴۷ء میں برصغیر تقسیم ہوگیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کشمیر سے چلے گئے۔ رسل و رسائل کے تمام ذرائع منقطع ہوگئے۔ کشمیر میں کوہستانی نمک استعمال کیا جاتا تھا۔ حالات بگڑ گئے، کوہستانی نمک پاکستانی علاقہ جات سے کشمیر نہیں پہنچ پایا۔ یہ نمک، جو کچھ موجود تھا، بازار سے غائب ہوگیا اور کشمیریوں کو نمک کے قحط کی مصیبت اٹھانا پڑی۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کی شدّت اتنی تھی کہ آج تک کشمیریوں کے ذہنوں میں محفوظ ہے۔ نمک کے معمولی ٹکڑے کے لئے لوگوں نے اپنی جائیداد فروخت کر دیں۔ قحطِ نمک کا یہ واقعہ کشمیر کی تاریخ میں شاید پہلا اور آخری واقعہ ہے۔ مورّخوں نے لکھا ہے کہ برِ صغیر کی تقسیم کے زمانے کے زمانے میں کشمیر میں نمک نایاب ہوگیا، مگر لوک ادب نے وہ سب تکلیفیں، جھگڑے اور اذیتیں پوری تفصیل کے ساتھ محفوظ کر لی ہیں، جن کا سبب قحطِ نمک تھا۔ تک بندوں اور شاعروں نے، جن میں خود عوامی فنکار لڈی شاہ بھی شامل تھے، اس قحط کے اثرات اور

جزیات کو نظم کیا ہے اور ان منظومات کو لوگوں کے سامنے پیش کیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک منظومے سے یہاں چند بند پیش کیے جاتے ہیں:

روز ساتھا بوز تھاو کنۂ

ژنہ ورا ءِ لگی سخن وئے

(رُک جاو، میری بات سُن، میں تمہیں نمک کے قحط کے قصّے سناوں گا)

چھُنہٕ مرد زنانہٕ پڑان | پانہٕ گُنز ہیتھ ویس اژان
یُتھنہٕ خرچ کرکھ بوئے | ژنہٕ دراءِ لگی سخن وئے

(خاوند اپنی بیوی سے بدگمان ہے۔ اُس نے گھریلو ضروریات کی چیزیں مُقفل کر دی ہیں۔ وہ خود ہی چابی لے کر یہ چیزیں بیوی کو دیتا ہے، اِس ڈر سے کہ بیوی اصراف نہ کرے۔ ذرا رُک جاؤ، میں نمک کے قحط کے قصّے سناؤں گا)

چھُنہٕ مرد زنانہٕ بوزان | دانس تل وودنے روزان
ژنہٕ پھوٗل ہے غاب گوٗ وبوئے | ژنہٕ دراءِ لگی سخن وئے[1]

(خاوند بیوی کے منع کرنے کے باوجود اپنی ضِد پر اڑا رہا۔ وہ چوٗلہے ہانڈی کی برابر نگہبانی کیے جا رہے ہے۔ کیونکہ نمک کا ایک ٹکڑا غائب ہو چکا تھا، میں نمک کے قحط کے قصّے سناؤں گا)

کم کم نوٗن گوٗ ھبس تراوٗن | پوٗھہٕ تُلاہ گوٗھبس ہاوٗن
مُشکہٕ ستّی دیوبتہٕ پیٖہ کھینۂ | ژنہٕ دراءِ لگی سخن وئے

(بہت کم نمک استعمال کرو، مان لو کہ نمک سالن اور چاے میں ڈالنا نہیں بلکہ دوٗر ہی سے دکھانا چاہیئے، تاکہ اس کی بو باس کی مدد سے بھات کھائی جا سکے۔ میں نمک کے قحط کے قصّے سناؤں گا)

کشمیری زبان میں موجود اس قسم کی منظوٗمات میں سنہ و تاریخ درج نہیں ہے تاکہ

ان میں بیان شدہ واقعات کو ایک تاریخی ترتیب دی جا سکے۔ البتہ ان کے زمانے کا تعین متن دیکھ کر آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر کشمیر میں لوگوں سے بلا معاوضہ جبراً کام لینے کا چلن مدتوں سے موجود تھا۔ بلکہ اس کے لئے ''کارِ بیگار'' کا سرکاری محکمہ بھی موجود تھا، بقول سر والٹر لارنس:

"Begar means to the Kashmiris is far more than the impressment of Labour, for under it's comprehensive name every kind of demond for labour or property taken but not paid for by the officials was included. Gilgit to the Kashmiri is a constant terrror, and when it was rumoured that transport was wanted to convey the baggage of troops going to or coming from Gilgat there was a general stampede among the villagers." (Valley of Kashmir, Page: 411-413)

''کشمیریوں کے لئے بیگار کا مطلب، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، عوامی خدمت کے لئے انسانوں یا مال و جائیداد کو ضبط کرنے کے علاوہ، ہر قسم اور ہر چیز کے لئے کوئی معاوضہ نہیں دیتے تھے۔ گلگت بیگار کشمیریوں کے لئے ایک مستقل دہشت کا نام تھا۔ جب افواہ ہو جاتی تھی کہ فوج کے لئے گلگت تک رسد اور سامان لے جانے یا وہاں سے واپس لانے کے لئے لوگوں کی ضرورت ہے، دیہاتیوں میں زبردست کھلبلی اور ہڑ بڑی مچ جاتی تھی۔''

گلگت بیگار کا مطلب تھا موت۔ اگر بیگار پر لیا گیا مزدور زندہ آ بھی جاتا تو کسی نہ کسی بیماری کی گرفت ضرور آ چکا ہوتا، یا جسمانی طور معذور ہو کر آتا۔ کشمیر کی تاریخ میں کارِ بیگار ظلم و ستم اور استحصال کی علامت کے طور پر موجود ہے۔ تذکرہ نگاروں اور مورّخوں نے اس کا ذکر کیا ہے اور غیر ملکی سیاحوں کے سفرناموں میں اس کی تفصیلات موجود ہیں، مگر گلگت بیگار کشمیری لوک ادب میں آج تک محفوظ ہے۔ کئی قسم کی بلا معاوضہ جبری مزدوری

کے واقعات سے متعلق ہمارے پاس کئی لڈی شاہ (منظومات) موجود ہیں۔ ایسے لڈی شاہ (نظمیں) بھی ہیں، جواُن تنگ بندوں یا شاعروں نے اپنے اپنے وقت میں منظوم کئے ہیں، جوخود بیگار میں شامل رہ کر مصائب و آلام جھیل کر جوں توں کر کے زندہ بچ کر آئے تھے۔ گلگت بیگار ہو، لداخ اور تبت والی بیگار ہو یا یارقند کی سفارت کی بیگار۔ ہمارے لوک ادب میں ظلم وستم کی یہ علامات آج تک زندہ ہیں۔ یارقند کی سفارت پر جبراً بلا معاوضہ کام لگائے گئے کشمیریوں میں (یہ کشمیری خورد ونوش کی چیزیں اور دیگر بوجھ کاندھوں پر لاد کر یارقند بھیج دئے گئے تھے)، ایک شخص صابر تلوونی بھی شامل تھا، لڈی شاہ طرز کی اُس کی نظم سٹاین نے کشمیر لوک کہانیوں کے مجموعے "The Hatam's Tales" میں شامل کی ہے:

"یارقندانون زینان" (ہم یارقند فتح کر کے آئیں گے)، یہ ۱۲۸۷ھ کا واقعہ ہے۔ اس نظم کا راوی صابر کا بیٹا حاتم تلوونی تھا۔ اس میں یارقند والی بیگار کا چشم دید حال بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح ایک اور شخص، فتح بٹ ہوگامی تھا، جس کو پکڑ کر لداخ اور تبت تک فوجیوں کے لئے، دیگر لوگوں کے ساتھ رسد کا سامان لے جانے کے لئے، بھیجا گیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح زندہ بچ کر آیا اور اس بیگار میں پیش آنے والی مصیبتوں کا حال منظوم کیا۔ اس لڈی شاہ طرز کی نظم میں کشمیریوں کی بے بسی موجود ہے:

روپہ بدَن کمن شیر سمُن   ہاے پیٚکھ مأنزے نمن
بربم دنیا روزِ دوہَن تارن   رأوِ متمن دردِل ژھارن

(ہاتھوں میں مہندی لگائے، کیسے کیسے شیروں کی طرح بہادُر سیم تن نوجوان خاک میں مل گئے، یہ دُنیا فانی ہے۔ عزیز و اقارب کو اپنے گم شدُہ لوگوں کی بہت تلاش رہے گی)

تھوکہ ژھنگ تو تورِ جن وتن   بوٹہٕ بیگأری، بوٹہٕ پنڈ رکتن
تی وُچھنأوی واحد القہارن   رأوِ متمن دردِل ژھارن

(لداخ کی بیگار والی مصیبتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ وہاں
کے مرد چرخا کاتتے ہیں۔ وہاں کے راستوں کی خجالت و ملامت ہو۔ عزیز و
اقارب کو اپنے گُم شُدہ لوگوں کی بہت تلاش رہے گی)

یم کتھہٕ کُس وَنہِ مہاراجس — تھوکہ ژھنِکر ہے بوٹنی راجس

(ہمارے مصائب کی روئیداد مہاراجہ تک کون پہنچائے، تاکہ وہ
لداخ اور گلگت والے علاقوں پر اپنا راج پاٹ تیاگ دے۔ لداخ والی بیگار
یاد آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگتی ہیں۔ عزیز و اقارب کو اپنے گُم شدہ
لوگوں کی بہت تلاش رہے گی)

بیگار کی بات چلی تو ایک بار خطرناک سیلاب آیا تھا۔ سیلاب کے بعد وُرن ہال نامی گاؤں کے قریب دریا میں پتھر، کنکر، مٹی، ریت وغیرہ کے ڈھیر جمع ہو گئے تھے۔ پانی کو آگے جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس رُکاوٹ کو کشمیری میں شاٹھ کہا جاتا ہے۔ یہی شاٹھ ہٹانے کے لئے سرکاری کارندوں نے آس پاس کے لوگوں کو جبراً کام پر لگا دیا۔ اس بیگار کی مضحکہ خیز صورتِ حال لڑی شاہ کے ان اشعار میں پیش کی گئی ہے:

زرأڈی والن بد اوس طالع — شاٹھ لوگمت منز وُرن ہالے

اسد صوٗفس ئرکھ ریٚژ فائے — کولے کھنہٕ نٔکی بوز افسانے

(بہت بُری قسمت تھی نشیبی علاقے کے لوگوں کی! وُرن ہال کے
قریب دریا میں رُکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ بے چارے اسد صوفی کی ہڈی پسلی
توڑ دی گئی۔ سُنو سُنو دریا سے شاٹھ ہٹانے کے افسانے سُنو)

شاٹھ لگی تھے گاٹھ بیلہٕ بند گوو — ہؤل بارو وۆتھ اند وند گوو

درلیہٕ حاکم ڈالہٕ مارا نے — کول کھنہٕ نٔکی بوز افسانے

شاٹھ لگنے سے جب پنگھٹ بند ہو گیا، ہر سمت ہاہا کار مچ گئی۔
حُکام خراماں خراماں نکل آئے۔ سُنو سُنو، دریا سے شاٹھ ہٹانے کے قصے سُنو)

گرِ پتہٕ گرِ مُونگہٕ ہگھ اُکھ اُکھ　　　مرِ دنئے آسہٕ ژٔنی پیہٕ بے شک
رلہٕ مِلہٕ اُسی شاٹھ پراٹانے　　　کول کھنہٕ ہٕکی بوز افسانئے

(ہر گھر سے ایک ایک آدمی طلب کیا گیا۔ مرد کی غیر موجودگی میں خود عورت حاضر ہو جائے۔ مرد اور عورتیں اکٹھے "شاٹھ" اٹھا رہے تھے۔ سُو سُو، شاٹھ اٹھانے کے قصّے سُو)

کوٗت جابٕر پیوس لسہٕ پنڈِتھ　　　نیٚن مومہٕ ڈار گاسہٕ رزِ گنڈِتھ
ڈارِ بابہٕ چھس پتہٕ دورانے　　　کول کھنہٕ ہٕکی بوز افسانئے

(ہائے! کتنا جابر ہے لسہٕ پنڈت! بے چارے مومہ ڈار کو گھاس کی رسی سے باندھ کر گھسیٹ کر لے گیا۔ ڈار خاندان کی بیبیاں اُس کے پیچھے پیچھے دوڑی جا رہی ہیں۔ سُو سُو، دریا سے شاٹھ اٹھانے کے قصّے سُو۔

اُس خوتن وُنہٕ انہری شی　　　ئُج تاونس وِژہس بُری شی
کتہٕ رؤدُس سازِ چندائے　　　کول کھنہٕ ہٕکی بوز افسانئے

(بے چاری خوتن ابھی کنواری تھی۔ اُس کو بھی پکڑ کر لے گئے۔ بے چاری مصیبت میں پھنس گئی۔ اُس کا بناو سنگار کیونکر قائم رہ سکتا تھا)

سِکہ چپرٲسی لٲیس تھاپر　　　نبہٕ لانٹھس ویسہٕ لڑیاے کھاپر
ہکی لگی لگی اوش ہارانے　　　کول کھنہٕ ہٕکی بوز افسانئے

(سِکھ چپراسی نے نبہٕ لانٹھ (ہیجڑے) کے گال پر ایسا طمانچہ مارا کہ اس کے سر کی کھوپڑی کے جوڑ ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ ہکلا ہکلا کر آنسو بہا رہا تھا)

سیلاب کی تباہ کاریوں کا مال بھی لڈی شاہ کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

زنانہٕ دؤپ خاوندس سہلابہٕ آو　　　زنانہٕ دؤپ خاوندس سہلابہٕ آو
ژھوپہٕ کری دؤپچے مے ہیٚنہٕ ناو　　　زنانہٕ دؤپ خاوندس سہلابہٕ آو
خوشی گیہٕ منزی پروردِگارس　　　منزم دکہٕ اون ئے رمضان کھارس

وان پیر نیوٗنس ہتھ یارِ سان   وقتِ خفتن کوٗرنس فان
ون سائٔ خبراہ سمسار چند   سوندرِ ہندی پرٛسٔن کوٗرنکھ بند
صُبحن تہٕ شامن اوس ژھانڈان   وقتِ خفتن کوٗرنس فان
عار نو آو تس بے عارس   گانہٕ منٛزٕ گاو کڈِن صُجان ڈارس
ناوکہِ منٛزٕ کھأجکھ لٔتہٕ لِتھوان   وقتِ خفتن کوٗرنس فان

ترجمہ: (بیوی نے خاوند سے کہا (جبکہ وہ اپنے بستر میں دُبکے پڑے تھے)، کہ دیکھتے نہیں، سیلاب کا ریلا آن پہنچا ہے۔ خاوند نے جواب دیا۔ اری کم بخت! خاموش رہ۔ اللہ میاں کی مرضی کہ رمضان کھار (آہنگر) کی دوکان معہ آلاتِ آہنگری بہہ گئی۔ دوکان کو سیلاب کے ریلے نے درمیان میں گھیر لیا۔ سیلاب نے سرِ شام کتنی تباہی مچادی! اے سمسار چند! سُناو، تیرا کیا حال ہے؟ تُجھے تو سُندری (سمسار چند کی بیوی) کے بچہ جننے نے تو خانہ بند ہی کیا تھا۔ تو صُبح اور شام ڈھونڈتا رہتا تھا۔ سیلاب نے سرِ شام تباہی مچادی۔ اس بے عار نے صُجان دار کی گائے کو گاؤ خانے سے نکلوا دیا۔ سیلاب اس دودھ دینے والی گائے کو اپنے ساتھ بہالے گیا۔ بعد میں لوگ اِسے پانی اور کیچڑ سے کشاں کشاں گھر لے آئے۔ سیلاب نے سرِ شام تباہی مچادی)[1]

بہر حال، لڈی شاہ کا پُرانا دم خم، اس کی شہرت و مقبولیت اب باقی نہیں ہے۔ اس قسم کے لوک فنکار اور تفریح کار دوسرے ممالک میں بھی پائے جاتے تھے اور کاشُر انسایکلو پیڈیا میں درج ہے کہ:

"آجکل بھی بہت سے مقامات میں لڈی شاہ کی طرح کوئی نہ کوئی ساز بجانے والے گویئے گھوم گھام کر لوگوں کی دِل بہلائی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یورپ کے قدیم کیلٹک (CELTIC) لوگوں کے اُن شعراء کا ذکر بھی کیا جاتا ہے، جن کو بارڈ (BARD) کہا جاتا تھا۔ بارڈ کا فن سماجی نوعیت کا تھا، اس کا تعلق عام لوگوں کی زندگی، اُن

[1] ترجمہ مرحوم نشاد انصاری نے کیا تھا۔

روایات اور ان کے آیڈیلز (IDEALS) سے ہوتا تھا۔ وہ اپنے قومی ہیروؤں (Heros) کی عظمت دہراتے تھے۔ قومی فتوحات کی روائیدادیں دُہراتے تھے۔ لیکن لڈی شاہ اور بارڈ کے بارے میں یکسانیت کا پہلو ڈھونڈتے وقت یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دونوں فنکار مختلف سماجوں سے تعلق رکھتے تھے اور بارڈوں (Bards) کو مختلف وراثتی مراعات حاصل تھیں۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ انگریز شکسپیر اور مِلٹن جیسے عظیم شعراء کو بھی بارڑ (Bard) کہتے ہیں۔ اس حساب سے کشمیری لڈی شاہ اور انگریز بارڑ (Bard) میں کوئی قریبی تعلق یا یکسانیت نہیں ہے۔ البتہ اس کے بجائے کشمیری لڈی شاہ کے سِلسلے میں یورپ کے قرونِ وسطیٰ کے اُن عوامی فنکاروں کی طرف دھیان دینا مناسب دِکھتا ہے جو گلیمین (Gleeman)، زانگلار (Jongleur) اور منسٹرل Ministeral، جیسے ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ یہ وہی پیشہ ورانہ تفریح کار ہیں، جو چودھویں صدی عیسوی میں یورپ میں کافی شہرت رکھتے تھے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں چھاپ خانہ ایجاد ہونے سے وہ اس کام سے دور ہوتے گئے۔ کچھ منسٹرل ہمارے لڈی شاہ کی طرح گاؤں جاکر یا بازاروں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ لوگ روایتی قصّے کہانیاں بیان کرتے تھے۔ لڈی شاہ کا کردار پہچاننے کے سِلسلے میں قدیم یونان کے اُس مطرب کی طرف بھی دھیان دیا جاسکتا ہے جو ہر جگہ جاکر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا، جسے ریفسڈ (Rhapsode) کہتے تھے۔'' (کاشُر انسایکلو پیڈیا، جلد:۴، ص:۳۳۰، کلچرل اکاڈمی)

☆☆☆

کتابیات:

۱۔ کاشُر لُکہ بأتھ: ترووواہِ جلدِ۔ (کشمیری لوک گیت: ۱۳ جلدیں۔ کلچرل اکاڈمی)۔

۲۔ ہمارا ادب (لوک ادب نمبر) ۷۷-۱۹۷۶ء کلچرل اکاڈمی۔

۳۔ کاشُر لُکہ ادب: ۱۳-۲۰۱۲ء، ساہتیہ اکاڈمی، دہلی۔

۴۔ کأشُر انسایکلوپیڈیا، جلد۴، کلچرل اکاڈمی۔

۵۔ کأشرلکہٕ شأعری: وکھنۍ تہٕ ویژھنۍ، ۲۰۰۷ء، غلام نبی آتش

۶۔ مقالات: پروفیسر محی الدین حاجنی، ۱۹۶۶ء۔

۷۔ دِویلی آف کشمیر، سروالٹر لارنس: ۱۹۹۸ء۔

۸۔ تاریخِ حسن (فارسی) جلد ا۔ ۱۹۵۴ء۔

☆☆☆

"شیرازہ" میں چھپنے والی نگارشات

(۱) ہر نگارش کا معاوضہ پیش کیا جاتا ہے شرطیکہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو۔

(۲) ہندوستانی تاریخ وتمدن اور ثقافت و ادب کے مختلف پہلوؤں پر معیاری تحقیقی مضامین قبول کئے جاتے ہیں۔

(۳) ریاست کے تمدّنی اور فنی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات ترجیحی طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔

(۴) فنِ تعمیر، آرٹ اور مصوّری سے متعلق مضامین کے ساتھ آنے والی نادر تصاویر کا الگ سے معاوضہ دیا جاسکتا ہے۔

(۵) منظومات، بشرطیکہ معیاری ہو، قبول کیا جاتی ہیں۔

☆☆☆

☆......محمد علی خان

بلتستان..................قدیم قبیلے

بلتستان کی جغرافیائی اور پولیٹکل تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس علاقے کی جغرافیائی ہیّت وقتاً فوقتاً بدلتی رہی اور اس کی سرحدیں ایک جگہ متعین نہ ہوسکیں۔ اس کے علاوہ وہ ماضی بعید میں بلتستان دُنیا کے مختلف ممالک کے ساتھ بالواسطہ یا بلاواسطہ جغرافیائی، نسلی، لسانی، سیاسی و مذہبی تعلقات استوار رہے ہیں۔ بلتی زبان میں اُن ملکوں کے نام اس طرح ادا ہوئے ہیں:

رگیائسر	روس
رگیاکر	ہندوستان
مُزیُل	پوریگ، کارگل، لدّاخ
دُروگ یُل	تبت
چوق یُل	نیپال
کھاچُل	کشمیر
سوق یُل	منگولیا
ہاہے یُل	ہُونزہ نگر
بروشال	گلگت
تیونگٹی	گلگو منالی

رگیانق	چین
مون یُل	شمالی ہندوستان
لھایُل	لدّاخ
یَل یُل	بھوٹان
لُھویُل	سکّم
خوریُل	چینی و روسی ترکستان
خیویُل	ختن
دردستان	چیلاس
گوقیول	چترال

اور ایران قابلِ ذکر ہیں۔ اس طرح زمانۂ قدیم سے مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگ آ کر یہاں آباد ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ اُن کی نسلیں آپس میں ملتی گئیں۔ ماسوائے سات سے دس فی صد شین اور دارد نسل کے باقی سب لوگ مشترکہ طور پر بلتی زبان بولتے ہیں۔ اسی طرح ان سب نے مل کر ''بلتی تہذیب'' تہذیب کے نام سے ایک مخصوص اور زرخیز تہذیب کو جنم دیا اور اقوامِ عالم میں بلتی قوم کے نام سے منفرد تشخص اور پہچان قائم کر لی۔

بلتستان زمانۂ قدیم سے نسلی، جغرافیائی اور لسانی اعتبار سے تبت کا حصہ رہا ہے اور تاریخ کے کتابوں میں کئی دیگر ناموں کے علاوہ تبتِ خورد کے نام سے مذکور ہوا ہے۔ تاریخِ رشیدی کے مطابق بالتی باشندوں کو بالتی پہ کہتے تھے یہی بالتی بعد میں ''بلتی یُل'' بن گیا اور زبان کا نام بھی بلتی پڑ گیا۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ تبت کے علاقوں کی تہذیب انتہائی قدیم ہے لیکن کئی جغرافیائی و معاشرتی عوامل اس کے نسلی پھیلاؤ میں سدِ راہ بنتے رہے۔ ایک تو اس کوہستانی علاقے میں موسمی شدت اور زرخیز اراضی کی قلت کی وجہ سے لوگ وقتاً فوقتاً تلاشِ معاش کے لئے دیگر ممالک کی طرف نقلِ مکانی کرتے رہے جیسا کہ ترکستان، یارقند، کاشغر، گلگت، ہونزہ نگر، کشمیر اور شمالی ہندوستان کے شملہ منسوری، ڈیرہ دون، ننی تال، بال گنج، وغیرہ میں بلتی النسل کے لوگ آباد ہو کر مقامی رنگوں میں رنگتے رہے۔

اس کے علاوہ ایک طرف بیرونی و اندرونی جنگ و قتال اور دوسری طرف ماضی میں اس علاقے میں بار بار چیچک کی وبا، سیلاب اور برف کے تودوں کی نذر ہو کر یہاں کی آبادی گھٹتی رہی۔ اس کے علاوہ ناقص غذا بھی افزائش نسل میں رکاوٹ بنتی رہی۔ اسی لئے ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق وزارتِ لداخ کے زیرِ اہتمام زیرِ انتظام تحصیل اسکردو کی آبادی ایک لاکھ چھ ہزار سات سو پچانوے ۱۰۶۷۹۵ تھی۔ جبکہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق ایک لاکھ دو ہزار سات سو پینتالیس ۱۰۲۷۴۵ یعنی دس سالوں کے بعد آبادی میں اضافہ ہونے کے بجائے چار ہزار پچاس ۴۰۵۰ نفوس کی کمی ہو گئی تھی۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری رپورٹ میں ایک

لاکھ سات ہزار چار سو ستر ۷۴۷۰ ارنفوس دکھائے گئے ہیں۔ یعنی بیس سالوں کے بعد بھی آبادی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اس ضمن میں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ تبت اصلی اور لداخ بدھ مت کی رسم کثیر الشوئی "Polyandry" کے باعثِ افزائش نسل نہ ہو سکی جس کا رواج ان علاقوں میں اُس وقت موجود تھا۔

اس وقت بلتستان کی آبادی تقریباً 20 لاکھ سے کچھ زائد ہے جو مختلف نسلی گروہوں اور تہذیبوں سے وابستہ ہیں۔ اس کے علاوہ کم وبیش ایک لاکھ کی آبادی حصول تعلیم اور تلاشِ روزگار کے سلسلے میں پاکستان کے شہروں کراچی، راولپنڈی، کوئٹہ، لاہور، ملتان، ساہیوال، سرگودھا، پشاور اور گلگت کے علاوہ بیرونی ممالک یعنی ایران، سعودی عرب، کویت، دوبئی، لبنان، لندن، کنیڈا اور ٹورنٹو کے علاوہ جاپان کے شہر "ٹوچے شی ناگاٹا ٹو" میں منتقل ہوئی ہے۔ یہ لوگ سرکاری اعدادوشمار میں بلتستان کی آبادی میں شامل نہیں ہے۔

قدیم راجگی دور میں بلتستان کے لوگ بہت سے مختلف معاشرتی طبقات میں بٹے ہوئے تھے۔ جن کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ اس زمانے میں کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور شادی بیاہ کے معاملے میں امراء اور عوام الناس میں وہی طبقات سدِ سکندری حائل تھی جسے ہندو لوگ ذات پات کہتے ہیں۔ مگر اس حد تک بھی نہیں کہ ایک دوسرے کو نجس کہنے لگے یا نجس سمجھیں۔ بلتستان میں اشاعتِ اسلام کے علاوہ راجگی نظام حکومت کی برطرفی کے بعد اس طبقاتی نظام میں کم وبیش تبدیلیاں ظہور پذیر ہو گئیں اور ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہندوستان کے بعد سے ان کا وجود اب ختم ہونے کو ہے۔ اب اس علاقے میں طبقاتی درجہ بندی کا کوئی تصور نہیں۔

یہ اسلامی بھائی چارہ اور مساوات کی بنیاد پر بلتستان کے معاشرے پر ایک دوسرے سے شادی بیاہ بھی کر لیتے ہیں اور بلا تفریق مل جل کر رہتے ہیں۔ یوں یہ نسلی گروہ آپس میں اس حد تک گھل مل گئے ہیں کہ ان کا اب امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ اب جبکہ قدیم تاریخی کتب، لسانی تفاوت اور مقامی روایات اور ذاتی تجربات ومشاہدات کی روشنی میں ہم بلتستان میں بسنے والے بعض اہم اور تاریخی قابلِ ذکر نسل گروہ اور قبایل کے بارے

میں معلومات فراہم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

"منگول" (Mangol): بلتستان میں بسنے والا سب سے قدیم اور اکثریتی گروہ "منگول"، یعنی تاتاری ہے جس کی کُل آبادی تخمیناً ساٹھ سے ستّر فی صد کے درمیان ہے۔ یہ لوگ اس علاقے کے ابتدائی آبادکار اور باشندے بتائے جاتے ہیں۔ ان کو منگول کی ذیلی شاخ "تبتّی" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نسل پورے بلتستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں کی بولی تبتّی زبان کی ایک شاخ ہے۔ منگول ہوتے ہوئے بھی ان کی جسمانی خصوصیات تبّت اور لدّاخ والوں سے بہتر اور مضبوط ہیں۔ مشہور انگریز محقق فریڈرک ڈریو کا خیال ہے کہ بلتستان اور تبت کے تاتاریوں کے خدوخال میں فرق علاقائی آب وہوا اور مذہب کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ لدّاخی مورخین کے مطابق تبتّیوں نے معلوم انسانی آبادی کو پانچ بڑی نسلوں (۱) چینی، (۲) منگول، (۳) ایرانی، (۴) ہندوستانی، (۵) تبتّی نسلوں میں تقسیم کیا ہے لیکن بلتیوں کو تبتّی نسل میں شامل نہیں کیا ہے اور انہیں ایرانی نسلی گروہ میں شامل سمجھا ہے۔ باوجود یہ کہ یہ لوگ تبتّی زبان بولتے ہیں اور اشاعتِ اسلام سے قبل تبتّی وثقافتی روایات کے حامل ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ مفروضہ یقیناً اشاعتِ اسلام کے بعد پیدا ہونے والے فاصلوں کی وجہ سے قائم کیا گیا ہے کیونکہ یہ ایک مُسلمہ حقیقت ہے کہ بلتستان اور تبت کے لوگوں کے درمیان ابتدائے آفرینش سے مضبوط نسلی، لسانی، مذہبی، سماجی اور سیاسی رشتے استوار تھے جیسے آج کل بھی حقائق کے ساتھ ساتھ داستانِ کیسر سننے سنانے سے لسانی اشتراکیت اور دیگر قدیم تہذیب وثقافت کی وجہ سے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ ان کا قدیم مشترکہ مذہب "بون چھوس" کہلاتا تھا۔ گویا بلتستان کی تہذیب کا بنیادی ڈھانچہ تبتّی تہذیب ہے۔ تبتّی نسل کے لوگوں کی رنگت کالے پر زردی مائل، گول چہرے کے ساتھ چھوٹی اور کھچی ہوئی گول آنکھیں، قدرے چپٹی ناک اور رخسار کی ہڈیاں قدرے اُبھری ہوئی ہوتی ہیں۔ داڑھی کے بال بہت کم ہوتے ہیں اور ان کا قد اوسط درجہ کا

ہوتا ہے۔ ماہرینِ بشیریات کا خیال ہے کہ انسانی شکل پر نسلی امتیازات کے علاوہ آب وہوا بھی اثر انداز ہوا کرتا ہے۔ جیسا کہ بلتستان کے شمال میں قراقرم کی طرف بسنے والے تبتی نژاد کی شکل وصورت ٹرانس ہمالیہ کی جانب بسنے والوں سے قدرے مختلف ہے۔

مُون (Mon): تبتی اصطلاح میں ہندوستان کے ایک مخصوص خطے کو (مون یُل) یعنی موسیقاروں کا وطن کہتے ہیں۔ لداخ اور بلتستان کے مُون شمالی ہندوستان کے ہندو آریہ تھے جو ۱۲۵ء یا ۱۵۲ء میں جالندھر میں منعقدہ چوتھی بدھی کونسل سے فوراً قبل یا بعد میں ہزاروں کی تعداد میں بدھ مت کی تبلیغ کے لئے آئے اور اس علاقے کو اپنا مسکن بنایا۔ ان کی نسل اب بھی بلتستان کے تقریباً اکثر گاؤں میں آباد ہے۔ کچھ عرصہ یہ لوگ پیشے کے اعتبار سے موسیقار تھے جن کو بلتی معاشرے میں کمتر طبقہ سمجھا نے لگا تو اُنہوں نے اپنا پیشہ ترک کردیا اور دیگر لوگوں میں تحلیل ہو گئے۔ اب ان کا تشخص تقریباً مٹ چکا ہے البتہ محققین کے مطابق بعض خاندان اور دیہاتوں کے نام آج بھی "مون" کے نام یا مناسب سے پہچانے جاتے ہیں یہ لوگ قد کے میانے رنگ کے کالے اور ہندوستانی چہرے اور اُونچی ناک کے حامل ہوتے ہیں۔

"بُروشو" (Brosho): دسویں یا گیارویں صدی عیسوی میں شین درد لوگ چلاس اور کوہستانی شنا کی علاقے بروشال سے گلگت کی طرف بڑھے جہاں پہلے سے بروشو المعروف پشکن قبائل آباد تھے جو نسل کے اعتبار سے تورانی بتائے جاتے ہیں۔ ان کی زبان بروشکی کہلاتی تھی جو آج ہونزہ نگر میں بولی جاتی ہے۔ گلگت بروشال میں نو وارد شینوں کی بالادستی کے باعث بروشو پشکن دور دراز علاقوں میں ہجرت کرنے لگے اور ان میں بعض رفتہ رفتہ براستہ ہسپر (Hisper) بلتستان وارد ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق اس دوران نگر کا راجہ "چا تھم" ہونزہ کے راجہ 'مغلوٹ' (Maglot) کے حملے سے مغلوب ہو کر شگر جا پہنچا اور وہاں اس نے مقامی راجہ "مشیڈ" (Mishid) کو قتل کردیا اور رعایا کے ساتھ گھل مل کر اثر ورسوخ پیدا کیا اور جلد ہی تختِ شگر پر متمکن ہوا۔ یہ خاندان آج بھی "اماچا"

(Amacha) کہلاتا ہے جو کہ ۱۸۴۰ء میں راجگی نظام ڈوگروں کی ہاتھوں برطرفی تک ''شگر'' (Shigar) پر حکومت کرتا رہا۔ بعض موزخین کا خیال ہے کہ اس خاندان کے بانی کا تعلق دراصل ختن سے تھا، جو ''نگر'' (Nagr) سے ہوتا ہوا شگر وارد ہوا اور کہتے ہیں کہ ''ختن'' کے حکمران خاندان کا نام ''اماتیا'' (Amatia) ہے۔ عین ممکن ہے کہ لفظ ''اماچا'' اس کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔ محققین کا خیال ہے کہ بلتستان کے تقریباً ہر گاؤں میں کم و پیش چند ایک ''بروشو'' (Brosho) خاندان موجود ہیں لیکن شگر "Shigar" اور "Rungdu" اندو کی وادیوں میں ان کی تعداد کچھ زیادہ بتائی جاتی ہے۔ اسا نسلی گروہ سے تعلق رکھنے والے لوگ بلتستان میں طویل ترین مدت گزر جانے کے باوجود تبتی تہذیب میں مکمل طور پر مدغم ہو چکے ہیں۔ البتہ قیامِ پاکستان کے بعد منتقل ہونے والے ہُنزہ کے ''بروشال'' خاندانوں میں جو اسکردو شہر میں آباد ہیں اب تک کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ ''بروشو'' نشاد اکثر درازقد سُرخ چہرہ، اُونچا ماتھا، قدرے سنہرے بال، کہیں کہیں نیلی آنکھیں، اونچی اور موٹی ناک اور بیضوی چہرے رکھتے ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ لوگ درد قبائل ہو سکتے ہیں۔

''شین دارد'' (Shin Dard): بلتستان میں آباد ایک نسلی گروہ ''بروکھپا'' کہلاتا ہے۔ یہ لوگ دراصل ہند آریائی نسل کے شین دارد ہیں۔ یہ گروہ بلتستان کے علاقے کھرمنگ سے لے کر رندو کی آخری سرحد تک دریائے سندھ کے جنوب کی طرف کوہ ہمالیہ کے بالائی علاقوں میں یعنی ایک ہی رُخ پر آباد ہیں۔ تواریخ اور لوگ گیت، روایات اور مشاہدات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ تین ادوار میں بلتستان آپہنچے۔ دسویں یا گیارہویں صدی عیسوی میں جب ہزاروں شین (Shin) قبائل اپنے مال مویشی کے ساتھ چراگاہوں کی تلاش میں منتقل ہوئے تو ان طوائفوں میں بعض بلتستان کے علاقہ روندو، بشو، فلتوکس، کھرمنگ اور دراس کے علاقوں میں گھس کر رہنے لگے۔ مگر اکثر گروہ اپنے لئے بالائی علاقوں میں الگ دیہات میں خانہ بدوش زندگی بسر کرنے لگے۔ چونکہ تبتی زبان میں

پہاڑی بالائی علاقے کو "بروکھ" (Buroq) کہتے ہیں اس لئے انہیں "بروکھپا" (Buroq Pa) یعنی بالائی علاقوں کے باشندے کہا جانے لگا۔ وارد قبائل کے ان دیہات میں آج بھی کم وبیش دردی تہذیب وتمدّن محفوظ ہے۔ البتہ بشو کے علاقوں میں اب یہ تفریق آہستہ آہستہ مٹ چکی ہے۔ مگر دراس، داہ ہنو، گرکون، اچناتھنگ کے علاوہ بہت سے دیہات میں اپنی مخصوص پہچان بنائے ہوئے ہیں۔ شین قبائل کی بلتستان میں آبادی کا دوسرا دور سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں شروع ہوا جب بلتستان کے عظیم الشان حکمران علی شیر خان انچن، شیر شاہ، شاہ مراد اور علی شاہ نے یکے بعد دیگرے گلگت۔ چترال اور چیلاس وغیرہ فتح کرنے کے بعد وہاں سے بے شمار قیدیوں کو اپنے ساتھ لاکر بلتستان کے جنوبی علاقوں کی وادیوں میں آباد کیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے بہت سے قبائل پچھلی دو تین دہائیوں میں تجارت کی غرض سے ان علاقوں میں آکر آباد ہو گئے۔ اگر چہ یہ تینوں شین (Shin) قبائل ایک دوسرے کی روایات اور زبان میں مقامی رنگ کی آمیزش سے قدرے اختلاف رکھتے ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر ان کی مادری زبان "شیناء" ہے جو آج بھی بولی جاتی ہے۔ البتہ ضرورت کے موقعے پر یہ لوگ بلتی زبان (Balti Language) بھی قدرے غیر شستہ طور پر بول لیتے ہیں اور ان کی تہذیب وتمدّن اور طرزِ معاشرت تبتیوں سے بالکل مختلف ہے۔ اپنے اصل وطن سے ہٹ کر تبتی معاشرے میں طویل ترین مدت سے رہنے کے باوجود یہ لوگ عباقد، خربہ جسم، سیاہ بال اور ایک الگ نسل کے ہیں۔ اس نسل کے بروکھپا لوگ عباقد خربہ جسم سیال بال اور بڑی سیاہ آنکھیں اور اونچی ناک کی وجہ سے بڑے خوش رو لگتے ہیں مگر ان کی رنگت دوسرے دردوں کی طرح زیادہ سفید نہیں جو یقیناً آب وہوا کی وجہ سے ہے۔ یہ لوگ تند خو، لڑاکو اور باضمیر ہوتے ہیں اور باتیں ہمیشہ اونچی آواز میں کرتے ہیں۔

"خور یا ہور" (Khor Or Hor) قدیم مورّخوں، جغرافیہ دانوں سے ترکِ وطن کر کے بہت سے قسمت آزمائی کے لئے بلتستان کی طرف نکل آئے اور یہ لوگ قراقرم کے بالائی علاقوں مثلاً شگر اور خپلو کے شمال مشرقی علاقوں میں آباد ہو گئے۔

"یبگو" (Yabgo): "یب" تبتی زبان میں باپ کو کہتے ہیں اور "گو" سنسکرت زبان میں آگے کو کہتے ہیں۔ مطلب "باپ آگے"۔ اس خاندان نے چپلو، چھور بٹ اور کیریس پر تقریباً سات سالوں تک حکومت کی۔ اس خاندان کے بارے میں مورخین کی رائے الگ الگ نظر آتی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یبگو ریاست تخارستان کے حکمران کا لقب تھا جو بلتی یا دیگر قبائل پر غالب آکر حکمران بنا۔

الحاج مولوی حشمت اللہ خان لکھنوی مرحوم نے اپنی تاریخِ جموں و کشمیر میں اس خاندان کو سکندر اعظم کی اولاد ثابت کیا ہے۔ اس حساب سے آج کے چپلو کے راجہ یبگو محمد ذکریا خان سے 156 پشتوں میں جا کر سکندر اعظم سے جا ملتا ہے۔ ان کا شجرۂ نسب آگے آئے گا۔ یبگو خاندان کی آنکھیں بڑی، رنگ سیاہ مائل، قدرے درمیانہ قد کے ہوتے ہیں۔ اس خاندان کے چند گھرانوں پر مشتمل افراد ترتک میں آباد ہیں جو اس خاندان کے بزرگوں کے مطابق دسویں پشت میں چپلو کے راجہ یبگو فتح علی خان سے جا ملتا ہے۔

"کشیری": بلتستان کا ایک واضح نسلی گروہ کشمیری ہے جو مقامی اصطلاح میں کھچے (Khache) کہلاتا ہے۔ ان کی آبادکاری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے سولہویں صدی اور سترہویں صدی کے دوران مقپوں حکمرانوں نے سینکڑوں کشمیری معماروں، سنگ تراشوں، نائیوں، سناروں، جولاہوں، بڑھیوں اور لوہاروں اور دیگر ہنرمندوں کو بلتستان میں لاکر آباد کیا۔ اس کے بعد سینکڑوں تجار اور سرکاری ملازم ڈوگرہ دور حکومت میں وقتاً فوقتاً یہاں آباد ہوتے رہے ہیں۔ ان کشمیریوں نے بہت سی رسومات بالخصوص شادی بیاہ کی تقریبات، کشمیری کھانوں، زیورات اور متعدد فنونِ لطیفہ کو یہاں مروّج کیا۔ کشمیری نسل کے لوگ بلتستان کے کئی بڑے دیہات اور قصبوں مثلاً اسکردو میں سکمیدان، رنگا، رگیائیل، آستانہ، کھرمنگ خاص، مہدی آباد اور شگر خاص میں کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اسکردو کے سکمیدان اور رنگا میں کشمیری نسل کا واضح تشخص اب بھی برقرار ہے۔ رنگا میں اس وقت بھی کشمیری زبان رائج ہے لیکن سکمیدان میں اب پچھلی نصف صدی

سے یہ زبان متروک ہوچکی ہے اور یہاں بلتی زبان بالی جاتی ہے۔ البتہ رسومات اور طرز معاشرت کے اعتبار سے یہ لوگ اب بھی کشمیری روایات و آداب کے سخت پابند ہیں۔ یہ کشمیری لوگ اکثر قد آور اور فربہ جسم کے ساتھ لمبا چہرہ، کھڑی اور لمبی ناک رکھتے ہیں۔

''سادات'': بلتستان میں ایک خاص تعداد آبادی سادات کی ہے جن کا تعلق حسینی، موسوی، زبدوی اور رضوی خاندانوں سے ہے۔ لہٰذا نسلاً تو یہ عربی کہلائیں گے۔ لیکن یہ لوگ طویل ترین مدّت سے ترکِ وطن کر کے تبلیغ اسلام کے لئے بلتستان تشریف لے آئے۔ اس لئے ان میں عربی اور عجمی اور کشمیری تینوں رنگ موجود ہیں۔ اگر چہ یہ زبان اور طرزِ معاشرت کے اعتبار سے مقامی تہذیب و تمدّن میں مدغم ہو چکے ہیں تاہم ان کا الگ مقام اور تشخص برقرار ہے۔ یہ طبقہ بلتستان میں سب سے زیادہ محترم اور معزز سمجھا جاتا ہے۔ بلتی معاشرے کو مہذب و مودّب بنانے میں اس طبقے کا بڑا کردار رہا ہے۔ ان کا بنیادی پیشہ درس و تدریس اور اسلام کی تبلیغ کرنا ہے۔ اس طبقے نے اسلامی درس و تدریس کے ذریعے بلتی زبان میں کم و بیش بیس فی صد الفاظ عربی و فارسی کے شامل ہیں۔ بلتستان کے تقریباً ہر گاؤں میں کچھ نہ کچھ گھرانے سیّدوں کے ضرور ہونگے۔ اس خاندان کے افراد دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد سیاہ عمامہ اور عبا دنما قبا پہنتے ہیں۔ تُرتُک کے قریبی گاؤں بغدانگ میں رضوی خاندان کے سیّد زادوں پر مشتمل چند مخصوص گھرانے موجود ہیں جن کے جدامجد حضرت سیّد ابراہیم شاہ مرحوم نے تُرتُک علاقے کے نونہالانِ قوم کی علمی تشنگی کو سیراب کیا۔ لہٰذا ابراہیم شاہ مرحوم کے خاندان کا ہر فرد قابلِ صد احترام ہے۔ مذکورہ گاؤں بغدانگ ۱۹۷۱ء سے قبل ہندوستان کے زیر انتظام جموں و کشمیر کا حصہ تھا اور آج بھی ہے۔ مگر علاقہ تُرتُک ۱۹۷۱ء سے قبل پاکستان کے زیر انتظام مقبوضہ گلگت وبلتستان کا حصہ تھا۔ ۱۹۷۱ء کے بعد ہندستانی کشمیر کا حصہ ہے۔

''مقپون'' (Maqpon): کا ایک نامور حکمران رہا ہے۔ جس کی سلطنت کی سرحدیں چترال سے لے کر تبت اور ماپھم ژھو تک پھیلی ہوئی تھیں۔ مورخین کے مطابق

۱۱۹۰ء سے ۱۸۴۰ء تک بلتستان پر اس خاندان کی حکومت رہی۔ خانوادہ مقپون کا بانی ابراہیم شاہ تھا جو جان بڈلف (۱۴) اور بنات گل آفریدی (۱۵) کے بقول نسلاً مصری تھا جس کی تائید بعد کے مورخین نے بھی کی ہے۔ جبکہ بعض لوگ ابراہیم شاہ کے کشمیری یا ایرانی النسل ہونے کا بھی دعویٰ کرتے ہیں۔ (۱۶) اس خاندان کے اکثر لوگ نہایت خوش شکل، سفید جلد اور میانہ قد کے ہیں۔ اس خاندان کی شاخیں سکردو خاص کے علاوہ کواردو، گمبہ سکردو، شگری بالا، حین آباد، کھرمنگ خاص، طولتی، کھرمنڈیا نگ، رندو، استور اور گوپس میں آباد ہیں۔

''چترالی'' (Chatrali): بلتستان کے مقپون حکمران علی شیر خان انچن (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۴ء) نے چترال تک کا سارا علاقہ فتح کیا اور جو قیدی اس کے ساتھ آئے وہ بلتستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہوئے۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً چترالی طائفے یہاں وارد ہوتے رہے۔ بلتی بزرگوں کے مطابق چترال کو قدیم تبتی روایات میں ''گوق یل'' (Goq Yul) کہتے تھے اور یہاں چترالی نژاد پائے جانے کا ثبوت اس بات سے مل جاتا ہے کہ بلتستان کے بعض خاندان گوق پا (Goq Pa) کے نام سے موسوم ہیں اور ان کا دعویٰ بھی یہی ہے کہ ان کے آباواجداد چترال سے یہاں آئے تھے۔ (۱۷) چونکہ اس نسلی گروہ کی آبادی یہاں بہت قلیل ہے اس لئے ان کا الگ کوئی تشخص نہیں۔

''پٹھان'': پشاور کے پٹھان قبائل تقریباً نصف صدی سے زائد عرصے سے کاروبار کے سلسلے میں بلتستان میں آکر آباد ہوئے۔ اب ان کی اولاد سکردو شہر خاص اور شگر میں کئی خاندانوں پر مشتمل ہیں اور مقامی بلتی معاشرے میں گھل مل چکے ہیں۔ ان کا چہرہ اپنی نسلی تشخص کا واضح ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے بیس، تیس سالوں کے دوران تجارت کی غرض سے آنے والے پٹھانوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوا ہے اور یہ لوگ بلتی معاشرے سے الگ تھلگ ہیں۔

گزشتہ پچاس سالہ تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ علاقۂ طور تک میں درختان ثمر دار اور دیگر نباتات دوگنے سے زیادہ ہوگئے ہیں۔ اسی مقدار میں اضافہ نہ صرف علاقۂ طور تک

میں ہوئے ہیں بلکہ پورے لدّاخ بلتستان اور بالاورستان خطے میں بھی ہو گئے ہیں۔ اس لئے رواں سال میں مون سون بادلوں نے پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ خصوصاً لدّاخ میں بادل پھٹنے کا الم ناک واقعہ پیش آیا اور بے پناہ مالی وجانی نقصان ہوا۔ اس مون سون نے تُرتُک میں موجود آرمی کیمپ کو اپنی لپیٹ میں لیا اور تباہ و برباد کردیا۔ رات کے اندھیرے میں آنے والے اس طوفانی سیلابی رو نے تقریباً ۳۴ کے قریب نوجوانوں کو ہلاک کردیا۔ اس طرح علاقہ تُرتُک میں فصلوں سمیت بہت سے کھیت، ثمر دار اور غیر ثمر دار درختوں کو تباہ و برباد کرنے کے علاوہ بہت سارے پل بھی سیلابی ریلہ بہا لے گیا۔ لدّاخ و بلتستان کے بزرگوں کے بیان کے مطابق پورے بلتستان کی پچاس سالہ تاریخ شاہد ہے کہ اس علاقے میں اس قسم کی تباہ کن مون سون بارش سے سیلاب آنے کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ جبکہ ضلع لدّاخ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ضلع لداخ دُنیا کا رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا واحد ضلع ہے۔ اس کی پہاڑی چراہ گاہوں اور چانگ تھنگ کھلے میدانوں میں بھیڑیں اور پشمینہ بکریاں، یاک اور زمو، زو پالنے والوں کو اس بارش سے گھاس کی بہتات ہونے سے لوگوں کو خوشی ہوئی تا کہ ان کے جانور نشو ونما پا سکیں۔

خصوصاً تُرتُک اور کرگل کے ان علاقوں جو سطح سمندر سے ۱۳ ہزار فٹ سے پندرہ ہزار فٹ تک میں جو خودرو نباتات ہیں مثلاً شوکپا، ستقپا، ڈُنڈوس، شیت، سیا، اسکوتا و دیگر قدرتی نباتات موجود ہیں، کی خوب نشو ونما ہوئیں۔

یہ سب گلوبل وارمنگ کا نتیجہ ہے۔

☆☆☆

☆......نذیر آزاد

کشمیر کی اُردو شاعری میں کشمیر

شعر کتنا ہی آفاقی کیوں نہ ہو اس میں مقامیت کی بُو باس ضرور ہوتی ہے۔ اب یہ شاعر کے اسلوب پر منحصر ہے کہ وہ مقامیت یا علاقائیت کو خبر یا تبصرہ کے طور پر پیش کرے یا اس میں تخلیق کا رنگ بھر دے۔ گوپی چند نارنگ کی اس بات سے تقریباً سب کو اتفاق ہے کہ اُردو شاعری میں کربلا ایک استعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن اس آفاقی استعارے کو بھی انیسؔ و دبیرؔ سے لے کر وحید اختر اور پھر ہمارے زمانے کے شعراء نے مقامی حوالے سے دیکھا اور برتا ہے۔ قدیم اُردو شاعری میں اسلامی تہذیب کے بوقلموں عکس، ہندوستانی صنمیات کے جلو میں در آئے ہیں اور اس طرح ہند اسلامی تہذیب متشکل ہو پائی۔ یہ مقامیت ہر دور کے شاعروں کے یہاں پوری تابنا کی کے ساتھ موجود ہے۔ میرؔ و مصحفیؔ نے لکھنو کی گلیوں اور دِلی کے کوچہ و بازار کی تصویر کشی کی ہے اور اقبالؔ کے کلام میں اسلامی شعار کے شانہ بہ شانہ ہندوی شعائر رواں دواں ہیں۔ ترقی پسندی اور جدیدیت نے ہر چند کہ بعض آفاقی اصول مرتب کیے لیکن اُنہیں مقامی حوالوں سے مفر حاصل نہیں ہوسکا۔ یہ مقامیت کہیں بقول نثار احمد فاروقی کوچہ و بازار کی زبان میں ظاہر ہوئی ہے تو کہیں بقولِ وہاب اشرفی وہ مخصوص کلچر ہے جس کے بطن سے قدیم شاعری پیدا ہوئی۔

آج کل کے زمانے میں مابعد جدید تنقیدی روّیے نے شعر کے ساتھ مقامیت اور علاقائیت کا رشتہ قائم کر کے اسے مخصوص سماجی، سیاسی اور تمدنی آئیڈیالوجی کے تناظر

میں دیکھنے کی ضرورت کو اُجاگر کیا ہے۔ چنانچہ مابعد جدید نظریہ ساز لیوتاڑ، ہبرماس، ہُسرل اور فوکو وغیرہ اس بات کے قائل ہیں کہ ایسے تمام مرکزی تصورات جن کی حیثیت "مہابیانیہ" کی ہے، قابلِ تردید ہیں۔ لیوتاڑ ایسی یکسانیت سے ٹکرانا چاہتا ہے جو کہ کسی عالمی پیمانے کی داعی ہو۔ اُن کے یہاں تکثیر کی زبردست اہمیت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ "مہابیانیہ" چھوٹی چھوٹی خوبصورتیوں کو برباد کرتا ہے جبکہ تکثیریت زندگی کی اصل روح ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی خوبصورتیاں مقامی تہذیب و تمدّن میں مِل سکتی ہیں اور تکثیریت ایک ہمہ پہلو (Heteriogenious) دُنیا کی تشکیل کرتا ہے۔

کشمیر بھی عالمی تناظر میں اپنی تہذیب، شناخت اور آئیڈیالوجی رکھتا ہے جس کا حوالہ نہ صرف کشمیری شعر و ادب میں بلکہ دُنیا کی کئی دوسری زبانوں میں مِلتا ہے۔ ان زبانوں میں سنسکرت، فارسی، انگریزی اور اُردو شامل ہیں۔ ان زبانوں کے ادب میں کشمیر ایک سیاسی، سیاحتی اور تمدّنی موضوع کی حیثیت میں موجود ہے۔ ان زبانوں کے قارئین اسے اپنے آئیڈیالوجی کے نکتہ نظر سے دیکھتے ہیں اور (بسا اوقات) اس کی جُداگانہ تفہیم کرتے ہیں۔ آٹھویں صدی کے سنسکرت اچاریہ دامودر گپت نے "کٹنی مہاتم" لکھ کر اُس وقت کے کشمیر کی جمالیات کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ ساتھ خانگی امور کی ناہمواریوں کو شعری روپ میں پیش کیا۔ انیسویں صدی کے انگریز ادیب تامس مُور نے ۱۸۱۷ء میں لالہ رُخ لکھ کر اُس جذبے کے تحت کشمیر کو دیکھا جو کہ اُس زمانے میں مغرب میں موجود تھا۔ فارسی اور اُردو میں کشمیر کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔ فارسی شاعر عرفی کے "گر مرغِ کباب است و بابال و پر آید" سے لے کر مغل تاجدار جہانگیر کے "اگر فردوس بہ روئے زمین است" تک اور میر کے "دِل کے دُنیا میں رہو مثلِ حروف کشمیر" سے لے کر غالب کے "جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں" تک یا پھر اقبال کے "قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند" سے لے کر چکبست کے "راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے" اور حفیظ جالندھری کے "ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کشمیر کی تصویر کا" تک سب یا تو کشمیر کے جمال کی

تعریفیں ہیں یا یہاں کی زبوں حالی کے نوحے۔لیکن ایک بات طے ہے کہ یہ تمام تخلیقی سروکار اُن شاعروں کے ہیں جو کہ ایک الگ آئیڈیالوجی کے حاصل ہیں اور وہ اس تاریخی ربط اور تمدّنی تسلسل کا حصہ نہیں جس سے کشمیر کی تشکیل ہوئی ہے۔اِس کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ کشمیر میں تخلیق ہونے والی اُردو شعریات کے پس منظر میں یہی فارسی، اردو اور سنکرت شعری روایت موجود ہے۔

مابعد جدید نظریہ ساز سوسیٹر نے پتے کی بات کہی ہے کہ انفرادی عناصر کی معنویت ایک پورے نظام کی ساخت پر مبنی ہوتی ہے۔جس طرح کسی گاؤں، قبیلے اور فرد کے رسوم رواج، عادات اور خصائل کی تلاش ایک معینہ سسٹم کے تحت ہوتی ہے۔اسی طرح زبان کا ایک مخصوص نظام ہوتا ہے جو کہ اس کے مخصوص کلچر میں تلاش کیا جاسکتا ہے گویا کہ ادب و کلچر کے لاتعداد ثقافتی مراکز میں محفوظ ہوتا ہے اور نتیجے کے طور پر تاریخ کے مختلف ادوار میں تخلیق کئے جانے والے متون مربوط ہوتے ہیں۔

ابتداء میں کشمیر کی اُردو شاعری میں کشمیر کا حوالہ اُسی روایتی انداز میں ہوا ہے جس طرح فارسی شاعری میں طہران و مشہد اور بیرون ریاست کی اُردو شاعری میں دلّی اور لکھنو موجود ہے۔کشمیر میں اُردو شاعری کے روزِ اوّل سے ہی کشمیر کی روح اس میں بول رہی ہے۔ بعض محققین کے مطابق کشمیر میں اُردو سترھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں داخل ہوئی۔ اقبال ناتھ ونپوہ نے سترھویں صدی کی سنت شاعرہ روپہ بھوانی کے اشعار میں ہندوی الفاظ کا سُراغ لگایا ہے لیکن مورخ حسن کھویہامی نے کشمیر کے آخری چک حکمران یوسف شاہ چک کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ فارسی کے علاوہ کشمیری اور ہندوی میں بھی شعر کہتے تھے۔اگرچہ یوسف شاہ چک کے ہندوی اشعار کا ابھی تک کوئی سُراغ نہیں مِل سکا ہے لیکن پروفیسر عبدالقادر سروری نے چک کے ہم عصر خواجہ مومن جبّل کا یہ شعر نقل کیا ہے جس میں نہ صرف ہندوی کی طرف اُن کی رغبت کا اظہار ملتا ہے بلکہ اِس میں کشمیر کا واضح حوالہ بھی ہے۔

او بادِ صبا اوتر گر گزری دیوہ سر
از من خبری نیز بہ آں دلبر

کشمیری و فارسی اگر گوش نہ کرد ہندلیس بگو کہ اوتر مراتر

ڈوگرہ عہد حکومت میں جبکہ ریاست میں اُردو کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوئی تو نہ صرف اُردو کی ترویج و اشاعت کے امکانات روشن ہو گئے بلکہ کشمیر نے یہاں کی اُردو شاعری میں مستقل موضوع کی حیثیت حاصل کی۔ اُس زمانے میں بیرونِ ریاست کے اُردو مشاہیر کی بڑی تعداد وارِدِ کشمیر ہوئی جن میں ہرگوپال خستہ، صادق علی خان، راجہ شیر علی خان، خوشی محمد ناظر، قیس شیروانی، فوق وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے کشمیر کے تعلق سے اُردو ادب میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہاں کے مقامی شعراء کی بڑی تعداد نے اُردو کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس ضمن میں ۱۹۴۱ء میں قائم ہونے والی ترقی پسند لیگ اور ۱۹۴۶ء میں شروع ہونے والے حلقۂ اربابِ ذوق کا عمل دخل ہے۔ ابتداء میں یہاں کے مقامی اردو شعراء نے فارسی/ہندوی روایت کے مطابق یا تو کشمیر کے حسن و جمال کو موضوع بنایا یا یہاں کے لوگوں کی زبوں حالی کی تصویر کشی کی۔ ان شعراء میں شہ زور کاشمیری، نندلال کول طالب، غ۔م۔طاؤس، غلام علی بلبل، غلام احمد مہجور، تنہا انصاری، میر غلام رسول نازکی، فاضل کاشمیری، عبدالحق برق، سیفی سوپوری، قیصر قلندر، اکبر جے پوری، شہزادی کلثوم وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر شعراء جب عروسِ سخن کی طرف مائل ہوئے تو ہر طرف ترقی پسندی کا غلغلہ تھا۔ شہ زور کی نظمیں "وادی کشمیر"، "شالامار باغ"، "شفق جھیل ڈل کے کنارے"، وغیرہ کشمیر کے تعلق سے روایتی اور رسمی نظمیں ہیں لیکن بقول سروری وہ مناظر سے گزر کر روحِ کشمیر تک پہنچنے کی کوششیں کرتا ہے۔ اسی طرح غ۔م۔طاؤس کی نظم "چندہ ہار" حفیظ جالندھری کی نظم "ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا" کی توسیع ہے۔ ان میں کشمیر میں پھیلی ہوئی بے بسی، لاچاری اور مظلومی کے نوحے ہیں۔ ان نظموں میں یہاں کی صدیوں سے روندھی ہوئی ثقافت کراہتی نظر آتی ہے۔ تنہا انصاری نے روحِ عصر کو کربلا کے عظیم استعارے کی روشنی میں استعمال کر کے اس میں آفاقی رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ فاضل کاشمیری کا رسالہ "اپنے وطن میں" ایک طرف کشمیری کے لاثانی حسن کا قصیدہ ہے تو دوسری طرف کشمیر میں موجود

طبقاتی کشمکش کا نوحہ۔قیصر قلندر کی نظم ''لال چوک'' علامتی انداز کی خوبصورت نظم ہے جس میں لال چوک کو یہاں کی ثقافتی اور تمدّنی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔اکبر جے پوری کی نظمیں ''جنتِ کاشمیر اور تنظیم نو بہار'' کشمیر کے حُسن سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں مبالغے کی فراوانی نے انہیں پُرکشش بنادیا ہے۔

۱۹۶۰ء کے آس پاس اُردو کی شعراء کی تازہ دم جماعت پورے ولولے کے ساتھ سامنے آئی۔ان میں حامدی کاشمیری، رحمٰن راہی، امین کامل، فاروق نازکی، سلطان الحق شہیدی، ہمدم کاشمیری، قاضی غلام محمد، حکیم منظور اور مظفر ایرج وغیرہ شامل ہیں۔ان میں اکثر شعراء نے اگر چہ ترقی پسندی کے آخری زمانے میں شعر گوئی شروع کی لیکن ان کے دیکھتے دیکھتے جدیدیت نے ہر طرف پر پھیلانا شروع کیئے۔یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بیشتر شعراء نے کشمیر کو کبھی نعرے کے حوالے سے استعمال کیا تو کہیں ایک علامت کے طور پر۔ حامدی کاشمیری کے اوّلین شعری مجموعہ ''عروسِ تمنا'' میں بقول ''مصرہ مریم[1] کشمیر، فطرت اور عشق نمایاں ہیں۔اس مجموعے میں بھی روایتی انداز میں کشمیر کا حسن اور زبوں حالی ایک شدید جذبے کے طور پر ظاہر ہوتا ہے لیکن انہوں نے بعد کے مجموعوں میں کہیں لل عارفہ تو کہیں رحمان ڈار تو کہیں صمد میر[2] کی شعریات کے تناظر میں کشمیر کو ایک تہذیبی دھارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔حامدی کی نظموں ''شامِ خزاں''، ''ماہِ کامل سے''، ''ایک رات''، ''شالیمار کی ایک شام''، ''گلمرگ''، وغیرہ میں فطرت کی مصوّری کو خراج پیش کیا گیا ہے۔ بعد کے مجموعوں ''نایافت'' سے ''یک شہرِ گماں'' تک میں حامدی کے یہاں کشمیر ایک آرکی ٹائپ کی صورت میں اُبھرتا ہے۔اپنی عظمتِ رفتہ، اپنے جلال و جمال، اپنی سیاسی محکومی اور اقتصادی زبوں حالی کے ساتھ کہیں ایک گہری قنوطیت تو کہیں ایک غیر متزل یقین کی صورت میں۔حامدی کے تازہ شعری مجموعوں ''خوابِ رواں'' اور ''یک شہرِ گماں'' کو اگر ایک طویل

---

[1] مصرہ مریم: حامی کاشمیری، تخصیت اور کارنامے

[2] کشمیری زبان کے سربرآوردہ صوفی اور شعراء

شہر آشوب کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

ہو گئے محرومِ بینائی تو کیا | نور کو ظلمت میں ضم ہونا ہی تھا
شام سے ہی چنار لرزاں ہیں | صُبح کو قتلِ عام کرنا ہی تھا

رحمن راہیؔ، امین کاملؔ اور مرغوبؔ بانہالی نے اگر چہ بعد میں کشمیری شاعری اور ادب کو اوڑھنا بچھونا بنایا لیکن ابتداء میں وہ بھی مہجورؔ ہی کی طرف اُردو کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوئے تھے۔ کاملؔ کے اس دور کی اُردو شاعری میں اُن کی کشمیری شاعری ہی کی طرح ترقی پسندی کا غلبہ ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے تضادات کو کشمیر کے خصوصی حوالے سے ظاہر کیا۔ کاملؔ کا لہجہ بیانیہ ہے جبکہ راہیؔ نے کشمیر کو ایک علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ اپنے متنوع اور متضاد البعاد کے ساتھ۔ مرغوبؔ نے کشمیر کے پیرہنِ تار تار کے مرثیے لکھے، قاضی غلام محمد نے اپنے عہد اور اپنی وادی کے مسائل کو اکبر الہ آبادی کی طرح طنز و مزاح کے پیرائیہ میں بیان کیا۔ اُن کی اکثر نظمیں کشمیر کی ہم عصر سماج پر پیروڑی کی شکلوں میں طنز کے بھرپور وار ہیں۔ اختر شیرانی کی نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' پر اُن کی پیروڑی شائد آج کے کشمیر پر بھی صادق آتی ہے۔

کیا اب بھی وہاں ہر گنجا سر | اسکالر سمجھا جاتا ہے
کیا اب بھی وہاں کا ہر ایم اے | غالبؔ پر کچھ فرماتا ہے
اور جہل کی ظلمت میں کھو کر | اقبال سے بھی ٹکراتا ہے
او دیس کے آنے والے بتا

سلطان الحق شہیدی نے کشمیر کے موضوع پر متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں کا اسلوب روایتی بیانیہ ہے اور انہیں بجا طور پر کشمیر کی توصیف والی شاعری میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ کشمیر کو جن شعراء نے مرکزی حوالے کے طور پر استعمال کرنے کی باقاعدہ کوششیں کی ہے اُن میں حکیم منظور کا نام اہم ہے۔ حکیم منظور نے سکوتِ برف شبی، ارضِ سیب کی خوشبو، اخروٹ نکہتیں، برف ملبوس، برف کا بستر اور سلگتی برف جیسی ترکیبیں وضع کر کے کشمیر کے

Ethos کوسمونے کی سعی کی ہے اور اپنی جڑوں سے گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔انہوں نے کشمیر کے موسموں، پرندوں اور لوگوں کو یہاں کی مقامی آئیڈیالوجی کے پس منظر میں بیان کیا۔اُن کے یہاں دھوپ سختی کا نہیں بلکہ خوشگواری کا استعارہ ہے۔ یہ وہ حدّت ہے جو کہ جسم کے ساتھ ساتھ روح کو بھی ولولے کی گرمی عطا کرتی ہے جبکہ وہ برف جسم و جاں کی یخ بستگی کا استعارہ ہے۔

مرا بس چلے برف زاروں کے بیچ
بناؤں میں کوئی مکاں دھوپ کا

اسی طرح انہوں نے بادام جیسی آنکھ تشبیہ استعمال کر کے محمود گامی[1] کے متن کے ساتھ اپنا متن جوڑ دیا ہے۔حکیم منظور کی شاعری سراسر کشمیر کی عظمتِ رفتہ کا قصیدہ، پُر آشوب حال کا مرثیہ اور غیر یقینی مستقبل کا نوحہ ہے۔

یہ کھوکھلے چنار شکستہ حویلیاں
کچھ سال پہلے گاؤں تھا شاداب، صاف ہو گیا

امبری سیبوں کے میرے باغ سارے لُٹ گئے
میں وہ شہزادہ ہوں جو بے سلطنت ہو کر رہ گیا

فاروق نازکی کی پوری شاعری کے پیچھے کشمیر کا منظر نامہ ہے۔محمود ہاشمی[2] نے اِس منظر نامے کے بارے میں بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ اتنا منفرد، تروتازہ اور سحر خیز ہے کہ کوئی بھی نیا لفظ یا دور از کار استعارہ اسکے تمام تر حسن کو اپنے مفہوم میں سمٹ نہیں سکتا ہے۔نازکی کے دوسرے شعری مجموعہ ''لفظ لفظ نوحہ'' میں کشمیر موجودہ پُر آشوب حالات میں کشمیر کی فُغاں کہیں راست تو کہیں علامتی انداز میں سُنائی دیتی ہے۔کہیں نامعلوم بے بسی ہے تو کہیں طنز کی بھرپور کاٹ۔

تم کیا جانو کشمیری
دِلّی میں کیا ہوتا ہے

1۔ انیسویں صدی کا سر برآوردہ کشمیر شاعر جس نے نعت میں رسول اللہ کی آنکھوں کو بادام سے تشبیہ دی ہے۔

2۔ لفظ لفظ نوحہ، فاروق نازکی، ص:۱۶ (دیباچہ محمود ہاشمی)

3۔ ہر سال 21 دسمبر سے 31 جنوری تک کا عرصہ جس میں کشمیر شدت کی ٹھنڈ کی لپیٹ میں رہتا ہے۔

نازکی کی نظمیں ''سرخیاں''، ''ایک مرثیہ اور'' اور ''چلۂ کلاں''[۳] کشمیر کے حال کی بھرپور تخلیقی سطح پر عکاسی کرتی ہیں۔ اس مجموعے کا انتساب غیر یقینی صورت حال نتیجے میں پیدا ہونے والے Faith Crisis کے المیے کو بے ساختہ انداز میں ظاہر کرتا ہے۔

گذشتہ دو دہائیوں کے نامساعد حالات نے جہاں شعراء کے لئے کرب زا تجربے مہیا کئے ہیں ان کی تخلیقات میں مقامیت کا رنگ اور گہرا ہوتا گیا۔ ان شعراء نے حال کی تلخیوں سے بچنے کے لئے ماضی کی رومان پرور پناہوں میں عافیت سمجھ لی۔ اس سلسلے میں چنار، دھوپ، سبزہ، ڈل، جیسے استعارے استعمال کرنے والوں میں مظفر ایرج اور ہمدم کاشمیری پیش پیش ہیں۔ کشمیر کے موجودہ منظرنامے کے بیان میں ہمدم اکثر اوقات حُسنِ تضاد سے کام لیتے ہیں جبکہ مظفر ایرج کی شاعری میں استعمال ہونے والے انگریزی اور ہندی الفاظ نے اس غیر یقینیت میں طنز کی چاشنی ملادی ہے۔

اُگی ہیں گھاس میں چنگاریاں سی — ہوئی ہے برف کی اُجلی قبا گم

ہمدم

اُس، کو کاٹا، اِسکو مارا، اپنا گھر بھی لوٹ لیا
ہم ہی درندوں نے بچوں کے منہ کا فیڈر لوٹ لیا

ایرج

شبیب رضوی کی ولادت اگرچہ بیرونِ کشمیر ہوئی ہے لیکن گذشتہ نصف صدی سے وہ کشمیر میں بود و باش کئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف یہاں کے رہن سہن اور طرزِ معاشرت کو اپنایا ہے بلکہ یہاں کی سائیکی کو بھی اپنے اندر جذب کیا ہے۔ انہوں نے بھی کشمیر کو کربلا کی تلمیح کے ساتھ برتا ہے اور خوب برتا ہے۔

یہ میری سرفرازی، سر بلندی — ہنگوں سر خنجرِ سفاک تک ہے
روایتوں کی جگہ ہے رقابتوں کا ہجوم — خوشا کہ ہم بھی بڑا خانوادہ رکھتے ہیں

شبیب رضوی کو غیر کشمیری کہنا اُن کے ساتھ ظلم ہوگا، لیکن ایسے غیر کشمیری شعراء کی

ایک طویل فہرست بھی موجود ہے جنہوں نے کچھ مدت تک کے لئے یہاں قیام کر کے کشمیر کے حوالے والی اُردو شاعری میں گرانقدر اضافے کیئے۔ ان میں جگن ناتھ آزاد، مظہر امام زبیر رضوی جیسے مقتدر شاعر شامل ہیں۔

کشمیر کو ایک توصیفی موضوع سے اُٹھا کر علامت کے طور پر برتنے والے شعراء میں رفیق رازؔ ایک اہم نام ہے۔ رازؔ نے شاید ہی ''کشمیر'' لفظ استعمال کیا ہو لیکن کشمیر کے تعلق سے اُن کی شاعری انسلاکات سے بھری پڑی ہے۔ رازؔ کو اگرچہ آفاقی، متصوفانہ، مابعد الطبعیاتی اور ماورائی موضوعات مرغوب ہیں لیکن ان کی شاعری میں کشمیر ایک زیریں لہر کی طرح موجود ہے۔ رازؔ کو نادر اور تازہ پیکر خلق کرنے میں خاصہ مہارت ہے جو کہ قاری کے حواس کو متحرک رکھتے ہیں۔ اگر ان کے پیکروں کو مابعد جدید نظریہ سازوں کے نظریے کے مطابق کشمیر کے تناظر میں دیکھیں اور معنی کو لامرکوز کریں معنی کے نئے اور حیرت انگیز امکانات روشن ہوسکتے ہیں۔ ان پیکروں میں موجود تضادات کو دیکھ کر ان کے اندر اور باہر کی متضاد کیفیتوں کی تفہیم ہوسکتی ہے۔

ہر طرح اس شہر میں سنگ باری ہورہی ہے
مَیں کہ ہوں زد میں بھی اور محفوظ بھی اک آئینے میں

☆

وقفے وقفے سے اذانوں کا دھواں اٹھتا ہے
سانس لیتا ہے ابھی شہر کا مینار سیہ

☆

کرفیو لگا اور گھر میں پاؤں جو رکھ دیا
سامنے تنہائیوں کی اِک فوج کھڑی تھی

☆

پیکر تراشی کے لباس میں کشمیر کا مضمونِ پیش کرنے والے شعراء میں شفق سوپوری

بھی ہیں۔ شفق بھی اپنے گرد و پیش سفا کیوں اور تضادات کے حوالے سے اپنی ذات سے مکالمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کشمیر کے کرب اور اپنی ذات کے کرب کو آمیز کرنے والے شعراء میں فرید بربتی کا ایک خاص انداز ہے۔ فریدؔ نے کلاسیکی شعریات کی لفظیات سے ہم عصر کشمیر کی حیثیت کو منور کیا ہے۔

سلگتے خواب خریدے ہیں نیند کے بدلے　　　یہ کاروبار پُرانا نیا نیا سا لگا

فریدؔ کی طویل نظم ''شہر آشوب'' مقامی سطح پر اقدار کی پامالی کا بیانیہ ہے جس کو انھوں نے خوبصورت اور حیرت زا تشبیہوں کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔

کشمیر کو نوسٹیلجیا کے طور پر استعمال کرنے والوں میں ایسے شعراء کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے ۱۹۹۰ء کے بعد کشمیر سے نقل مکانی کر کے مُلک کے مختلف حصّوں میں پناہ لی۔ ان شعراء میں برج ناتھ بے تاب، پیارے ہتاش، ترنم ریاض، صاحبہ شہریار اور پریمی رومانی شامل ہیں۔ بیتابؔ کے بارے میں گوپی چند نارنگ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ ایسی بے تاب روح ہے جو ماں سے بچھڑ گئی ہے۔ یہ پوری شاعری فن کے لحاظ سے خوبصورت لیکن موضوع کے لحاظ سے یاس زدہ تصویر ہے۔ یہ شعراء ہجرت، شناخت کی محرومی اور اہلِ سیاست کے جبر کے درمیان امید و بیم کی متضاد کیفیتوں سے دوچار ہیں اور ان کی شاعری کو عالمی سطح کی شاعری کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

میری آنکھیں/ بہتی رہتی ہیں/ جب سے تم نے/ میرے آنگن میں/ بہنا چھوڑ دیا/ وتستا/

بیتابؔ

اجنبی ماحول سارا دور تک　　　اب نہیں کوئی ہمارا دور تک

ہتاشؔ

مخالف ساعتوں میں تجھ کو ہمدم کون رکھے گا
مری وادی ترے زخموں پر مرہم کون رکھے گا

ترنمؔ

کشمیر کو ایک مستقل موضوع اور ایک ہمہ جہت علامت کے طور پر برتنے والے کشمیر کے اُردو شعراء میں خالد بشیر، ایاز رسول نازکی، رخسانہ جبین، سید رضا، اقبال فہیم، مشتاق مہدی، فاروق آفاق، حسن انظر، جان محمد آزاد، اشرف آثاری، نکہت نظر، پرویز مانوس، مقبول ساحل، اطہر بشیر اور سلیم ساغر پیش پیش ہیں۔ چونکہ میں اپنے بارے میں لکھنے سے قاصر ہوں لیکن آخر پر اپنے بارے میں شمس الرحمان فاروقی کی سند دے لہو لگا کر شہیدوں میں نام شامل کرنے کی جسارت کروں گا۔

"وہ (نذیر آزاد) اپنے اور اپنی وادی پر اپنے اہلِ وطن پر گزرنے والی واردات کو کسی اخباری یا سیاسی تبصرے کی طرح نہیں بلکہ شعر کے روپ میں بیان کرتے ہیں"۔

(سبوچہ، نذیر آزاد)

☆☆☆

☆☆☆

☆......پروفیسر مرغوب بانہالی

کشمیر شناسی کے بعض اچھوتے اشارے عظیم فارسی شعراء کے اشعار میں

ایران اور وسطِ ایشیا کے فارسی زبان و ادب سے وابستہ خطوں کے ساتھ جنتِ نظیر کشمیر کے ثقافتی اور گہرے تجارتی لین دین کی بیسیوں داستانیں اُن خطوں میں گزرے ہوئے درجنوں قدیم اور عظیم فارسی شاعروں نے اپنے فکر انگیز اور غور طلب اشعار میں زیرِ لب درج کر رکھی ہیں لیکن مورخوں کی کم توجہی اور تذکرہ نویسوں کی عدمِ توجہی کے سبب ایسے بیشتر زیرِ لب اِشارات سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ اگرچہ خطۂ کشمیر کے پہلے معروف مُورخ کلہن پنڈت کی طرح وہ لوگ فارسی زبان و ادب سے صرف اِس حد تک واقف نہ تھے کہ اپنے سے ایک صدی پہلے شاہنامۂ ایران لکھنے والے فردوسی طوسی سے تحریک پا کر اُسی کا عنوان سنسکرت میں مستعار لیا بلکہ کشمیر کے اوّلین شاہنامہ کا راج ترنگنی ہی نام رکھا۔ حالانکہ فارسی دان تذکرہ نویس قدیم کشمیریوں کے ایران اور وسطِ ایشیاء سے صدیوں پر محیط ثقافتی و تجارتی روابط اور لین دین کے مراسم بدھ مت کے عروج یعنی پہلی صدی عیسوی سے ہی اپنے آباء کی زبانی سُن چکے تھے اور پھر اُن مراسم کے تئیں فارسی عظیم شعراء کے اِشارے بھی پڑھ چکے تھے جو زبانِ فارسی کے پہلے عظیم شاعر رودکیؔ (تیسری، چوتھی صدی ہجری) کے حوالے سے تمام ایرانیوں تک خوبصورت کشمیریوں کی خُوبروئی اور مے کسی کے رجحان کی

بات ہندو دورِ حکومت میں بُت پرستی سے زیادہ پھیلنے کی بات بنا کر یوں پہنچائی گئی تھی کہ ۔

برخیز و بہ میخانہ خرام اے بُتِ کشمیر

مے خور کہ ہمہ گرگردواندوہِ جواں پیر

(محیط زندگی احوال و آثارِ رودکی، مولفہ آقای سعید نفیسی ص: ۴۶۴)

رودکی کے بعد ساسانی عہدِ حکومت (۲۶۱ھ-۳۸۹ھ) سے تعلق رکھنے والے قدیم فارسی شعراء میں عمارہ مروزی ایک اہم مقام رکھتا تھا۔ اُس نے کشمیریوں کے حسین ہونے کے علاوہ کشمیر کے حسین مناظرِ فطرت کوخراجِ محبت پیش کر کے ہم وطنوں کو ''بہار خانہ کشمیریاں'' جیسی حسین اور فکر انگیز ترکیب سے بھی آشنا کرالیا ہے۔یوں ۔

جہاں زِ برف اگر چندگاہ سیمین بُود	زمرد آمدہ بگرفت جایِ تُو دہٗ سیم
بہار خانۂ کشمیریان بوقتِ بہار	بباغ کرد ہمہ نقشِ خویشتن تسلیم

(تاریخِ ادبیات ایران مولفہٗ ڈاکٹر رضا زادہ شفق، ص: ۵۸)

فارسی زبان وادب کا اوّلین عہدِ زرین وہ غزنوی دور ہے جس میں ساسانی دور کی گرانقدر ادبی خدمات کو عالمگیر توسیع کے ساتھ ہمکنار کرایا گیا۔ اُسی عہدِ زرّیں کی دین ایران کو وہ قومی شاعر ابوالقاسم حسن فردوسی (وفات ۴۱۱ھ) ہے جو دُنیا کی عظیم رزمیہ ''شاہنامۂ ایران'' کا خالق ہے اور جو مثنوی میں زورِ بیان وشوکتِ زبان کا خاص نمائندہ تسلیم کیا گیا ہے۔فردوسی کی معاصر تاجروں کے ذریعے کشمیر کی ثقافت کے ہر پہلو سے واقفیت بہم پہنچی تھی۔البتہ اُس نے کشمیر کی برآمدات میں سے یہاں کی پارچہ بافی کا خاص ذِکر کیا ہے جن کا معیار چین اور روم کے پارچوں کی طرح شاہی محلات میں خاص طور پر پسند کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ایران کے آخری ساسانی تاجدار یزدگرد سوم کو جب حضرت سعد بن وقاص کی سربراہی میں ہوئے عرب حملے کے نتیجے میں اپنے محل سے بھاگنا پڑا تو فردوسی نے معتبر ذرائع کی بُنیاد پر ساتھ اٹھائے گئے سامانِ تعیش میں منجملہ دیگر مصنوعات کے جامۂ کشمیر کا بھی خاص ذکر یوں کیا ہے ۔

نشستیم و گفتیم بارای زن — ہمہ پہلو انان شدند انجمن
کہ از تاج واز تخت ومہر ورنگین — ہماں جامۂ روم وکشمیر وچین۔۔۔
ہم از خوردنی ہا وہر گونہ ساز — کہ مارا بباید بروزِ نیاز

(شاہنامہ، ص:۲۰۹)

زبردست فاتح اورادب پرور سلطان محمود غزنوی کے دربار سے وابستہ ممتاز شعراء میں عنصری (وفات ۴۳۱ھ) کو خاص مقام حاصل تھا۔ دیوانِ عنصری کے علاوہ ان کے شعری مجموعوں میں پانچ مثنویاں بھی شامل ہیں لیکن اُن کا بیشتر کلام اب گُم ہوگیا ہے۔ نازنینانِ کشمیر کے تعریف میں وہ کشمیر کے ساتھ زرتُشتیوں کے مقدس مانے گئے سروِ کشمیر کی یاد بھی تازہ کرتے ہیں جب کہتے ہیں۔

چونیکو چہرہ و قدش بیند — شود از نعتِ ہردو عقل مُضطر
یکے رالعبتِ کشمیر خواند — یکے را برکشیدہ سَروِ کشمیر
چُو کشمیر بُوم اوپُر سَرو باحُسن — چو کشمیر اصلِ اوپُر نقش وبافر
بہ نقشِ این نباشد جُو بہ کشمیر — بہ سروِ آں بنا شد جُو بہ کشمیر

(دیوانِ عنصری چاپ تہران ص:۴۰، ص:۵۷)

نویں دسویں صدی عیسوی میں کشمیر کے نقشدار (منقش) مصنوعات کی شہرت دُور دُور تک پہنچنے کی اِس تصدیق سے یہ بات بھی مُترشح ہوتی ہے کہ محمود غزنوی کو ہم عصر حاکمِ کشمیر کی بُت پرستانہ رعونت توڑنے کے علاوہ کشمیر کے صنعت کاروں کی ندرتِ فن بھی باعثِ کشش بنی تھی۔ اِس جانب ہمیں فکر انگیز اِشارے فردوسی اور عنصری کے ممتاز ہم عصر ملک الشعراء فرخی سیستانی کے کلام میں بھی ملتے ہیں۔ جس کے غور طلب پہلو کو نہ معلوم کیوں کشمیر کے اکثر تذکرہ نویسوں نے نظر انداز کرلیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ چوتھی صدی ہجری کے ممتاز شاعر فرخی (وفات ۴۲۹ھ) کو رشید الدین وطواط نے ایران کے لئے ویسا ہی قابلِ فخر شاعر گردانا ہے جیسا عرب کے لئے متنبی ہے۔ ایران کے ایک جدید محقق ڈاکٹر خانلری

نے چوتھی صدی ہجری کے عظیم شاعر فرخی سیستانی سے متعلق اِس بات کی بھی تصدیق کر لی ہے کہ وہ بحیثیتِ ملک الشعراء سندھ اور قنوج (سومناتھ) پر حملوں کے دوران محمود غزنوی کا ہم سفر تھا اور اُس سفر میں بھی محمود کا ہم رکاب تھا جس سفر سے واپس غزنی جاتے وقت غزنوی کاروان نے راجوری لُہرن کے مقام پر مختصر قیام کیا تھا۔ البتہ موسم بہت خراب ہو جانے کے سبب محمود کو فتحِ کشمیر کا اِرادہ موخر کرنا پڑا تھا۔ مختصر قیام لُہرن کے دوران کشمیر کے فطری مناظر اور اہلیان کشمیر کی بھرپور اطلاع مشہور فاتح کو بہم پہنچائی گئی تھی۔ اُس سے بھی دلِ محمود پر کافی اثر پڑا تھا۔ چنانچہ راستہ میں بلکہ غزنی واپس پہنچ کر اُس کا ذِکر محمود نے اپنے احباب سے کس انداز میں کہا تھا۔ فرخی نے اُس احساس کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔

ما را رہِ کشمیر ہمے آرزو آید   وقتے رہِ غز و آہدو ہنگامِ نگاپوی

گاہیست کہ یکبارہ بکشمیر خرامیم   از دستِ بُتاں پہنہ کُنیم ، از سرِ بُت گوی

(دیوانِ فرخی، سیستانی چاپ تہران، ص: ۳۶۵)

کشمیر کو دیر سویر فتح کرنے کی یہ آرزو بطورِ ایک سنجیدہ موضوع غزنوی دربار میں کئی بار زیرِ بحث آتی ہی ہے۔ اُسی کی جانب مختصر مگر بلیغ اشارہ کرتے ہوئے فرخی شہزادہ محمد غزنی کو اپنے عظیم فاتح باپ کے ادھورے رہے ہوئے مشن کی تکمیل ہی شامل ہونے کی دعوت یوں دیتا ہے۔

باش تا با پدرِ خویش بکشمیر شوی   لشکرِ ساختۂ خویش بکشمیر بری

(دیوان فرخی سیستانی، ص: ۳۷۸)

پانچویں صدی ہجری کے عظیم فارسی شاعر منوچہری کے مسعود غزنوی کے دربار میں وہی درجہ حاصل تھا جو فرخی کو محمود غزنوی کے دربار میں حاصل ہو گیا تھا۔ ادبیات کے علاوہ علمِ طب، علمِ نجوم اور عربی زبان میں اُستادانہ مہارت رکھنے والے منوچہری (وفات ۴۳۲ھ) کو حُسنِ کشمیر سے متعلق پھیلے ہوئے افسانوں میں بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ وہ اپنے محبوب کو اعزازِ دلکش بُتانِ کشمیر میں بطورِ ایک ساقی شامل کرتے ہیں۔

دیارے بُتِ کشمیر! شراب کہن پیر   بدہ پُر و تہی گیر کہ مان ننگ و نبر داست

(دیوانِ منوچہری دامغانی چاپ تہران، ص: ۲۱۷)

ایران میں عہدِ غزنوی (۳۷۴ھ-۴۳۲ھ) کے بعد سلجوقی دورِ حکومت (۴۳۱ھ-۵۵۲ھ) میں بھی شعراء کشمیر شناسی دکھاتے ہیں۔ سلجوقیوں کے ادب نواز بادشاہوں میں الپ ارسلان، ملک شاہ اور سلطان سنجر کو خاص شہرت حاصل ہوگئی ہے۔ اُن کے دربار سے وابستہ پانچویں صدی ہجری کے آخری حصّہ سے تعلق رکھنے والا آذربائیجان کا پہلا بڑا فارسی شاعر قطران تبریزی (وفات ۴۶۵ھ) تھا۔ کشمیر سے متعلق قطران کے کئی شعروں پر غور کرنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اُس نے حسینانِ افغانستان کی طرح حسینانِ کشمیر کو بھی نزدیک سے دیکھا تھا۔ مثلاً اِس شعر میں اُس کا اپنے حسن شناس دل سے یہ والہانہ اظہار ۔

اے بخوبی بر بُتانِ کابل و کشمیر میر   ماندم از بس کاوری در وعدہ ہا تا خیر خیر[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں ۔

پیام دارم نزدیکِ آن بُتِ کشمیر   کہ زیرِ حلقۂ زُلفت دِلم چراست اسیر

جواب داد کہ دیوانہ شُد دِل تو زِ عشق   برہ نیارد دیوانہ را مگر زنجیر!

ملک شاہِ سلجوقی کے دربار میں خاص مقام پاکر تاریخ ادبیاتِ ایران میں امیر الشعراء جیسا لقب پانے والا عظیم شاعر امیر معزّی (وفات ۵۲۰ھ) تھا۔ مشہور شاگرد رشید نظامی عروضی اپنے استاد امیر معزّی کے بارے میں لکھتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے دوران آپ کی دولت بُتِ کشمیر جیسی اصطلاح کو مزید قبولیت ملی جبھی تو آپ نے اپنے درد مند دل کی دوائی بُتِ کشمیر جیسے نازک اندام دوست کے دانشورانہ مشورے میں مضمر ہونے کا انکشاف کیا ہے۔ یوں ۔

پیام دارم کز روے زرد و نالۂ زار   بز روز یر ہمے مانم اے بُتِ کشمیر

امیر معزی نے اِستعاراتی سطح پر سُلطان سنجر کی بہادری کا مُبالغہ بروئے کار لاکر

[1] تذکرۂ الشعراء دولت شاہِ سمرقندی چھاپ لاہور، ص: ۴۰)

دارا اور سکندر جیسے مشہور بادشاہوں کے لرزہ براندام ہونے کی بات نہیں کی ہے بلکہ اُس وقت تک ناقابلِ تسخیر مانے گئے حاکمِ کشمیر کا ذِکر کیا ہے یوں ۔

در بہ کشمیر بُرد حاجب تو تاختنی　　　　اوفتد زلزلہ در جہان امیرِ کشمیر

امیر معزی کے بعض شعروں میں اُن کے محرمِ ثقافتِ کشمیر ہونے کے دیگر کئی پہلو بھی دیدنی بن جاتے ہیں۔ مثلاً ۔

بُلند قامتِ ایشان چُو سرو در کشمر　　　　بدیع صورتِ ایشان چو نقش در کشمیر

(دیوان معزی مرتبہ عباس اقبال چاپ تہران ص ۷۳۳، تذکرۃ الشعراء، دولت شاہ سمرقندی، صد: ۳۲، فرہنگِ ادبیات فارسی، چاپ تہران، ص: ۴۷۰)

چھٹی صدی ہجری کے آخر میں اُس سے کہیں زیادہ شہرت نظامی گنجوی (وفات ۶۰۴ھ) کو حاصل ہوگئی جو اُس صدی کے نصف اوّل میں امیر معزی کو حاصل تھی، بلکہ ادبیاتِ ایران میں نظامی گنجوی ایسا واحد عظیم شاعر ہے جس کو سر کردہ شعراء میں ممتاز ہونے کے ناطے اُستادالشعراء جیسا لقب دیا گیا ہے۔ نظامی کا فِکر و حکمت سے معمور پنج گنج بھی دیگر تمام پنج گنج یعنی پانچ صوفیانہ مثنویاں لکھنے والے مشہور شعراء میں ممتاز تسلیم کیا گیا ہے۔ اِسی حوالے سے مشہور ناقد نظامی سمرقندی نے نظامی گنجوی کو شہنشاہِ مثنوی اور شہنشاہِ استغنا مان لیا ہے۔ اس عظیم شاعر نظام گنجوی کو اپنے گہرے مطالعہ اور کشمیر شِناسی نے یہ تحریک دی تھی کہ وہ خطۂ کشمیر کو جنتِ نظیر یا فردوسِ بریں پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کو رشکِ جنت خطہ کے طور پر متعارف کرائے چنانچہ مُکالماتی انداز میں کئی کرداروں کی تصویر کشی یوں کی ہے کہ ۔

یکے گُفتا کہ در اقصاي کشمیر　　　　نَباشد از لطافت ہیچ تقصیر
مقامِ خُوبرویان آن زمین است　　　　بخُوبی رشکِ فردوسی برین[1] است

---

[1] کشمیر کو سترہویں صدی میں تسخیر کرنے والے مغل شہنشاہ اکبر کے پوتے شاہجہان کا دور بھی اُس کے باپ جہانگیر کی طرح اس خطے کو عشرت کدۂ شہزادگان بنانے کے لئے مشہور تھا۔ کشمیریوں کی توجہ اُسی تزئین پر مبذول رکھنے کے ناطے شاہجہانی صوبیدار نواب ظفر خان احسن نظامی کی اُس ترکیب کو اپنے شعر میں یوں برتتا ہے ۔

اگر فرصتے بخشدم روزگار — کُنم رشکِ فردوس کشمیر را

ساتویں صدی ہجری کے سب سے مقبول اور عظیم صوفی شاعر آبروئے فارسی مولانا جلال الدین محمد رومیؒ (وفات ۶۷۲ھ) نے کشمیر کی تہذیب اور سماجی زندگی سے گہری واقفیت رکھنے کے ناطے دوسرے مقبول اور مشہور عظیم شاعر حافظ شیرازی سے بہت پہلے سیاہ چشمانِ کشمیری جیسی پیار بھری ترکیب استعمال کی ہے یوں۔

دیوانۂ آن دو زُلف چو زنجیرم — مدہوشِ دو چشمِ جادوی کشمیرم

ثقافتِ کشمیر کے ساتھ اپنی شِناسائی مولانا رومی نے اور بھی کئی مقامات پر ظاہر فرمائی ہے مثلاً۔

بناشد عیب پُرسیدن تُرا خانہ کُجا باشد — نِشانے دہ اگر یابم وآں اقبالِ ما باشد---

فرو بَسْت تدبیرم، بیا اے یارِ شبگیرم — بُپرس از شاہِ کشمیرم کسے را کاشنا باشد

☆

اثرش آتشِ دِل بود وثمر قطرۂ اشک — آنکہ عُمرے زِ پے لعبتِ کشمیر شُدیم

(کُلیاتِ شمس تبریزی چاپ تہران ص: ۲۹۷۔

غزلیاتِ شورانگیزِ شمس تبریزی چاپ سوم ص: ۸۶۵)

ساتویں صدی ہجری کے نصف دوم کے دوران دُنیائے ادب سے عالمگیر سطح پر فارسی نثر و نظم کی دو شاہکار تصانیف گلستان بوستان پر بے انتہا آفرین و تحسین حاصل کرنے والے اُستادِ غزل حضرتِ شیخ سعدی شیرازیؒ (وفات ۶۹۴ھ) نے نہ صرف مُرّوج ہوگئی ہوئی ''بُتِ کشمیر'' جیسی ترکیب کو ''گُلرخِ کشمیر'' بنادیا ہے بلکہ اُسی گلرخ کو عجائباتِ بابل سے زیادہ جاذبِ نظر قرار دے کر کہا ہے۔

آں کیست کہ میرود بہ نخچیر؟ — پائے دلِ دوستان بہ زنجیر!

ہمشیوۂ جادوانِ بابل — ہمشیرۂ گلرخانِ کشمیر!

(ڈاکٹر ریاض احمد شیروانی کی کتاب غنی کشمیری، ص: ۱۳۰)

اٹھویں صدی ہجری کے عظیم ترین صوفی شاعر لسان الغیب قرار دئے گئے حافظ

شیرازیؒ (وفات ۷۹۱ھ) ہیں۔ آپ نے ایرانی حکمرانوں میں سے آلِ مظفر اور تیمور کا زمانہ پایا تھا۔ کشمیریوں کی سیاہ چشمی سے متعلق مولانا رومی کے تاثر کو دو آتشہ بنا کر حافظ نے اپنی شاعرانہ تعلّی بھی پروان چڑھالی ہے۔ اِن الفاظ میں۔

بشعرِ حافظِ شیراز مے رقصند و مے نازند سیہ چشمانِ کشمیری وتُرکانِ سمرقندی![1]

(دیوانِ خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی۔ چاپ تہران، ص: ۳۱۱)

نویں صدی ہجری کے سربر آوردہ فارسی شعراء میں مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؒ کا نام سرِ فہرست ہے۔ نظم ونثر میں آپ کے عارفانہ اور حکیمانہ کارنامے فارسی میں صوفیانہ ادب کا گرانقدر حصہ گردانے گئے ہیں۔ بلکہ اُن کی بُلندی وبرتری اور اثر آفرینی کے تناظر میں ہی مولانا جامی کو صوفی شعراء میں خاتم الشعراء قرار دیا گیا ہے۔ منجملہ دیگر خصوصیات کے مولانا جامی کے ساتھ اہلیانِ کشمیر کی قلبی وابستگی اِس وجہ سے بھی ہے کہ آپ نے ہی اُنہیں فارسی اور کشمیری میں نعت گوئی کے آداب کو خاص اُفتادِ طبع بنانے کا مُرشدانہ رول ادا کیا ہے۔ جس سے مقامی سطح پر نابغۂ عصر شیخ العالم شیخ نورالدین نورانی (وفات ۸۴۲ھ) کے وہ روح پرور نوالے اہلیانِ کشمیر کے عقائد میں جذب ہوتے گئے جو اُنہیں ایسے الفاظ میں قوتِ جان بنائے گئے تھے کہ۔

پأرِ پأرِ لگو زِتس پیغمبرسؐ پسندِس دورس رحمت چھے جأری
کأڈی ییلہِ ہکھ لگہ روزِ محشرس تَس کُن اُمیدوار آسن سأری

(نورنامہ ابوالفُقراء بابا نصیب الدین غازی)

مولانا جامیؒ (وفات ۸۹۸ھ) کی درجن بھر فارسی نعتیں کشمیر کی ہر محفلِ سماع اور ختماتِ اولیاء میں حالیہ برسوں تک بہت مقبول رہی ہیں۔ بلکہ عربی اور فارسی کے ادبِ عالیہ سے کشمیریوں کی نئی نسل میں پائی جانے والی ثقافت فراموشی کے باوجود اب تک بھی یہاں کی

---

[1] بعض دیوانوں میں یہ شعر اِس متن کا حامل بھی ہے:
بشعرِ حافظِ شیراز میگویند و میرقصند سیہ چشمانِ کشمیری وتُرکانِ سمرقندی

بُورگ پیڑی میں مولانا جامی کے کلام کی اہمیت قائم ہے۔ البتہ بہت کم لوگ تقدس مآب گردانے گئے۔ اِس عظیم صوفی شاعر کے ایسے اشعار سے واقف ہونگے جن میں بقول مرزا غالبؔ مُشاہدہٗ حق کی بات بھی بادہٗ وساغر جیسی اِصطلاحوں میں بیان کی جاتی رہی ہے وہی کچھ کشمیری خوبرویوں کی دین سے بے اعتنائی بلکہ دین دُشمنی کے حوالے سے یوں بیان کیا گیا ہے۔

زِ کشمیری بُتانِ دین برانداز　　　دِلم بُت خانۂ کشمیر گردد

(ڈاکٹر ریاض احمد شیروانی کی کتاب، ''غنی کشمیری'' ص: ۱۷)

اگرچہ دسویں صدی ہجری کے نصف اوّل میں بھی فارسی زبان کے بلند پایہ شعراء میں کشمیر سرائی کا وہ رُجحان قائم رہا جو انہیں کشمیر کو ایک عمدہ شعری موضوع گردانے کی تحریک دیتا تھا۔ پھر بھی اِس صدی کے نصف آخر میں جب کشمیر پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا تو ایران سے آکر اکبر کے دربار میں بعض بڑے وظیفہ خوار شاعروں کی کشمیر سرائی کا لہجہ نفرت کی زہرناکیوں سے آلودہ ہونے لگا۔ چنانچہ کشمیر کے قابلِ فخر عالم اور شاعر حضرتِ شیخ یعقوب صرفیؒ کے ذاتی اثر ورسوخ کے باوجود بعض ایرانی الاصل شاعر اکبر اعظم کو اپنی نمک حلالی کا ثبوت کشمیریوں کو بُرا بھلا کہہ کر دینے لگے۔ ایسے لوگوں میں شیخ مُبارک کے بڑے عالم و فاضل فرزند ملک الشعراء فیضی اور ابوالفضل پیش پیش تھے۔ دراصل ایک مسموم ذہنی یا Preoccupied mind وظیفہ خواری کے تحت دن کو رات اور رات کو دن کہنے کی حماقت بھی بڑی جسارت سے کرتا ہے۔ میرا یہی تجربہ اِن لفظوں میں ۱۹۷۵ء میں اُبھرا ہے کہ اگر محبت کے بدلے نفرت کی نظروں سے آسماں کو بھی دیکھو گے تو تمہیں آسمان کے تارے بھی آسمان کے پھوڑے نظر آئیں گے۔

دِی رٕ چھتھ یوٚ دسام ہسکھ تارکھ بَس　　　باسنٕ گاشرِ تہٕ اسمانکٕ پھپھر

(پرتوستان، ص: ۲)

اِس سلسلے میں ''بہارستانِ شاہی'' مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کے مقدمہ کی یہ عبارت کئی پہلو ذہن میں لے آتی ہے:

''اکبر نے یوسف شاہ کے ساتھ عہد شکنی کر کے دولت کے سہارے کشمیر کو مُسخر کیا اور قتلِ عام عرصہ تک جاری رکھا۔ اکبر کے حامیوں نے تسخیرِ کشمیر کی تاریخ ''خیر مقدم'' کہی جس سے ۹۹۴ھ کا سال نکلتا ہے۔ مخالفوں نے بھی تاریخ کہی۔ ''ظلمِ بے حد'' اس سے بھی ۹۹۴ھ کا سال برآمد ہوتا ہے۔ مغلوں کو جب (یوسف شاہ کے فرزند) یعقوب شاہ کی مزاحمتوں سے دوچار ہونا پڑا تو انہوں نے کشمیریوں کے خلاف ناشائستہ الفاظ استعمال کرنے شروع کئے۔ ابوالفضل (جس کو اکبر نامہ بشمولِ آئینِ اکبری اور سہ دفترِ ابوالفضل کا مُصنف ہونے کے باوجود جہانگیر نے بدگوئی کے لئے قتل کروایا) وہ یعقوب شاہ کو کمینہ اور بدنہاد کہا کرتا تھا۔ ابوفضل کا یہ تلخ جُملہ بھی مشہور ہے کہ ''کشمیر جنت است مگر مردمانِ اینجا دوزخی اند''، مغل (یعنی مغلوں کے ایرانی وظیفہ خوار) کشمیریوں کے خلاف یہ بھی کہتے پھرتے تھے کہ۔

اگر قحطُ الرِّجال اُفتد ازاں سہ مہر کم جوئی
اول کنبوہ، دوم افغان سوم بدذات کشمیری
زِ کنبوہ حیلہ مے آید، زِ افغان کینہ مے آید
زِ کشمیری نمے آید بجز اندوہ و دِلگیری

(تاریخِ کشمیر معروف بہ ''بہارستان شاہی'' ص:۲۵)

گیارھویں صدی عیسوی میں کشمیریوں کی سخت جانی اور ذہانت و فطانت سے مُتاثر ہو کر مغل دربار کے چند کاسہ لیس شعراء کے برعکس بالغ نظر ایرانی الاصل شاعروں نے اہلیانِ کشمیر کی اکثر اچھائیوں کا اعتراف بھی ایک اخلاقی فریضہ جان کر کیا ہے۔ بلکہ اُن کی کردار کشی کرنے کے گزشتہ اقدام پر ندامت کا اظہار بھی لازمی گردانا ہے۔ ایسا ہی کچھ میرزا محمد علی صائب تبریزی (وفات ۱۰۸۰ھ) کا بصدِ اشتیاق غنی کشمیری کی ملاقات کے لئے کشمیر آنا تھا۔ وہ زبانی روایت کی رُو سے غنی کی فکرِ بُلند اور نازک خیالی سے مُتاثر ہو کر نہ صرف اِس شعر کا مفہوم فنی اِنسلاکات کے ساتھ دریافت کرنے آیا تھا کہ۔

موے میانِ تو شُدہ کرلہ پن
کرد جُدا کاسہ سر ہا زِ تن

بلکہ وہ ایک وفادار مُغل صوبیدار ہونے کے باوجود نواب ظفر خان احسنؔ کے اعلیٰ ادبی ذوق اور ادبِ عالیہ کی قدردانی کا شہرہ سُن کر بھی یہاں آ گیا تھا۔ گیارھویں صدی

ہجری کے اِس عظیم ایرانی شاعر صائیبؔ کو جہاں مرزا غالبؔ جیسے بلند پایہ شاعر نے یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ۔

ذوقِ فکر غالبؔ را بر دز اُنجمن بیرون — باظہوریؔ و صائیبؔ محوِ ہمکلامی ہاست

وہاں فارسی شاعری کے عظیم نقاد مولانا شبلی نعمانی شاعر موصوف کا ذِکر اِن الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''ایران میں عظیم شاعری رودکیؔ سے شروع ہوگئی تھی جو میرزا صائیبؔ پر ختم ہوگئی۔'' (شعرالعجم، ج:۳، ص:۱۸۹)

جب غنیؔ اور صائیبؔ قیامِ کشمیر کے دوران ایک دوسرے کو ضیافتِ کلام سے محظوظ ومسرور کرتے رہے تو صوبیداری کا زُعم چھوڑ کر ظفر خان احسنؔ بھی اُن کی مجالس میں شریک ہوتے رہے۔ اُنہی مجالس کے گہرے اثر نے صائیب سے یہ تک کہلوایا ہے ''اگر میرے احبابِ کشمیر جیسے خُلد برین سے نکل کر کسی اور جنتِ نظیر جگہ جانا چاہتے ہوں وہ بخوشی جائیں صائیبؔ تو دہلی، لاہور اور شیراز جیسی ادب پرور جگہوں پر بھی کشمیر کو ہی ترجیح دیتا رہے گا۔'' اِسی جذبے کی عکاسی صائیب کے یہ الفاظ کرتے ہیں۔

میکنم از سرِ بروں صائیب ہوای خُلد را — بخت اگر از ساکنانِ شہرِ کشمیرم کُند

''جادو جو سر چڑھ کر بولے'' کے مِصداق اِسی جذبۂ عقیدت کے بول اُن دو عظیم شاعروں کے زیر اثر زبانِ احسنؔ پر بھی یوں جاری ہو جاتے ہیں۔

بہشت بریں باشما زاہدان — بہ احسنؔ گُوارید کشمیر را

(تذکرۂ شعراء کشمیر۔ راشدی ص:۵۱)

(نوٹ: ظفر خان احسنؔ کی کشمیر سرائی کے چند نمونے برصغیر کے فارسی شعراء کا تذکرہ کرتے وقت پیش کئے جا رہے ہیں۔)

بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری سے تعلق رکھنے والا اور پرانے رنگ و سبک شعر کے احیاءِ نو کی بھرپور کوشش کرنے والا ایران کا آخری بڑا شاعر میرزا حبیب اللہ قاآنی تھا۔

آپ کا شاعرانہ مرتبہ نہ صرف اِس بات سے ظاہر ہے کہ آپ نے عنصری، فرخی اور منوچہری جیسے غزنوی دور کے ممتاز اساتذہ فن کا اِسٹائل یعنی سبکِ خراسانی پھر سے زندہ کیا بلکہ آپ کو قاچاری دور کے اہم شاعروں کا شہنشاہ بھی تسلیم کرلیا گیا ہے۔ قاآنی (وفات ۱۲۷۰ھ) کے کشمیر سے متعلق تاثرات بھی کشمیر اور اہلیانِ کشمیر کے ناقابلِ تسخیر ہونے کے حُسنِ ظن کی یاد تازہ کرنے والے ہیں۔ وہ اونچے برف پوش پہاڑوں سے گھرے ہوئے خطۂ کشمیر کے ساکنان سخت جان کو بہادری کی علامت بنا کر اپنے اشعار کا موضوع بناتے ہیں۔ کبھی اپنی ممدوح کو تحریکِ زور آزمائی دیتے ہوئے یہ کہہ کر کہ ۔

از سُطوتِ تو ویلہ بہ خواندم و بُخارا
وز صولتِ تو مویہ بہ کشمیر و لہاوور

اور کبھی بر سبیلِ تذکرہ اپنی کشمیر شناسی کی ایسی جھلکیاں دِکھا کر :۔

خاصہ چوں یارِ من کہ از رُخ و زُلف
رشکِ کشمیر و قندہار بُود

☆

در چہرۂ تو خالِ تو اے غارتِ کشمیر
بر قامتِ تو زُلفِ تو اے آفتِ فرخار

☆

گماں مبر کہ نوازی بشالِ کشمیرش
کہ یک نگاہِ وے ارزد بہر چہ در کشمیر

☆

بویژہ کز عدل حکمرانِ جہان
شدست حیرتِ کشمیر و غیرتِ فرخار

☆

با قامتِ یارے چو تو، گیتی ہمہ کشمیر
با چہرہ نگاری چو تو عالم ہمہ کشمیر

(دیوانِ قاآنی چاپ ایران ص ۱۷، ۱۸، ۲۱۲، ۲۱۴، ۳۴۶، ۳۶۹، ۴۳۴، ۴۴۲)

☆☆☆

☆......عطا محمد میر

کشمیر کے کوہستان

جن حسین وجمیل و بُوقلمون پہاڑی سِلسِلوں نے وادی کشمیر کو اپنی باہوں میں لے رکھا ہے، وہ ارضیاتی طور اِتنے پیچیدہ، رُخ وسمت میں اِتنے خمدار، بھول بھلیوں والے اور دیکھنے میں اِتنے اُلجھاؤ میں ڈالنے والے ہیں، کہ ان کی مکمل تشریح اور تصویر کشی کرنا اگرچہ ناممکن نہیں تاہم مشکل ضرور ہے۔ یہ پہاڑ، جنہوں نے کشمیر کو منفرد جغرافیہ، ہئیت و ماہیت و خدوخال سے نوازا ہے، نہ کوئی اپنا تنہا اور آزاد پہاڑی سلسلہ بناتے ہیں اور نہ کسی ہمسایہ پہاڑی سلسلہ میں پوری طرح گم ہو جاتے ہیں۔ وادی کشمیر کی ہزار ہا سال کی جداگانہ تاریخ کی طرح ان کی بھی اپنی ایک الگ شناخت ہے۔ پیر پنچال پہاڑ کا سلسلہ، جو جنوب و مغرب کی طرف وادی کشمیر پر سایہ فگن ہے، ارضیاتی عمر، بناوٹ، ساخت، اُونچائی اور دیگر خصوصیات کو چھوڑ کر، کم و بیش ایک تنہا اور آزاد پہاڑی فصیل تو بناتا ہے، مگر اس کے برعکس برف پوش اور اُونچا پہاڑی سِلسِلہ جو وادی کشمیر پر شمال و مشرق کی طرف سایہ کئے ہوئے ہے، ہمالیہ پہاڑوں کے اُونچے سلسلوں اور ان سے نکلنے والے زیرنگین شاخوں کے جُھرمٹ میں کہیں کہیں مدغم بھی نظر آتا ہے اور کہیں اپنی نمایاں شناخت بھی بناتا ہے۔ اِن ہر دو منفرد سِلسلوں کی بناوٹ، بل کھاتی ہوئی کیاریوں، منحنی، سنگستانی اور خمدار چوٹیوں اور حیران کرنے والی رُخ اور سمت والی وادیوں کو الفاظ میں بیان کرنا آرے کے معمے Jig-saw

puzzle کو بیان کرنے کے مترادف ہے۔ سر والٹر لارنس اپنی کتاب " The Valley of Kashmir" میں لکھتے ہیں۔

The mountains which surround Kashmir are never monotonous. Infinitely varied in form and colour. They are as such an artist might picture in his dreams'.

وادی کشمیر کے ارد گرد کے کوہستانوں، اُن کی ذیلی شاخوں اور تہہ دار اُفقی کیاریوں، جو کسی موٹے درخت کے تنے سے نکلی ہوئی شاخوں کے گچھے کی مانند لگتی ہیں، کی مختصر وضاحت ہم درہ زُوجیلا سے شروع کریں گے، جس کو وادی زانسکار، وادی سندھ، اور نوبرا وادی یا بحیثیت مجموعی خطہ لداخ کے ہمالیائی سلسلہ کا Gateway بھی کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں ہم صرف اُن پہاڑوں کا ذکر کریں گے جو دریائے جہلم کا منبع آب ہیں۔ زوجیلا درہ سے تقریباً بیس کلومیٹر جنوب مشرق کی جانب پہاڑوں کا ایک نمایاں، واضح اور عظیم الجثہ سلسلہ شروع ہو کر اپنی وادیوں، گھاٹیوں، شاخوں اور ذیلی دروں کے ہمراہ جنوب کی جانب مڑتے ہوئے مرگن پہاڑوں تک ایک اصل پہاڑی دیوار بناتا ہے۔ مرگن پہاڑ سے آگے یہ پوری طرح جنوب و مغرب کی طرف مڑتے ہوئے، واضح، نمایاں اور آزاد پہاڑی فصیل پیر پنچال میں مدغم ہو جاتا ہے۔ اِس طرح درہ بانہال سے آگے دریائے جہلم کی نکاسی گھاٹی تک پورا جنوب مغربی پہاڑی سلسلہ بن جاتا ہے۔ درہ زوجیلا سے درہ مرگن تک کے اس اصل درانتی نما پہاڑی سلسلہ سے بہت سی اُفقی، خمدار، مُخنی اور بل کھاتی ہوئی ذیلی شاخیں مُختلف اطراف کی جانب نکلتی ہیں، جو پنچ ترنی، امرناتھ، بالتل، بوٹھ کول، وارڈون، ہمپٹ، کنہ تل، ساگر نور اور پُر منڈل کی وادیاں بناتی ہیں۔ مرگن سے زوجُیلا تک کے اس اُونچے پہاڑی سلسلہ سے بہت سی نمایاں اور قدرے متوازی شاخیں جہلم وادی کی جانب اندر تک چلی جاتی ہیں، جو اور کئی الگ تھلگ وادیوں کا ایک گچھا سا بناتی ہیں، جن میں سال بھر بڑے بڑے برف کے ڈھیر موجود رہتے ہیں۔ ان وادیوں میں سھجی داس، کولہائی، ہر بھگوان، کوہن ہار، ٹکلین، پنچ ترنی، آستان مرگ، اور نافران قابل ذکر ہیں۔ ان

وادیوں کے آس پاس سینکڑوں چھوٹی بڑی پہاڑی جھیلیں برفانی ڈھیروں اور گلیشروں سے نکلنے والے پانی سے سال بھر لبالب رہتی ہیں۔ سنگستانی باہوں میں واقع ان جھیلوں میں شیش ناگ، ہرناگ، دودھسر، سونہ سر، کاترناگ۔ ٹلین، کون ناگ، گنس ناگ۔ ناگ پتن، زمکش ناگ، چوہرناگ، سورس ناگ اور گھیلن ناگ اپنی اپنی پہاڑی ندیوں کا اصل منبع بھی ہیں، اور جن کا پانی پتھریلی وادیوں اور جنگلاتی علاقوں میں بے شمار خوبصورت آبشاریں بناتا ہے۔

اس اصل پہاڑی سلسلہ کی کئی اور متوازی شاخیں وادی واڑون کی مشرقی ومغربی پہاڑی دیوار بھی بناتی ہے۔ بہت سے اُونچے پہاڑی درے جن کی اُونچائی سطح سمندر سے ۱۱۳۰۰ فٹ سے لیکر ۱۴۶۰۰ فٹ تک ہے، اس پہاڑی لکیر کے بیچ میں سے گذر کر وادی کشمیر کو وادی واڑون اور مروا کے مُختلف علاقوں سے ملاتی ہیں۔ یہاں سے یہ پہاڑی پگڈنڈیاں زنسکار اور وادی سندھ (لداخ) کو جاتی ہیں۔ ان دروں میں مرگن کا درہ اپنی کم اُونچائی اور ہموار ہونے کے باعث زیادہ قابل گزر رہا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے درے ڈھلوان دار، سخت چڑھائی والے اور نُوکیلے ہونے کے باعث زیادہ قابل آمد ورفت نہیں رہے ہیں۔ ان میں سے ایسا ہی ایک درہ سونہ سر پُر منڈل درہ بھی ہے جو چندن واڑی سے شروع ہوکر سونہ سر کے راستے سُکھنائی کو جاتا ہے۔ دوسرا درہ لنگنائی وادی سے ہوتے ہوئے سُورہ پتھری اور سُہہ گنی کے کوہستانوں کے بیچ سے گذر کر وادی واڑون کے گاؤں بسمن کو جاتا ہے۔ ایک اور درہ شیش ناگ سے مشرق کی جانب گلگول پہاڑ کو عبور کرکے پانی کھر، سورو، رنگ مرگ اور سائی نالہ سے ہوتے ہوئے لداخ ہمالیہ کی مُختلف وادیوں کو جاتا ہے، دو دیگر درّے اس اصل پہاڑی دیوار کے بیچ سے زمکش ناگ اور چوہرناگ سے ہوتے ہوئے چڑدرمن اور اُنشن کو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ تمام درے چڑھنے اور اُترنے میں مشکل اور کٹھن ہیں، مگر یہ اپنی ہمالیائی خوبصورتی، مناظرِ فطرت اور کوہستانی جلوؤں سے بھرپور ہیں۔ اس پہاڑی دیوار کی کچھ چوٹیاں ۱۶۰۰۰ فٹ سے لیکر ۱۷۸۹۰ فٹ تک اُونچی ہیں، جو سال بھر برفانی ڈھیروں سے بھری رہتی ہیں۔ ان میں امرناتھ ۱۷۸۹۰ فٹ ہر بھگوان

۱۶۰۸۱ فٹ۔ کوہن ہار ۱۷۰۰۰ فٹ اور ٹلین ۱۶۰۰۰ فٹ کی چوٹیاں قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور چوٹیاں جو نیچ ترنی، بال تل اور لنگنائی کے مشرق و جنوب میں واقع ہیں اور جو ۱۵۰۰۰ اور ۱۷۰۰۰ ہزار فٹ تک بُلند ہیں، اس ساری پہاڑی فصیل کو شاندار اور پُرشکوہ بناتا ہے۔ ان تمام برف پوش چوٹیوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور واضح کولہائی کی ۱۷۸۸۹ فٹ بُلند چوٹی ہے، جس کو گاشہِ براری بھی کہتے ہیں۔ اس کی گُنبد نما چوٹی سیدھے آسمان کی جانب اُٹھتی ہوئی اپنے کلس میں نوکیلی ہونے کے باعث بڑی شاندار اور حسین و جمیل نظر آتی ہے۔ پاس و دور کی چوٹیوں سے اس کا نظارہ بڑا ہی حیران کن اور مسحور کن ہوتا ہے۔ کوہ پیاؤں کی محبوب یہ چوٹی نہ صرف وادی لدر کا تاج ہے، بلکہ کشمیر وادی کے جنوب مشرق پہاڑی دیوار کی شان بھی ہے۔ کولہائی پہاڑ سے ذیلی پہاڑی شاخوں کا ایک گُچھا مُختلف اطراف سے وادی لدر اور وادی سندھ پر سایہ فگن ہو کر کئی پہلو والی وادیاں بناتے ہیں، جن کی اُوپری گود میں تارسر مارسر، یم سر، کھیم سر۔ چنڈسر۔ دودھ سر، سونہ سر، اور منورسر واقع ہیں۔ ان جھیلوں سے کچھ منحنی وادیاں اور صنوبری جنگلوں سے بھری ہوئی گھاٹیاں گگن گیر، کلن، گنڈ۔ سرفراہ، گاندربل، ہارون، وستورون، کھریو، شکارگاہ، کھرم اور اُوورا کی جانب چلی جاتی ہے۔ ان کے بیچ میں ایک اور اُونچی چوٹی یک لخت ہارون کے عقب میں اُبھرتی ہے، جسکو مہادیو پہاڑ کہتے ہیں۔ ناگہ بیرن، سنگرگلو، بوڈ ناؤ، گریٹہ نار، سیکہ واس، زوجی مرگ، ڈگ ون، چُمنائی اور ہوکھہ سر کی حسین و جمیل وادیاں اور پہاڑی فرودگاہیں اِسی پہاڑ کے دائیں بائیں واقع ہیں۔ یہ حصہ ہمالیائی جڑی بوٹیوں، پیڑ پودوں اور جنگلی جانوروں سے بھرا پڑا ہے، کیونکہ داچھی گام نیشنل پارک کا بڑا حصہ اس پر محیط ہے۔ کوہ پیاؤں کیلئے جنت جیسا یہ علاقہ کئی مقامی دروں کیلئے بھی مشہور ہے، جن میں لدروٹ زائیون، لدروٹ کلن اور لدروٹ ناگہ بیرن قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل الذکر دو پہاڑی پگڈنڈیاں وادی سندھ کو جاتی ہیں اور موخر الذکر مارسر وادی سے ہوتے ہوئے ہارون، داچھی گام اور ستورہ ترال کو بھی جاتی ہے۔ جنوب مشرقی اس ساری پہاڑی دیوار سے دریائے جہلم کی دو اہم

دائیں جانب کی معاون ندیاں، دریائے لدر اور دریائے سندھ نکلتی ہیں جو بالترتیب اننت ناگ اور شادی پورہ کے نزدیک جہلم میں سما جاتی ہیں۔ ان پہاڑوں کی ایک اہم وادی وہ ہے جس کے بیچ میں سے ایک پہاڑی پگڈنڈی مہاگنس پہاڑ کو جاتی ہے، جہاں سے یہ پنج ترنی کی طرف اُترتی ہے۔ جو امرناتھ یاترا کا آخری پڑاؤ بھی ہے۔ مہاگنس کا پہاڑ جو سطح سمندر سے ۱۴۸۰۰ فٹ اُونچا ہے، سندھ اور لدر وادی کے درمیان فاصل آب بناتا ہے۔ یہاں سے سینکڑوں برف پوش چوٹیوں کا نظارہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ درہ مرگن کے آس پاس نہ صرف بیسیوں جھیلیں ہیں، بلکہ کئی اُونچی چوٹیاں بھی ہیں، یہاں سے لداخ ہمالیہ کی اُونچی چوٹیوں بشمول نُون کُن چوٹیوں کا بخوبی نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ مرگن کے پہاڑوں کو ۱۴۶۶۶ فٹ بلند دو برف پوش چوٹیوں نل ٹوپ اور کھیلن نے ایک الگ شناخت بخشی ہے ۔ درہ مرگن سے جب ہم جنوب کی جانب مڑتے ہیں تو پیر پنجال پہاڑ کی اصل شاخ سے متعارف ہو جاتے ہیں۔ اس کا پہلا حصہ مرگن سے بانہال درہ تک براری بل کہلاتا ہے، اور اس کی کچھ چوٹیاں ۱۴۰۰۰ فٹ اُنچی ہیں۔ براری بل سے اِس کی اُونچائی آہستہ آہستہ وہاں سب سے کم ہو جاتی ہے، جہاں سرینگر جموں قومی شاہراہ ۲۶۰۰ میٹر لمبی سرنگ (بانہال ٹنل) سے گذرتی ہے۔ کئی کوکھ والی وادیاں براری بل پہاڑ کو چیر کر کئی درے بناتے ہیں، جن میں سے سب سے اہم ماور ناگ سنگھ پورہ، چھاترو کا درہ ہے۔ دو دوسرے درے براری بل اور ہوکھ سر ہیں، جو ڈوڈہ، کشتواڑ، مروا اور چناب وادی کے کئی علاقوں کو جاتی ہیں۔ ان میں سب سے اُونچا اور مہم جویانہ درہ ہوکھ سر کا درہ ہے، جو ڈکسم سے شروع ہو کر انتہائی خوبصورت پہاڑی چراگاہ پھامبر کو جاتا ہے۔ پھامبر چراگاہ میں بہت سی جھیلیں ہیں جو اردگرد کے برف کے ڈھیروں کی موجودگی کی وجہ سے سال بھر پانی سے لبالب رہتی ہیں۔ ان کا پانی دریائے واڈون کی طرف بہتا ہے۔ درہ سنتھن براری بل پہاڑ کو بیچ میں کاٹ کر سیدھے چناب وادیوں کی طرف اُترتا ہے۔ یہاں سے بھی چناب وادیوں کا مسحور کن نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی پہاڑ کی دو منحنی جنگلاتی کیریاں برنگ اور شاہ آباد کے اُوپری علاقوں پر سایہ

فگن ہیں۔ ان میں سے ایک کیری وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں ویری ناگ کا مشہور چشمہ ہے۔ براری بل پہاڑ دریائے برنگی اور ساندرن کا اصل منبع ہے۔

بانہال درہ سے بارہمولہ کی گھاٹی تک، پیر پنچال پہاڑ کئی ارضیاتی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کی چوٹیاں ۱۴۰۰۰ سے ۱۵۰۰۰ ر فٹ تک بلند ہیں۔ یہ وادی کشمیر کو بیرونی میدانوں سے اپنی ایک سو کلو میٹر لمبی موٹائی سے نہ صرف جُدا کرتی ہے، بلکہ مون سون ہواؤں سے بھی بچاتی ہے۔ جاڑے کی پہلی برف باری اسی کی چوٹیوں کو چومتی ہے۔ موسم بہار میں پانپور کے کریوا سے ان کی سنگستانی، نوک دار اور برف پوش چوٹیوں کا نظارہ مسحور کن ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بیرونی پہاڑوں کی طرف شوالک ٹیلوں سے ملی ہوئی ہے اور وادی کی طرف یہ ڈھلوان دار کریوا پہاڑیوں پر اپنا سایہ بنائے ہوئے ہیں۔ درہ بانہال سے اس کی اُونچائی بڑھتے بڑھتے ٹٹہ کوٹی پہاڑ تک ۱۵۵۰۰ ر فٹ ہو جاتی ہے۔ اس کی اُوپری انگنت وادیاں جن کو کشمیری میں "مرگ" کہتے ہیں، برفانی ملبے، پتھروں، جھاڑیوں اور برف کے ڈھیروں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ یہ گوجروں بکروالوں اور کشمیری چرواہوں کی من پسند گرمائی قیام گاہیں، کیونکہ یہاں گھاس کی بہتات ہے، جو اُن کے بھیڑ بکریوں کو فربہ بناتی ہے۔ نشیب و فراز والی یہ وادیاں جنگلاتی ڈھلوانوں، گھاٹیوں، دروں اور سنگستانی کیریوں پر مشتمل پیر پنچال کے یہ دامن وہاں ختم ہو جاتے ہیں جہاں ڈھلوان دار کریوا ٹیلوں کا اُوپری حصہ شروع ہو جاتا ہے، پیر پنچال کا پہاڑ جو وادی کشمیر کو بیرونی میدانی علاقوں کی گرم لہر سے بچاتا ہے، کئی پہاڑی دروں کی وجہ سے صدیوں سے کشمیریوں کیلئے قابلِ عبور رہا ہے۔ ان میں سے وہ تاریخی درہ بھی شامل ہے، جس کو شاہراہ نمک کہا جاتا ہے، جو کشمیر کو راجوری، اور اس کے ملحقہ علاقوں سے ملاتا ہے۔ بیرونی حکمرانوں، حملہ آوروں بشمول مغل بادشاہوں اور یورپی سیاحوں جیسے مورکرافٹ، فرانکوئیس برنیر، فیڈرک ڈریو، جی ٹی وگنی۔ ولیم وکفلیڈ، نیگ ہڈبڈ اور ہیگل اسی درہ سے وارد وادی ہوئے۔ کشمیر میں تعینات مغل گورنروں نے اپنے آقاؤں کی سہولیت کیلئے اس پہاڑی

پگڈنڈی پر جگہ جگہ سرائیں تعمیر کیں اور اس کے رکھ رکھاؤ میں خاصی دلچسپی لی، جس کے باعث یہ آج مغل روڈ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ دوسرے دروں میں فتون پنچال درہ، توسہ میدان درہ، چور پنچال اور درہ فیروز پورہ ہے، جو وادی کو ریاسی، بدھل، راجوری، پونچھ، جہلم، اکھنور اور نوشہرہ سے ملاتے ہیں۔ وادی کشمیر کے ہمالیائی چراگاہوں میں مال مویشی کے ساتھ موسم گرما گذارنے کیلئے بکروال ان ہی دروں سے وادی میں داخل ہوتے ہیں۔ ٹٹہ کوٹی اور رومُش تھونگ (Sunset peak) کی ۱۵۵۰۰ رفٹ اُونچی چوٹیاں اس پہاڑ کو ایک ہمالیائی جلال بخشتا ہے۔ جب ان کی خم دار کلس اور نوکیلی برف پوش چوٹیوں کا نظارہ پانپور کے کریوا سے کیا جاتا ہے تو وہ کھڑی دندانہ درانتی اور آرہ جیسی لگتی ہیں۔ اِس پہاڑ کی سب سے اُونچی اور واضح اور نمایاں چوٹی برہما سکلی ہے، جو ۱۵۵۲۴ رفٹ اُونچی ہے۔ اس کی ارد گرد کی بیسوں خم دار وادیاں، خمیدہ کیریاں، گھاٹیاں اور الگ تھلگ ڈھلوانیں چھوٹے چھوٹے گلیشروں سے بھری پڑی ہیں۔ برہما سکلی سے لیکر آلہ پتھر تک کی پیر پنچال پہاڑ کی دیوار سمہ سر، نندن سر، دودھ سر۔ وٹہ سر۔ نلہ ناگ، کنٹر ناگ انونت ناگ اور آلہ پتھر ناگ جیسے پہاڑی جھیلوں پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ کونسر ناگ، جو برہما سکلی پہاڑی کی گود میں ۱۳۰۰۰ رفٹ کی بلندی پر واقع ہے، کشمیر کے کوہستانوں کی نہ صرف سب سے بڑی خوبصورت اور گہری جھیل ہے، بلکہ اِس کے ارد گرد کے پہاڑ انتہائی حسین کن اور کھُلے مناظروں والے ہیں۔ ایک سنگستانی قدرتی پُشتہ اس جھیل کو موہی ناگ وادی کی جانب سے تھامے ہوئے ہے۔ جھیل کا پانی اسی پانچ سو فٹ اُونچے پشتہ کے دامن سے اچانک نکل کر اہرہ بل آبشار تک بل کھاتا ہوا بے شمار چھوٹی بڑی آبشاریں بناتا ہے۔ اس پہاڑی سلسلہ سے ربی آرہ، رومشی، دودھ گنگا، فیروز پورہ، سکھ ناگ اور ننگل ندیاں نکل کر بالآخر دریائے جہلم میں سما جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ سینکڑوں کیریاں، اور وادیاں اُفقاً نکل کر دندوار ڈ کونگہ وٹن، کونسر نائے، رائے نیور، دُبجن، یوسمرگ، کھانچہ کول، کاچہ گل، نلہ ناگ، دودھ پتھری، سنگ سفید وادی، مجہ پتھری، کرالہ نگل۔ ڈونیں، دشکھل،۔ ہاکہ باکل۔ ریور، پوہن اور دنہ

واس کی خوبصورت کوہستانی فردگاہیں اور پُرفضا چراگاہیں بناتی ہیں۔ان کے اوپری حصے نہایت ہی حسین ہیں جہاں پہاڑی ندیاں چٹانوں اور صنوبر درختوں کے بیچ سے گذرتی ہیں۔ایک ایسی خوبصورت چراگاہ سُکھ ناگ ہے جہاں سے پہاڑی پگڈنڈی توسہ میدان کو جاتی ہے۔نشیب وفراز والے ان فرحت بخش گھاس کے میدانوں کا ماحول ہردم سکون کی باہوں میں جھولتا نظر آتا ہے۔اس کی اُوپری جگہوں میں برزہ پتھری، نکوار پل، رچہ پھرین، بان بلی ناگ اور کنٹر ناگ زیادہ ہی خوبصورت ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ۱۰۱۵ ہجری میں سنگرام راج کے دور حکومت میں محمود غزنوی نے اسی راستے سے وارد وادی ہونے کی کوشش کی تھی، مگر پہاڑوں کے موسم نے اُس سے روکا۔مشہور چینی سیاح ہیون سانگ اسی درہ سے وارد وادی ہوا۔زیر بحث پہاڑی دیوار سے ذیلی شاخیں جووندوارڈ شوپیان، یوسمرگ، نلہ ناگ اور گلمرگ کے درمیان کی دیواریں بناتے ہیں، کئی مقامی دروں سے ملی ہوئی ہیں، جس میں ہون ہنگ درہ کونسر ناگ درہ، باسی گلی درہ اور کوٹ ساگل درہ اور کرالہ ننگل درہ زیادہ مشہور ہیں۔گلمرگ، یوسمرگ اور کونسرناگ کی اوپری وادیوں کو چھوڑ کر اس کی دوسری وادیاں اِتنے زیادہ لوگوں کی توجہ کا مرکز نہیں بنی ہیں، جتنا کہ وادی لدر اور وادی سندھ کی اُوپری وادیاں۔اپھروٹ پہاڑ، جو گلمرگ پر سایہ کئے ہوئے ہے، سے آگے کئی ڈھلوان دار گیریاں، جن کی اُونچائی سطح سمندر سے ۹۰۰۰ رفٹ سے لیکر ۱۲۰۰۰ رفٹ تک ہے، سیدھے اُس گہری گھاٹی کی طرف نکلتی ہیں جس کے بیچ میں سے دریائے جہلم مظفر آباد کی طرف بہتا ہے۔اس طرح دریائے جہلم دومیل سنگم تک بائیں جانب پیر پنچال پہاڑ اور دائیں جانب کاجی ناگ پہاڑ کی ذیلی شاخوں کے زیر سایہ بہتا ہے۔تاریخی جہلم ویلی روڈ، جو کشمیر کو مظفر آباد، ایبٹ آباد، راولپنڈی، مری اور پُونچھ سے ملاتا ہے، اسی گھاٹی میں سے گذرتا ہے، اور نتیجتاً یہ راستہ بہترین زمینی، جنگلاتی، پہاڑی اور دریائی مناظر سے بھرپور ہے۔

ایک بار پھر ہم درہ زوجیلا سے اپنا سفر شروع کرتے ہیں، جہاں سے ایک سو پچاس کلومیٹر لمبا اور اپنی بنیاد میں اوسطاً چالیس کلومیٹر چوڑا ایک اُونچا پہاڑی سلسلہ بل کھاتا

ہوا شمال و مغرب کی جانب نکل کر سیدھے کاجی ناگ کے پہاڑوں کی گود میں سما جاتا ہے۔
یہاں پہاڑوں کا وہ ہالہ مکمل ہو جاتا ہے جو وادی کشمیر کو گھیرتا ہے یہ لمبا پہاڑی سلسلہ سندھ وادی، تراگہ بل، لولاب، چوکی بل اور ماور راجوار کی اُوپری وادیوں اور گھاٹیوں پر نہ صرف سایہ کرتا ہے بلکہ ان وادیوں اور نیلم یا کشن گنگا وادی کے درمیان فاصل آب بھی بناتا ہے۔
کئی درے اس پہاڑی سلسلہ کو چیر کر نیلم، گریز اور گلگت کی وادیوں کو جاتے ہیں۔ تراگہ بل درہ اُن میں زیادہ مشہور ہے جو بانڈی پورہ اور گریز کے درمیان واقع ہے۔ یہ درہ انتہائی خوبصورت، ہمالیائی درختوں سے بھرا ہوا اور پھولوں بھری وادیوں والا ہے۔ یہاں سے پیر پنچال، کاجی ناگ اور شمش بھری پہاڑوں کا شاندار اور ناقابل فراموش نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اس درّہ کو ہرموکھ پہاڑ کی اُن تہہ دار اور ڈھلوان دار کیریوں نے اپنی نزدیک والی وادی سے چار ہزار فٹ بلندی بخشی ہے، جن کا پانی کشن گنگا دریا کی جانب بہتا ہے۔ سکھ اور ڈوگرہ دورِ حکومت میں گلگت جانے والی یہ پہاڑی پگڈنڈی جو تراگہ بل درہ سے گذرتی تھی، اُن کشمیری مزدوروں کیلئے موت کی وادی ثابت ہوتی تھی جن کو وقت کے حکمران زبردستی گھروں سے نکال کر جبری مزدوری پر بھاری بوجھ کے ساتھ ڈوگرہ فوجیوں کا سامان رسد وغیرہ ڈھونے کیلئے گلگت بھیجتے تھے۔ ہر سال یہاں سینکڑوں بے کس و مجبور مزدور برف وباراں، سردی، بھوک، تھکان اور نامعقول پناہ گاہوں کی وجہ سے دم توڑ دیتے تھے۔ یہ پہاڑی پگڈنڈی جو بانڈی پورہ سے گلگت تک ۳۳۰ کلو میٹر لمبی تھی، راج دین گن، کامری اور برزل کے دروں سے گذرتی تھی، جو بالترتیب ۱۱۸۰۰ فٹ ۱۳۸۰۰ فٹ اور ۱۳۷۴۰ فٹ اُونچی ہیں۔ کوہستانوں کا وہ ذیلی سلسلہ جو دائیں جانب سونہ مرگ سے پرنگ تک دریائے سندھ پر سایہ فگن نظر آتا ہے، بہت سی کوکھ والی وادیاں اور گھاٹیاں بناتا ہے۔ نارن ناگ یا وانگت کی وادی ان میں سے اہم ہے، کیونکہ اس کے بیچ میں سے ایک پہاڑی پگڈنڈی گنگہ بل، نندہ کول جھیلوں کے علاوہ ہرموکھ چوٹی کو بھی جاتا ہے۔ ہرموکھ پہاڑ اپنی برف پوش چوٹیوں کے جھرمٹ سے جنوب کی جانب ستر کلو میٹر لمبی سندھ وادی اور شمال کی جانب

چالیس کلومیٹر لمبی ارن وادی پر نگران فصیل بناتا ہے۔ گنگہ بل سے کئی پگڈنڈیاں اس پہاڑی سلسلہ کی بہت ہی خوبصورت جھیلوں جیسے گاڈہ سر، وشن سر، کرشن سر اور ستہ سر کے علاوہ مہالش چراگاہوں کو بھی جاتی ہیں۔ ایک پتھریلی پگڈنڈی ارن وادی کی طرف اُترتی ہے۔ ہر موکھ پہاڑ جو ۱۶۹۰۳ فٹ اُونچا ہے، کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ

On it the legend says the snow only ceases to fall for one week in july, and men believe that the gleam from the vein of green emerald in the summit of the mountain renders all poisonous snakes harmless

ہر موکھ پہاڑ کی تہہ دار، مخنی اور لمبی وادیاں اور گھاٹیاں درہ تراگہ بل تک جھیل ولر کا فاصل آب نباتی ہیں۔ یہ مدھومتی، پوت شائی اور اجس کی ندیوں کا اصل منبع بھی ہیں۔ ارن وادی جس کے سرے پر سربل جھیل واقع ہے، جنگلاتی مناظر کے لحاظ سے کافی خوبصورت ہے۔ کئی پگڈنڈیاں اس کے بیچ سے گذر کر کیوڈورا، سربل، چتراسہ کی پہاڑی چراگاہوں سے ہوتے ہوئے لول گول درہ، گنگہ بل اور ہر موکھ کے کوہستانوں کو جاتی ہیں۔ دو دیگر پہاڑی چراگاہیں مدھومتی وادی اور ناگہ مرگ گھاٹی آبشاروں، صنوبری جنگلات اور سرسبز گھاس کے ڈھلوانوں کیلئے جانی جاتی ہیں۔ درہ تراگہ بل سے پہاڑوں کی ایک اور ذیلی شاخ مغرب کی طرف مڑ کر لولاب کا وہ اُوپری پہاڑی حصہ ترتیب دیتا ہے، جو دریائے پُہرو کی معاون ندیوں تلر، کاہنل۔ مادر اور لولاب کا اصل منبع ہے۔ یہ پہاڑی دیوار خود کاجی ناگ کے پہاڑ میں ضم ہونے سے پہلے راجوار کے اُوپری علاقوں کو تقسیم بھی کرتا ہے اور اُن کریوا پہاڑیوں کے تہہ دار سلسلے کا نکتہ عروج بھی بنتا ہے جو کاجی ناگ پہاڑ کا دامن بناتے ہیں۔ ان جنگلاتی کریوا پہاڑیوں میں کئی خوبصورت فرودگاہیں ہیں، اور شاداب چراگاہیں واقع ہیں۔ ان میں سے وادی بنگس جو سطح سمندر سے ۹۵۰۰ رفٹ اُونچی ہے، جنگلاتی مناظر، روئیدگی اور خوشنما نشیب و فراز والی کیریوں کیلئے جانی جاتی ہے۔

اُوپر بیان کیے گئے کوہساروں، وادیوں اور پہاڑوں کے بیچ بیضوی شکل کی وادی کشمیر، جس کو ہمالیائی جنت بھی کہا جاتا ہے، ایسی نظر آتی ہے، جیسے موتیوں کے ہالہ میں نگینہ۔ ان پہاڑوں کی خوبصورتی، اِن کا اُبھار اور ان کی بناوٹ دیکھنے سے بنتی ہے۔ یورپی سیاحوں کے مطابق یہ تو یونان کے پہاڑوں سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ ٹینڈل بسکو نے جب ان پہاڑوں کو دیکھا تو بے ساختہ لکھا:

> ... one thinks of Moses on mount pisgah viewing the promised Land

اور سر والٹر لارنس کے مطابق:

> no figure can give a true idea of the splendid variety in the trend of the ranges, in the midst of which lie other vales.

☆☆☆

☆ اپنی نگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں۔ تبدیلی پتہ/ یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

☆☆☆

☆......عبدالغنی شیخ

لداخ کا جغرافیائی محل وقوع اور چین سے روابط

لداخ کا جغرافیائی محل وقوع گہری اہمیت کا حامل ہے۔اس کے مشرق میں تبت، شمال میں مشرقی ترکستان (شین جیانگ) شمال مغرب میں بلتستان، مغرب میں کشمیر اور ڈوڈہ اور جنوب میں ہماچل پردیش اور پنجاب ہیں۔

لیہہ وسط ایشیا کا اہم تجارتی مرکز تھا۔ وسط ایشیا کے ملکوں تبت، پنجاب، کشمیر ہماچل پردیش اور بلتستان سے تجار لیہہ آتے تھے اور اشیا کی خرید وفروخت اور تبادلہ کرتے تھے۔لداخیوں کی اپنی ضروریات بھی ان سے پوری ہوتی تھیں۔لیہہ کی افادیت کے پیش نظر ایک انگریز جوئنٹ کمشنر آر ایل کینیون (R.L. Kennion) لکھتا ہے۔ ''نہر سوئز کے لئے پورٹ سعید جتنا اہم ہے۔وسط ایشیا کے تجارتی راستے کے لئے لیہہ اہم ہے۔'' تجارت کے علاوہ تبت، کشمیر اور بلتستان سے لداخ کے سماجی، ثقافتی اور مذہبی تعلقات تھے۔

اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے ہمسایہ ملکوں اور خطوں میں لداخ کی بڑی قدر وقیمت تھی، جسے لداخ کو فائدے اور نقصانات دونوں پہنچے ہیں۔کبھی منگول حکمران تبت پر حملہ کرتا تھا اور کبھی مشرقی ترکستان شین جیانگ) میں بغاوت ہوتی تھی۔ دونوں خطوں کی سرحدیں لداخ سے ملتی تھیں۔اس لئے لداخ چین کو دونوں خطوں کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کر سکتا تھا۔چین کے شہنشاہ چینگ نے آٹھارہویں صدی میں لداخی

حکمران سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور معلومات حاصل کیں۔ لداخی مسافروں اور تاجروں کو چین کے مذکورہ دونوں خطوں میں آنے جانے کی پوری آزادی تھی۔ اس ضمن میں پروانہ راہداری کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ لہاسہ اور کاشغر میں چینی امبان (افسر اعلیٰ) تک ان کی رسائی تھی۔

۱۷۲۰ء کے آس پاس ڈژونگر منگول نے تبت پر قبضہ کیا اور چین نے لداخی راجوں سے تبت کی صورتحال سے متعلق معلومات مانگیں۔ راجا نیما نمگیل نے نونو بذانگ نیما کی سرکردگی میں پہلے منگولیا کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے ایک سفارتی مشن بھیجا۔ اس کے بعد لہاسہ کے راستے ایک مشن بیجنگ روانہ کیا جس نے چینی حکومت کو اہم معلومات فراہم کیں۔ ایسے مشن ۱۷۲۳ء، ۱۷۳۸ء اور ۱۷۴۳ء چین بھیجے اور صورت حال سے آگاہ کیا، جو چین کے لئے بڑی مفید تھی۔ چینی شہنشاہ نے بطور تشکر اور تحسین لداخی راجا کو تحفے تحائف بھیجے۔ 1821ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم انگریز ڈاکٹر ولیم مورکرافٹ نے لیہہ میں چینی شہنشاہ کا لداخی راجا کو ارسال کردہ ایک خط دیکھا جس میں تحفوں کی فہرست دی گئی تھی۔ ان میں لاجورد، پشپ، agate (ایک قیمتی) پتھر اور ریشم شامل تھے۔ منگول حکومت بھی لداخ کے حکمران سے تعلقات قائم کرنے کی خواہاں تھی۔ اس سے منگول حکمران کو تبت اور وسط ایشیا میں مہم جوئی کے لئے لداخ کو بطور اڈہ استعمال کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ لداخی حکومت نے چین سے دوستی قائم رکھنے میں اپنا مفاد سمجھا۔ تبت اور شین جیانگ سے لداخ کے تجارتی تعلقات تھے۔

چین کے شہنشاہ سوہانگ دے نے راجا دیسکیونگ نمگیل کو ایک خط میں اس کے نمائندے پالی فولاد کو مدد جاری رکھنے کے لکھا تھا جس طرح راجا کے والد نیما نگمیل نے اس کے نمائندے کنچن سے تعاون کیا تھا۔ خط میں لداخی راجا کو اس کی خدمات کے لئے خلعت ناخرہ اور توصیفی سند عطاء کرنے کا تذکرہ بھی تھا۔

۱۸۵۹ء میں چین نے شین جیانگ کے شہر کاشغر اور یارقند میں ایک بغاوت کچل

دی۔ چینی کمانڈر کو یہ اندیشہ تھا کہ باغی رہنما برہان الدین اور خواجہ جہاں لداخ فرار ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ لیہہ ایک فوجی دستہ بھیجنے کا منصوبہ بنایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ باغی رہنما بدخشاں فرار ہوئے ہیں اور وہیں ہلاک کئے گئے ہیں۔ لداخی راجا نے اس کامیاب کارروائی کے لئے بطور سفارت کارٹشی گیاژو کو مبارک دینے کے لئے چین بھیجا۔ ٹشی گیاژو نے حسبِ معمول تجارتی تعلقات قائم رکھنے کے لئے چینی حکام سے درخواست کی۔

انیسویں صدی کے شروع میں لداخ کے آخری راجا چھیپل تنڈوپ نمگیل نے وسط ایشیا کے کوکنڈ کے مفرور شاہزادہ عبدالستار آدی جان کو پناہ دی جس نے پرانے خواجہ خاندان کی ایک اولاد جہانگیر کو کاشغر میں آبائی حکومت بحال کرنے کے لئے ناکام مدد کی تھی۔ بعد میں نوبراہ کے ایک رئیس کے مشورے پر راجا نے مفرور شاہزادہ اور اس کے ساتھیوں کو لہاسہ کے امبان کے حوالے کیا جہاں ان کو موت کی سزا دی گئی۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف کے دوران ترکوں نے شین جیانگ میں چین کے خلاف بغاوت کی اور یعقوب بیگ نے اقتدار حاصل کیا۔ چینی شہنشاہ نے لیہہ کے ڈوگرہ گورنر کو خط لکھا جس میں یعقوب بیگ کی فوج کی نقل و حرکت کے بارے میں چینی امبان کو مطلع کرنے کے لئے استدعا کی گئی تھی۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ خط کا جواب دیا گیا ہے یا نہیں۔ البتہ برطانوی ہند حکومت اور کشمیری حکمران مہاراجہ رنبیر سنگھ نے یعقوب بیگ سے سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم کئے۔

سترھویں صدی میں پانچویں دلائی لاما کے حکم پر تبت نے لداخ پر فوج کشی کی۔ لداخی راجا لیہہ سے بزگو فرار ہوا جہاں تین سال جھڑپیں ہوتی رہیں۔ لداخی راجا کی درخواست پر مغل شہنشاہ اورنگزیب نے مدد کی اور تبتی فوج کو پسپا کیا۔ لداخ، مغل حکومت کا باج گزار تھا۔ مغل حکمران اور لداخی راجا دے لیگس نمگیل ایک دوسرے کے زیادہ قریب آئے۔ اس صورت حال سے چھٹویں دلائی لاما سنگیں گیاژو کو گہری تشویش ہوئی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لداخ پر کشمیر اور اسلام کا اثر و نفوذ ہو۔ انہوں نے کرگیوت پاڈوگپا فرقہ کے

سب سے بڑے لاما چھٹواں ڈوگیار رینگبو چھے میتھم وانگبو کو راجا دے لیگس نمگیل سے ملاقات کرنے اور صدیوں پرانے مذہبی اور سماجی رشتے کو بحال کرنے کیلئے ۱۶۸۴ء میں لداخ بھیجا۔ ڈوگچین رینگبو چھے کا لداخ میں بڑا اثر ورسوخ تھا۔ انہوں نے راجا دے لیگس نمگیل سے تینگ موگانگ میں ملاقات کی اور دلائی لاما کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے دونوں خطوں کے لوگوں کے بودھ دھرم کے پیروکار ہونے کا حوالہ دیا اور دونوں کے درمیان حالیہ جنگ کو قصہ پارینہ سمجھنے کی تاکید کی۔ دے الیگس نمگیل قائل ہوا۔ اور ۱۶۸۴ء کا اہم معاہدہ عمل میں آیا۔ جس کے تحت تبت۔ لداخ کی دیرینہ سرحدیں متعین ہوئیں اور لوپچق اور چابا کے سفارتی اور تجارتی مشن کے تبادلے کا فیصلہ ہوا۔ لوپچق ایک سفارتی اور تجارتی مشن تھا، جو ہر تیسرے سال لداخ سے تبت جاتا تھا۔ مشن کے ارکان تبت کے سال نو کی تقریب پر لہاسہ پہنچتے تھے اور دلائی لاما کو لداخی حکمران کے تحفے تحائف اور خط پیش کرتے تھے۔ اس وجہ سے مشن کا نام ''سالانہ سلام'' پڑا ہے۔ ڈوگرہ دور حکومت کے قیام کے بعد ۱۸۵۲ء میں معاہدے کا اعادہ ہوا اور لوپچق مشن کی روانگی جاری رہی۔ آخری لوپچق مشن ۱۹۴۲ء میں کلون چھوانگ رگزین کی قیادت میں لہاسہ گیا۔ اسے پہلے لیہہ کے ایک سرکردہ مسلم خاندان نے برسوں تک لوپچق کی قیادت کی تھی۔ لوپچق مشن کو بار برداری اور سواری کے لئے ۲۶۰ر گھوڑے اور بار بردار جانور فراہم کئے جاتے تھے۔ تحفے تحائف میں زعفران، کپڑے کا تھان، مونگے، سونا وغیرہ بھیجے جاتے تھے۔ لہاسہ کی حکومت خط کا جواب دیتی اور تحفے تحائف کی رسید سے آگاہ کرتی تھی۔ لوپچق مشن کا ہر جگہ پرتپاک استقبال کیا جاتا تھا۔

تبت سے 'چابا' نام کا ایک سالانہ مشن لداخ آتا تھا۔ چابا کا مطلب 'چائے والا' ہے۔ یہ تبت سے چائے کی ٹکیاں لاتا تھا۔ اسی نسبت سے مشن کے سربراہ کا نام چابا پڑا ہے۔ چابا دلائی لاما کا ذاتی تجارتی رکن ہوتا تھا۔ جو زوم چونگ کہلاتا تھا۔ یہ بھی اپنے ساتھ تحفے لاتا تھا۔ یہ دسمبر میں لیہہ پہنچتا تھا اور اپریل تک قیام کرتا تھا۔ چابا کو بھی سواری اور بار برداری کے لئے جانور فراہم کئے جاتے تھے۔

۱۹۶۴ء سے پہلے لدّاخ۔تبت سرحد پر بات چیت کے دوران چینی وفد نے لوپچق مشن کو خراج سے تعبیر کیا اور اسی حوالے سے لدّاخ پر اپنا حق جتایا تھا۔اس کے جواب میں ہندوستانی وفد نے چابا کی مثال دیتے ہوئے چینی دلیل کو مسترد کیا۔

ان مذکورہ دو واقعات سے یہ عیاں ہے کہ جہاں ہندوستان کی مغلیہ حکومت کو لداخ کی خود مختاری اور علاقائی سلامتی کا احساس تھا، وہاں تبت لداخ کے ساتھ اپنے صدیوں پرانے مذہبی، سماجی اور ثقافتی تعلقات پر کسی قسم کی آنچ آنے دینا نہیں چاہتا تھا۔

مورکرافٹ نے ایک مہر بند خط کا ذکر کیا ہے۔جس پر چینی حکومت کی مہر تھی۔خط میں لداخی راجا سے درخواست کی گئی تھی کہ کاشغر کے خواجہ کی فوج کی نقل و حرکت سے متعلق کوئی جانکاری ہو تو اسے تفصیل سے لہاسہ تک پہنچائے۔مورکرافٹ کو احساس ہوا کہ ہمسایہ حکومتیں لداخ کو کتنی اہمیت دیتی ہیں۔مورکرافٹ خود چاہتا تھا کہ لداخ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین سیاسی اور تجارتی تعلقات قائم کیے جائیں۔وہ اس مقصد میں کامیاب ہوا اور اس ضمن میں ازبکستان اور ترکستان جاسکتے تھے لیکن کمپنی نے اس معاہدے کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔مورکرافٹ کو گریٹ گیم کا پہلا انگریزی کھلاڑی کہا گیا ہے۔

پنجاب کا حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ لداخ پر قابض ہونا چاہتا تھا۔مورکرافٹ نے اس سے باز رکھا۔تب مورکرافٹ لداخ میں تھا۔اس کے تیرہ سال بعد رنجیت سنگھ نے ۱۸۳۴ء میں اپنے ایک سابق جرنیل اور جموں کے راجا گلاب سنگھ سے لداخ پر حملہ کرایا اور لداخ کو جموں کی قلمرو میں شامل کیا گیا۔

روس کی نظر لداخ پر تھی۔وہ لداخ کی حکومت سے وفاداری کا طلب گار تھا۔اس ضمن میں روس نے لداخ کو تجارتی طور فائدہ پہنچانے اور لداخی حکمران کو القابات سے نوازنے کا وعدہ کیا تھا۔مورکرافٹ کے لداخ میں قیام کے دوران ایک روسی یہودی رافے لوف کے بارے میں سنا۔جو آغا مہدی کے جعلی نام سے روس کے لئے لداخ میں کام کرتا تھا۔مورکرافٹ کو اس کی لائی ایک چٹھی ملی جو روس سرکار نے پنجاب کے حکمران مہاراجہ

رنجیت سنگھ کو لکھی تھی۔روس رنجیت سنگھ سے سفارتی تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔بعد میں پیش آنے والے واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زار روس اپنی سلطنت کی توسیع دینے کی پالیسی کے مطابق لداخ پر قابض ہونا چاہتا تھا لیکن برطانوی ہند سرکار کی حکمت عملی کی وجہ سے روس کی نہیں چلی۔ہند سرکار کشمیر اور پنجاب کی حفاظت کے لئے لداخ کو روس کی دستبرد سے محفوظ رکھنا ضروری سمجھتی تھی۔روس نے اپنی پالیسی کے تحت لداخ اور کشمیر اپنے جاسوس اور نمائندے بھیجے تھے۔

لداخی حکومت اپنی بقا کے لئے نت نئی حکمت عملی سے کام لیتی تھی۔اس ضمن میں میں اپنے ایک مضمون[1] کے اقتباس کا حوالہ دیتا ہوں:

> ''اپنی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے لداخ کے خود مختار سیاح کاشغر اور لہاسہ کے سرکاروں اور کشمیر کے گورنر کے دہلی کی حکومت کو اپنے ہمسایوں کی فوجی اور سیاسی صورت حال سے باخبر رکھتے تھے اور کئی دفعہ اپنی سیاسی مصلحت کوشی کے تحت غلط اطلاعات فراہم کرتے تھے۔ چنانچہ لداخ کی حکومت کی طرف سے کبھی کشمیر کے مغل گورنر کو تبت یا چین کی فوجی نقل وحرکت کا گھڑا ہوا افسانہ سنایا جاتا تھا اور کبھی کشمیر یا شین جیانگ کی عسکریت پسندی کا قصہ سنا کر تبت سے یک جہتی اور دوستی کا دم بھرا جاتا تھا۔اس طرح لداخ اپنے پڑوسیوں میں اپنی حیثیت اور اعتماد برقرار رکھنے میں کامیاب رہتا تھا۔''

لداخی راجا چھپیل تنڈوپ نمگیل نے ۱۸۲۰ء میں مورکرافٹ کو لیہہ میں رہنے کی اجازت اور سہولیت دی تو اس کی صدائے بازگشت لہاسہ، لاہور اور سرینگر تک پہنچی اور سبھوں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مورکرافٹ کے خلاف ایسٹ

---

[1] لداخ اور بڑی طاقتوں کی سیاسی کشمکش (تاریخی پس منظر) ماخوذ ''لداخ۔تہذیب و ثقافت''۔

انڈیا کمپنی سے شکایت کی۔ موجودہ ہماچل پردیش کی ایک چھوٹی ریاست بشاہیر اور اسکردو کے راجاؤں نے لدّاخ حکومت سے دریافت کیا کہ یہ انگریز لدّاخ کیوں آیا ہے۔ اس قسم کے واقعات سے پورے خطے میں تشویش ہوتی تھی۔

زیرِ نظر مظمون میں لداخ کی مناسبت سے چین اور ہندوستان کے تعلقات پر تبصرہ کیا گیا ہے اور تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے:

ساتویں صدی سے نویں صدی کا زمانہ: جب لدّاخ، وسط ایشیا، گلگت اور بلتستان کا پورا خطہ ایک بڑا سیاسی اور فوجی اکھاڑہ بنا تھا اور چین، تبت، کشمیر اور عرب حکومتیں ایک دوسرے سے متصادم ہوئی تھیں۔

آٹھارہویں صدی سے اوائل بسویں صدی کا زمانہ: جب زار روس نے توسیع پسند پالیسی اختیار کی تھی اور برصغیر ہند کی سرحد پر لدّاخ اور گلگت کو خطرہ لاحق ہوا تھا۔ جسے تاریخ میں Great Game کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

موجودہ دور: چین میں کمیونسٹ حکومت برسراقتدار آنے کے بعد سرحدی تنازعہ نے دوبارہ سر اٹھایا ہے اور معاملے نے سنگین صورت اختیار کیا ہے۔

یہاں ہم تینوں ادوار پر روشنی ڈالیں گے۔

ساتویں صدی سے نویں صدی کا زمانہ:

ساتویں صدی میں تبت فوجی لحاظ سے ایک طاقت ور ملک تھا اور اس کا حکمران رونگ ژن گمپو (۶۲۰ـ۶۴۹ء) ایک جنگجو اور مضبوط حکمران تھا۔ اس کا ایک قابل وزیر لونپو ریکپا چن لدّاخ کے گاؤں مشر گولا سے تعلق رکھتا تھا۔ ۶۴۱ء میں لونپو ریکپا چن کی سفارت کاری سے رونگ ژن گمپو کی شادی ایک چینی شاہزادی وین چائینگ سے ہوئی۔ لیکن اس رشتہ سے چین کے ساتھ باہمی تعلقات میں کوئی مثبت اور خوشگوار نتیجہ نہیں نکلا۔ تبت نے چین کو اپنے حملے کا ہدف بنایا۔ اس توسیع پسند پالیسی نے لگ بھگ تین سو سالہ جنگ کو ہوا دی جس میں بعد میں کشمیر کے بادشاہ للیتادتیہ مکتہ پیڈ اور عرب عباسی خلیفہ شامل ہوئے۔

اس کی لپیٹ میں مشرقی ترکستان، گلگت بلتستان اور چین کا صوبہ کانسو آئے۔ اس جنگ میں بڑے نشیب وفراز آئے۔ کبھی ایک فریق کا پلّہ بھاری رہتا تھا اور کبھی دوسرا فریق غالب آتا تھا۔ اس پر آشوب دور میں چین میں تانگ خاندان کی حکومت تھی جو ۶۱۸ سے ۹۰۷ تک رہی۔ تب گلگت کو چھوٹا بلور اور بلتستان کو بڑا بلور کہا جاتا ہے۔

۶۶-۶۶۵ء میں تبت چینی ترکستان کے چار شہر کاشغر، ختن، کوچھا اور کاراپر قابض ہوا جنہیں چار گریسین (فوجی چھاؤنیاں) کہا جاتا ہے۔ بلتستان کی حیثیت ایک بفر Buffer ریاست کی تھی اور یہ حملہ آوروں کے رحم وکرم پر تھا اور موقع ومحل کے مطابق فریقین کا ساتھ دیتا تھا۔ تبتی حملہ آوروں نے بلتیوں سے کہا: "ہم تمہاری سرزمین کے خلاف سازش نہیں کر رہے ہیں بلکہ چار شہر کاشغر، ختن، یارقند اور کارغالیک پر حملہ کرنے کے لئے آپ کے راستے سے فائدہ لے رہے ہیں۔"

چین نے بھی گلگت کے لوگوں سے یہی عذر پیش کیا تھا کہ اس کی جنگی مہم کا مقصد گلگت پر قبضہ کرنا نہیں بلکہ دشمن کا سامنا کرنے کے لئے اس کی فوجوں کو نقل وحرکت کے لئے اس کی زمین کو بطور گزرگاہ استعمال کرنا ہے۔

لدّاخ بھی تبتی فوج کے لئے گزرگاہ کا کام دیتا تھا۔ بقولِ ڈوروتھی ووڈمین[1] اس جنگ میں لدّاخ کا اہم کردار رہا ہے۔ چین ترکستان کے علاوہ کشمیر بلتستان، لدّاخ اور مغربی تبت کو اپنے کنٹرول میں لینا چاہتا تھا۔

تبتی فوج تبت سے لدّاخ کے علاقے زنسکار میں داخل ہوتی تھی۔ جہاں سے کرگل بلتستان اور گلگت سے ہوتے ہوئے محاذ جنگ تک پہنچتی تھی۔ تبتی اور لدّاخی زبانوں میں گلگت اور ہنزا کو درُوش اور ختن کو لی کہا گیا ہے۔ پہلے پہل لدّاخ میں تبتیوں کی موجودگی کا ذکر فارسی کی ایک کتاب "حدود عالم" میں ملتا ہے۔ یہ کتاب ۸۲-۹۸۳ میں لکھی گئی تھی۔

دوسرا راستہ اکسائی چین سے ہوتا ہوا تبت جاتا تھا۔ جس پر چین نے ۱۹۵۶ء

[1] Himalayan Frontiers-Dorathy woodman, 1969

میں گاڑیوں کی آمد ورفت کے لئے سڑک بنائی ہے۔ یارقند جانے کے لئے لیہہ کے پاس خردونگ کا راستہ ۱۹۶۸ء میں برٹش جوئنٹ کمشنر ڈاکٹر کیلے نے دریافت کیا۔

تبتی حکمران کنز نگ دورجے (۶۷۹-۷۰۵ء) کے عہد میں تبت کی فوج نے بلتستان کو دوبارہ اپنے زیر قبضہ لایا۔ تب کشمیر اور چین ایک دوسرے کے حلیف تھے اور تبت اور عرب ایک معاہدہ کے تحت متحد ہوئے تھے۔ فریقین پوری ایک صدی تک نبرد آزما ہوئے۔ ۷۱۲ء میں بلتستان سے ترکستان جانے والے دروں پر تبت کا غلبہ ختم ہوا۔ ۷۲۳ء میں للیتہ دیتہ مکتا پیڈ (733-649ء) نے لداخ اور مغربی تبت کو زیر نگین لایا۔ 733ء میں للیتہ دیتہ فوت ہوا۔ اس کی موت کے ساتھ اس کی وسیع سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ تاہم بارھویں صدی تک کشمیر میں اس کی فتوحات کا دن منایا جاتا تھا۔ کلہن نے راج ترنگنی میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور عرب مورخ ابوریحان البیرونی نے گیارھویں صدی میں لکھا ہے کہ شادیانہ کا یہ دن ماہ چترا کے دوسرے روز منایا جاتا ہے۔

۷۲۵ء میں ٹھی رونگ دیستن تبت کا بادشاہ بنا۔ وہ بھی رونگ ژن گمپو کی طرح بڑا جنگجو تھا۔ اس کے عہد میں تبت کی طاقت معراج پر پہنچی۔ ۷۳۷ء میں تبت نے چین کے مفتوحہ علاقوں پر ہلہ بول دیا اور ان کو زیر قبضہ لایا۔ بلتستان ایک دفعہ پھر تبت کے ہاتھ آیا۔ ۷۴۷ء میں بلتستان کے راجا نے تبت سے دوستانہ معاہدہ کیا۔

۷۴۷ء میں چین نے پامیر کے راستے تبت کے مضبوط گڑھ داکھان فتح کیا۔ بعد میں یہ جگہ دارالاتبت کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کامیابی کے بعد چینی فوج نے گلگت کی طرف پیش قدمی کی لیکن عرب فوج کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ۷۵۱ء میں عربوں نے دریائے تالاس کے کنارے چین کو فیصلہ کن شکست دی۔

جنگ کے آخری مرحلے میں عرب۔ تبت کے دوستانہ معاہدے میں دراڑ آئی۔ عرب مکر گئے۔ خلیفہ ہارون الرشید (۷۸۵-۸۰۹ء) نے چین کے دربار ایک میں سفیر بھیجا اور تبت کے خلاف مشترکہ محاذ کھولنے کی تجویز رکھی۔ جسے چین نے قبول کیا۔ دونوں کی

ساجھے داری اور مشترکہ حملہ تبت کے لئے بھاری پڑا۔ تبت نے سارے مفتوحہ علاقے کھوئے۔ تبت کی سرحد اپنے علاقے تک محدود رہی۔ تبت کے حکمرانوں نے چین پر فوج کشی کا ارادہ ترک کیا۔ ۸۲۲ء میں چین اور تبت کے درمیان عہد نامہ ہوا، جس کے تحت دونوں ملکوں کے مابین ہمیشہ کے لئے لڑائی نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ عہد نامے کا متن سنگی ستونوں پر تراشا گیا۔ تقریباً ۲۰۰ سال تک تبت مشرقی ترکستان کا مالک رہا۔ حالات تبت کے لئے سازگار نہیں تھے۔ نویں صدی کے آغاز میں تبت داخلی خلفشار سے بھی دوچار ہوا اور مزید کمزور ہوا جس کا اختتام بودھ دشمن بادشاہ لنگ ترما کی ہلاکت پر ہوا۔ تبت کی طاقتور سلطنت ختم ہوئی۔ لداخ اور بلتستان نے آزادی حاصل کی اور بالائی لداخ کے حکمران گیا پاچو کی دعوت پر تبتی نژاد کا ایک شاہزادہ سمکیت دے نیما گون پائین لداخ کا حکمران بنا۔

مشرقی ترکستان (شین جیانگ) سے لداخ پر صدیوں سے حملے ہوتے رہتے تھے۔ دسویں صدی کے اختتام پر مشرقی ترکستان کے ختن کی جنگجو خانہ بدوش قوم نے لداخ پر حملہ کیا اور حملہ آور لداخ کے علاقے شایوق تک پہنچے۔ تب بالائی لداخ پر گیا پاچو کی حکومت تھی اور گیا اس کی راج دھانی تھا۔ شایوق میں گیا پاچو نے ایک قلعہ تعمیر کیا تھا۔ فریقین میں جنگ وجدل جاری رہی۔ تب ختن نے ایک بڑی فوج بھیجی جس نے لداخ کے گاؤں چیکتن تک تباہیاں پھیلائیں اور بہت سارے قیدی اور لوٹ مار کا مال لے کر لوٹے۔ یورگولیک نام کے مقام پر کچھ فوجی رکھے، جن کو لداخیوں نے قتل کیا۔ ختن نے سرکوبی کے لئے ایک بڑی فوج بھیجی۔ گیا پاچو نے مغربی تبت کے پورانگ کے حکمران سے مدد مانگی۔ دونوں کی مشترکہ فوج نے ختن کی فوج کو شکست دی۔ گیا پاچو لڑائیوں سے نالاں تھا اور اس کو یہ احساس ہوا کہ وہ اکیلا لداخ کا دفاع نہیں کر سکتا ہے۔ اس نے تبتی شاہزادہ سکیت دے نیما گون کو مرچے لنگ سے خلسے تک کا اپنا علاقہ پیش کیا۔ نیما گون نے شے کو راج دھانی بنایا اور یکے بعد دیگرے لداخ کا سارا علاقہ اپنے زیر قبضہ لایا۔ گیا پاچو کی حکومت ختم ہوئی۔ سکیت دے نیما گون کی اولاد نے ۱۸۳۴ء تک لداخ پر حکومت کی جب جرنیل زور آور سنگھ

نے لداخ فتح کیا اور جموں کی قلمرو میں شامل ہوا۔

گیاپا چو کی حکومت کے خاتمے کے بعد بھی مشرقی ترکستان سے گاہے گاہے حملے ہوتے رہے۔ پندرھویں صدی سے لداخ کو ایک نئے حملہ آور سے پالا پڑا۔ یہ حملہ آور کشمیر سے نمودار ہوئے۔

۱۴۰۵ء میں کشمیر کے سلطان سکندر (۱۳۸۴۔۱۴۱۳ء) نے لداخ پر حملہ کیا۔ سلطان کے سابق وزیر رائے ماگرے نے لداخ کو اپنے قبضے میں لایا[1] تاہم ایس۔ پی۔ ورما کے مطابق صرف بلتستان پر قابض ہوا۔ سلطان سکندر کے بیٹے سلطان زین العابدین (۱۴۴۰۔۱۴۷۰ء) نے لداخ فتح کیا۔ تب شے لداخ کی راج دھانی تھی۔ سلطان نے اپنے بیٹے آدم خان کو ۱۴۵۱ء کے آس پاس لداخ کا گورنر بنایا۔ لداخی مورخ ایس۔ ایس۔ گیرگن کے مطابق سلطان زین العابدین نے پشمینہ کی فراہمی کے لئے لداخ پر فوج کشی کی تھی۔ جب سلطان کو یقین دلایا گیا کہ باقاعدگی سے کشمیر پشمینہ برآمد کیا جائے گا تو حملہ آور فوج واپس لوٹی۔

سلطان حسن شاہ نے ۱۴۸۳ء میں لداخ اور بلتستان پر دھاوا بولا۔ اس کے ایک کمانڈر سید حسن شاہ نے بلتستان فتح کیا تاہم دوسرے کمانڈر جہانگیر ماگرے کو لداخی راجا لاچھن باگھن نے شکست دی۔ ان سے پہلے کشمیر کے سطان شہاب الدین نے لداخ اور بلتستان پر حملے کئے تھے۔

تاریخ راشدی کے مطابق مشرقی ترکستان کے بادشاہ ابوبکر کے جرنیل میرولی نے لداخ پر فوج کشی کی اور عارضی طور قابض ہوا۔ کتاب ہٰذا کے انگریزی کے مترجم نے الیاس (Ney Elias) کے مطابق یہ حمہ اندازاً پندرھویں صدی کے اختتام پر ہوا تھا۔ اس کے بعد میر مایذید کی سرکردگی میں ترکی فوج نے لگ بھگ ۱۵۱۷ء میں لداخ پر حملہ کیا۔ میر مایذید لداخ میں کہیں سر پہ پتھر لگنے سے ہلاک ہوا تھا۔ سولھویں صدی میں مرزا حیدر

1۔ A History of Kashmir، از پرتھوی ناتھ کول بامزئی۔

دوغلت نے لداخ پر یلغار کی اور عارضی طور قابض رہا۔

مرزا حیدر کے مرنے کے بعد لداخ پر کشمیر سے دو حملے ہوئے۔ پہلا حملہ ۱۵۵۳ء میں حیدر چک، غازی خان اور حبیب خان نے کیا۔ دوسرا حملہ سلطان غازی شاہ (۱۵۶۱۔۱۵۶۳ء) نے کیا۔ اس کی قیادت سلطان کے بیٹے احمد خان، فتح خان چک اور ناصر کتابی نے کی۔ شروع میں لداخیوں نے بھاری تاوان دینا مان لیا۔ بعد میں غالباً مکر گئے۔ کچھ جھڑپیں ہوئیں۔ سلطان کا ایک سرکردہ کمانڈر فتح خان مارا گیا۔ سلطان نے اس کا انتقام لینا چاہا لیکن عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔

ترکوں کا ایک بڑا حملہ سترھویں صدی میں راجا دیلدن نمگیل کے عہد میں ہوا۔ لیہہ کے پاس چھشوت میں گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں فریقین کے بہت سارے سپاہی مارے گئے۔ ہمس کے بڑے لاما کوشوق ستق سنگ راسپا نے تدبر سے سمجھوتہ کرایا اور حملہ آور واپس لوٹے۔

مقامی روایت کے مطابق ایک دفعہ ترکی حملہ آور فوج لیہہ کے نزدیک خردونگ تک پہنچی۔ فوجیوں نے ایک پہاڑی سے لیہہ کی طرف نظر ڈالی۔ فصل کٹائی کا موسم تھا۔ کھیتوں میں ترتیب سے کھلیان رکھے تھے جنہیں حملہ آور فوجی سمجھے۔ بڑی تعداد میں فوج دیکھ کر حملہ آور پسپا ہوئے۔ اس لئے اس پہاڑی کا نام ''مغلوق'' یا جنگی مداجعت یا واپسی پڑا ہے۔ عمر رسیدہ لوگوں کے مطابق اس پہاڑی پر ترکی فوجیوں کا چھوڑا ہوا سامان، گھوڑے کی نعلیں وغیرہ ملتی تھیں۔

کمیونسٹ چین برسراقتدار آنے سے پہلے تبت اور چینی یا مشرقی ترکستان پر چین کی حکومت کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ تبت پر منگول حملے کرتے تھے اور تبتی بھی ان حملوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنگیز خان اور قبلائی خان نے چینی افواج کو شکست دی تھی اور چین کے بڑے علاقے پر اپنا جھنڈا گاڑا تھا۔ تیرھویں صدی میں قبلائی خان تبت پر قابض ہوا۔ منگول سردار گورسی خان نے ۱۶۴۲ء میں تبت پر حملہ کیا تھا اور دلائی لاما لبزانگ

گیاژو (۱۶۱۷-۱۶۸۲ء) کو ملک کا فرمان روا بنایا اور روحانی پیشوا قرار دیا۔ ۱۷۱۷ء میں دُسونگر منگول نے تبت پر ہلّہ بول دیا تھا اور عارضی طور پر لہاسہ پر تسلط قائم کیا تھا۔ ۱۷۵۰ء میں لہاسہ میں شورش ہوئی تھی اور دلائی لاما کی حکومت بحال کی گئی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں تبتیوں نے چینی فوج کو دریائے میکونگ تک ملک بدر کیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں ایک دفعہ اور تبتیوں کو ینگوے تک دھکیل دیا تھا۔ جی ٹوچی نے اپنی کتاب (مطبوعہ: ۱۹۶۷ء) Tibet-Land of Snows میں لکھا ہے: تبت میں چین کے خلاف ۱۹۰۵ء، ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۰ء میں بھی بغاوتیں ہوئیں۔ ۱۹۱۰ء میں چین نے مداخلت کی اور دلائی لاما کالیمپونگ بھاگ گئے۔ وہ ۱۹۱۲ء میں واپس لوٹے۔ کمیونسٹ چین کے زیرنگیں آنے سے ایک سال پہلے تبتی حکومت کے ایک سفارتی وفد نے اپنے پاسپورٹ پر امریکہ اور انگلینڈ کا دورہ کیا تھا۔

یہی صورت حال مشرقی ترکستان کی بھی تھی۔ یہاں بھی گاہے گاہے چین کے خلاف بغاوتیں ہوتی تھیں اور بڑا خون خرابہ ہوتا تھا۔ بغاوت کے بعد کوئی ترک برسراقتدار آتا تھا اور حکومت کرتا تھا۔ ان حکمرانوں میں سلطان سعید، سلطان ابوبکر، اتالیق غازی اور یعقوب بیگ اہم نام ہیں۔ دُسونگر منگول نے اٹھارہویں صدی میں ترکستان کو بھی عارضی طور پر اپنے زیرقبضہ لایا تھا۔

ہمسایہ ملکوں میں ایک مضبوط اور مستحکم حکومت لداخ کے لئے خوش آئند تھا۔ لداخ حملہ آوروں کی دستبرد سے محفوظ اور مامون رہتا تھا۔ مشرقی ترکستان میں چین کی عمل داری ہوتی تو لداخ پر حملے بند ہوجاتے۔ اس طرح جب کشمیر مغلیہ سلطنت کا حصہ بنا تو لداخ میں لگ بھگ فوجی یورش ختم ہوگئی اور خطے میں امن وسکون رہا۔ مغل حکومت نے سرینگر کے پاس لداخی راجا کو ایک جاگیر دی تھی۔ جسے ہر سال پانچ سو بوریاں چاول دستیاب ہوتی تھیں۔ لداخی حکومت کشمیر کے مغل گورنر کو تھوڑا سا باج دیتا تھا۔ مغل حکمرانوں کو لداخ کے پشمینہ سے دلچسپی تھی جو بلاناغہ کشمیر برآمد ہوتا تھا۔

لداخ نے اپنی ایک ہزار سالہ تاریخ میں چند جنگجو اور توسیع پسند حکمران پیدا کئے

ہیں۔ ان میں لاچھن اوت پالا (۱۰۸۰۔۱۱۱۰ء) کا نام سرفہرست ہے۔ اس کی سلطنت میں موجودہ لداخ کے علاوہ مغربی تبت ،بلتستان، گلگت، نیپال کا علاقہ ماستنگ اور کلوسمیت ہماچل پردیش کا بڑا علاقہ شامل تھا۔ تب لداخ مغربی ہمالیہ میں سب سے طاقت ور ملک تھا۔

راجا چھوانگ نمگیل اوّل اور راجا سینگے نمگیل اس زمرے میں آتے ہیں۔ اوّل الذکر نے ترکوں کے آئے دن کے حملوں سے نالاں ہو کر یارقند (لداخی مشرقی ترکستان کو یار قند کہتے ہیں) پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ نوبراہ وادی کے باشندے اس سے بڑے ہراساں ہوئے کیونکہ نوبراہ وادی ترکستان۔ لداخ تجارتی راستے پر پہلے آتی ہے اور کسی جوابی حملے کی صورت میں سب سے پہلے یہ لوگ زد میں آسکتے ہیں۔ نوبراہ کے نمائندے راجا سے ملے اور ترکستان پر حملہ نہ کرنے کے لئے درخواست کی۔ راجا نے ان کی درخواست مان لی۔ سینگے نمگیل نے دوبارہ مغربی تبت کو اپنے زیر نگیں لایا۔

لداخ کی سرحدوں پر چھاپہ مار قسم کے دھاوے ہوتے تھے۔ چھاپہ مار لوٹ مار کا مال کر چمپت ہو جاتے تھے۔ مرزا حیدر کے مطابق سلطان سعید کی تخت نشینی کے بعد لوٹ مار کے لئے لداخ کئی پارٹیاں بھیجی گئی تھیں۔

۱۸۲۲ء میں کلو نے سپیتی پر حملہ کیا۔ پھر کینور اور لاہول سے مل کر زنسکار پر دھاوا بولا۔ زنسکار کے صدر مقام پدم سمیت سارے علاقے کو لوٹا اور تباہ کیا۔ تین سال بعد پاڈر کے رتن شیر خان نے اٹینگ سے پدم تک سارا زانسکار تباہ کیا۔ مصیبت یہاں ختم نہیں ہوئی۔ منڈی اور دردام کی فوج نے دوبارہ زنسکار کو لوٹا۔ ۱۸۳۴ء سے ڈوگرہ فوج کی زیادتیاں شروع ہوئیں۔ ماضی میں گرمیوں میں کشتواڑ سے بکروال لوٹ مار کے لئے زنسکار آتے تھے۔

۱۸۲۲ء میں کشمیر جاتے ہوئے مورکرافٹ جب دراس پہنچا، پڑوس کے حسورا (استور) کے راجا کے آدمیوں نے گاؤں پر ڈکیتی ماری تھی۔ مورکرافٹ کے چند سپاہیوں نے ہوا میں گولیاں چلائی تھیں لیکن ڈکیتی مار سینکڑوں آدمیوں اور ہزاروں بھیڑ

بکریوں اور مویشیوں کو ہانک کر لے گئے۔ صبح مور کرافٹ زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے لگا۔ بہت سارے نیم دھڑنگ لوگ اس سے پناہ مانگنے لگے۔

دراس میں گاہے گاہے ڈاکہ زنی ہوتی تھی۔ لداخی راجا اور کشمیری حاکم جو مالک کہلاتے تھے۔ گاؤں والوں کو تحفظ دینے میں ناکام رہے تھے۔ لداخ کے آخری راجا نے مالک کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ابوریحان البیرونی کے مطابق کشمیر میں قدیم زمانے میں وادی کشمیر میں ان داخل ہونے والی دروں پر حملوں سے حفاظت کے لئے چھوٹے چھوٹے قلعے تعمیر کئے جاتے تھے۔ ہندوؤں کے زمانے میں بھی ان قلعوں کو بروئے کار لایا جاتا تھا۔ ان کے محافظوں کو Lord of the Gate کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں محافظوں کے نگران کو مالک کہا جاتا تھا۔ یہ محافظ گاہ رہداری یا چوکی کہلاتی تھی۔ پروانہ رہداری کے بغیر کسی کو وادی سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

مور کرافٹ لکھتا ہے کہ مالک اور اس کے اہل کار بڑے ظالم اور بد دیانت تھے۔ ایک دفعہ لداخ نے بھی جوابی حملے کے لئے چھاپہ مار دستے بھیجے تھے لیکن یہ نہیں لکھا ہے کہ انہیں کیوں بھیجا گیا تھا۔

۱۸۸۹ء میں دو کرغیز لیہہ آئے تھے۔ ان کے نام ساقی ولی اور موسی تھے۔ یہ خانہ بدوش کرغیز ترکستان۔ لیہہ تجارتی راستے پر واقع شہید دلہ کی چراگاہ پر اپنے جانوروں کو چُراتے تھے جہاں Kanjuts یعنی ہنزہ والے لوٹ مار کے لئے آتے تھے۔ انہوں نے کشمیر دربار سے استدعا کی کہ شہید دلہ کے قلعہ کو دوبارہ اپنی تحویل میں لائے اور اُنہیں ہنزہ کے ڈاکوؤں سے نجات دلائے۔ یہ قلعہ ڈوگرہ تھانیدار بستی رام نے تعمیر کیا تھا۔ جسے انگریزوں نے چین کا علاقہ بتا کر خالی کرایا تھا۔ یارقند میں چین کے اہل کار نے کرغیزوں سے اس بنا پر مدد دینے سے انکار کیا تھا کہ کرغیز چین کی سرحد سے باہر رہتے ہیں۔

اسی اثناء میں ۳۱ر جولائی ۱۸۸۹ء کو انگریز فوجی افسر ینگ ہاسبنڈ لیہہ پہنچا۔ اور ۱۷ ڈوگرہ فوجیوں کے ہمراہ شہید دلہ روانہ ہوا۔ ینگ ہاسبنڈ نے کرغیز سردار توردی کول کو پرانے

قلعے کی مرمت کے لئے مالی امداد دی تا کہ ہنزہ کے ڈاکوؤں کی مدافعت کی جا سکے۔ یعقوب بیگ جب ترکستان کا سلطان بنا تو شہید ولہ کو اپنے زیر قبضہ لایا۔

آٹھارہویں صدی سے آوائل بسویں صدی کا زمانہ:

۱۸۳۴ء میں راجا گلاب سنگھ کے جرنیل زور آور سنگھ نے لداخ پر حملہ کیا۔ اس کے لئے انگریزوں سے باقاعدہ اجازت لی تھی۔ اس سے پہلے پنجاب کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی رو سے یہ حملہ کیا۔ لداخ پر فوج کشی پنجاب کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کی دیرینہ خواہش تھی۔ رنجیت سنگھ نے گلاب سنگھ کو اس کی خدمات کے عوض جموں جاگیر میں دیا تھا۔ لداخیوں کی کئی بغاوتوں کو کچلنے کے بعد ۱۸۴۲ء میں ڈوگرہ حکومت لداخ کے سیاہ سفید کا مالک بنا۔ دوسرا ہدف بلتستان تھا جسے ۱۸۴۱ء میں زیر نگین لایا۔ ان فتوحات سے زور آور سنگھ کا حوصلہ بڑھا اور تبت پر حملہ کیا۔ حملہ کرنے سے پہلے زور آور سنگھ نے قلعہ کے پھاٹک کی کھڑکیوں کی مقفل کر دیا اور لوہے کے پترے پر ذیل کے الفاظ لکھ کر کھڑکی کے اوپر جڑ دیا تھا۔

"جب تک لہاسہ فتح نہ ہو، یہ کھڑکی نہ کھولی جائے۔"

۱۹۴۷ء میں یہ کھڑکی کھول دی گئی۔

تبت پر حملہ کرنے سے پہلے زور آور سنگھ نے مشرق ترکستان پر حملہ کا منصوبہ بنایا تھا اور والی مشرقی ترکستان سے خراج مانگا۔ انگریزوں نے زور آور کو حملے سے باز رکھا۔

زور آور سنگھ کے مغربی تبت پر حملے کا برطانوی ہند کا ردِعمل بہت سخت تھا۔ پنجاب کی سکھ حکومت کو ایک سخت خط لکھا اور یہ تحریر کیا کہ ناریس کورسوم (مغربی تبت) چین کا علاقہ ہے۔ ڈوگرہ حکومت کو چین کی حکومت سے پیچیدہ مسئلہ کے تدارک کے لئے مقبوضہ علاقہ خالی کر دینا چاہئے۔

کٹھمنڈو میں انگریز نمائندہ B.H.Hodgson کو پکا خیال تھا کہ کمپنی کا بہترین مفاد گلاب سنگھ کو مزید ایسے اقدام لینے سے روکنا ہے۔ جس سے چین مشتعل ہو۔

زور آور سنگھ نے سنا تھا کہ تبت میں سونے کی کانیں ہیں۔ زمین کے علاوہ وہ سونے کا بھی لالچ تھا جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ مقبوضہ علاقہ کے انخلاء کے لئے ۱۰ دسمبر ۱۸۴۱ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ ایک انگریز افسر جے۔ ڈی۔ کنینگھم کو اس فیصلے پر عمل آوری اور زور آور سنگھ کو واپس بلانے کے لئے لداخ روانہ کیا گیا لیکن حکم نامہ پہنچنے سے پہلے زور آور سنگھ کی فوج کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی تھی اور زور آور سنگھ مارا گیا۔

ستمبر ۱۸۴۲ء میں لداخ۔ تبت کی سرحد کے بارے میں چین کے شہنشاہ اور لہاسہ کے لاما گورو اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے مابین ایک تحریری معاہدہ ہوا، جس کے تحت فریقین نے تبت۔ لداخ کی روایتی سرحد کی توثیق کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ تبت نے لداخ کو اپنے علاقے میں مینسر نام کی ایک جگہ نذر کی۔ انگریزوں کے زمانے میں مرتب کردہ Gazetter of Kashmir and Ladakh میں اسے جاگیر کہا گیا ہے جو تبت کی حکومت نے مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے جانشینوں کو دیا۔ مینسر یا مینسر ترجم کو ہم انگریزی میں Enclave کہہ سکتے ہیں۔ جو غیر ملکی علاقوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ ایک چراگاہ ہے، جس میں کچھ لوگ آباد ہیں جن سے مالیہ لیا جاتا تھا۔ لیہہ سے مینسر پیدل یا گھوڑے پر ۱۷ دن کا سفر ہے۔ جھیل مانسرور سے شمال مغرب کی طرف یہ گرتوق کے راستے پر واقع ہے جہاں سے لگ بھگ دو دن لگتے تھے۔ ۱۹۶۲ء کی ہند۔ چین جنگ تک لداخی حکام یہاں مالیہ جمع کرنے آتے تھے۔ لداخ کے انگریز وزیر (منتظم اعلیٰ) ولیم جانسن نے مینسر کا دورہ کرنے کی کوشش کی لیکن گرتوق میں تعینات چینی افسر نے اس کو گرتوق سے آگے جانے نہیں دیا۔ جان بیرے نے لکھا ہے کہ تھانیدار لہہ بستی رام نے ۱۸۵۳ء میں مینسر سے ۵۶ روپے کا مالیہ حاصل کیا۔ ۱۹۰۵ء میں مالیہ کی رقم ۲۹۵ روپے تک بڑھی۔ تب مینسر میں ۴۴ کنبے تھے جن کی مجموعی آبادی ۸۷ مردوں اور ۸۳ عورتوں پر مشتمل تھی۔

مالیہ کی آمدن سے علاقے کے گمپوں کے چراغ کے تیل کا خرچ نکلتا تھا۔ یہ

کیلاش یاتریوں اور بھارتی تاجروں کا مسکن بھی تھا۔

۱۹۳۹ء میں برٹش ٹریڈ ایجنٹ ڈاکٹر کانشی رام، ۱۹۴۱ء میں ایک لداخی اہل کار چھتین پنچگ اور ۱۹۴۲ء میں لوپچق سے وابستہ ایک لداخی مسلم عبدالوحید رادو نے مینسر سے مالیہ جمع کیا۔ روپشو اور سرحدی گاؤں کے نمبردار مینسر سے ہر سال ۶۰ بھیڑیں، ۶۰ بکریاں، ۶ یاک، ۶۰ لیلاؤں (بھیڑ کے بچے) کی کھالیں اور نقد ۶۰ روپے بطور خراج لیہہ انتظامیہ کو حوالہ کرتے تھے۔

لہہ اور لہاسہ دونوں کی رعیت ہونے کی وجہ سے مینسر کی آبادی مشکلات سے دوچار تھی۔ ۱۹۵۰ء کی دھائی میں جب کوشوق بکولا کیلاش یاترا پر آئے تو مینسر کے لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ جموں کشمیر سرکار سے ان کا مالیہ معاف کرائیں۔

تبت میں بھوٹان کا بھی ایک enclave تھا۔ درچین لبرانگ نام کی یہ بستی ماؤنٹ کیلاش کے پاس تھی۔

ایسا لگتا ہے کہ ہندوستانی حکومت نے اب تک چین کے ساتھ مینسر کا مسئلہ نہیں اٹھایا ہے۔

بعد میں انگریز سرکار نے مہاراجہ پر زور دیا کہ لداخ اور تبت کی سرحد کا تعین کرے۔ اس کام کی انجام دہی کے لئے گورنر جنرل لارڈ ہارڈ ینگ نے ۲۸ جولائی ۱۸۴۷ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر کو ایک خفیہ خط لکھا، جس میں یہ لکھا تھا کہ چین اور لداخ کی سرحد کے تعین کرنے کے لئے تین ماہرین پر مشتمل ایک کمیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ممبروں کے نام کپتان الیکزنڈر کننگھم، اے۔ ایچ سٹریچی اور تھامس تھامسن تھے۔ یہ لداخ کا دورہ کریں گے اور دو سال کے اندر حکومت کو رپورٹ کریں گے۔ ان کو مختلف فرائض تفویض کئے گئے تھے۔ انہیں لداخ اور تبت کی سرحد تعین کرانا تھی تاکہ گلاب سنگھ کو سرحدی تنازعہ کے نام پر دوبارہ تبت پر حملہ کرنے کا بہانہ نہ ملے۔ انہیں لداخ کی تاریخ، جغرافیہ، پیداوار اور وسائل جیسے معدنیات، ثقافت اور علم و ادب سے متعلق تفصیلات معلوم

کرنی تھی۔ تجارتی امور میں مراعات حاصل کرنا اور برطانوی ہند کی قلمرو میں پشمینہ کی برآمدات کے لئے گفت وشنید کرنے کی ہدایت تھی۔ اس ضمن میں صرف لداخ کو مغربی تبت کا پشمینہ خریدنے کا اجارہ حاصل تھا۔ اس سلسلے میں انگریز سرکار نے کشمیر کی حکومت سے سپتی کا علاقہ حاصل کیا اور اس کے بدلے میں پٹھا کوٹ کے پاس لکھن پور اور ہزارہ میں ایک چھوٹا سا علاقہ گلاب سنگھ کو دیا۔ ان کا ذمہ خفیہ طور اطلاعات حاصل کرنا تھا۔ انہیں الگ الگ راستے انتخاب کر کے مختلف علاقوں میں جانے کی ہدایت دی گئی تھی۔ یہ افواہ پھیلی کہ ٹیم ختن اور لہاسہ جائے گی۔ البتہ اجازت ملنے کی صورت میں قراقرم سے آگے جانے کی ہدایت دی گئی تھی۔ تاہم اسے آگے ونور تاغ کے پہاڑ عبور نہیں کرے گی۔

الیکونڈر کننیگھم اور سٹریچی .... پہلے لداخ گئے تھے۔ حکومت نے انہیں ضروری آلات، ادویات اور ویکسین فراہم کئے اور برف پگھلنے پر تینوں ممبران لداخ روانہ ہوئے۔

چینی حکام نے کمیشن کے ممبروں سے ملاقات یا تبادلہ خیال کرنے سے گریز کیا اور انہیں تبتی علاقے میں آنے اجازت نہیں دی۔ اس لئے ان کا دورہ لداخ کے علاوہ گڑھوال، بشاہیہ، سپتی اور لاہول تک محدود رہا۔ اگست ۱۸۴۷ء سے جولائی ۱۸۴۸ء تک انہوں نے لداخ کے جنوب سے پنگونگ کے شمال تک دورہ کیا۔ الیکونڈر کننیگھم نے Ladakh-Physical, Statistical and Historiacal کے نام سے ایک معلوماتی کتاب لکھی جو لداخ کی تاریخ، جغرافیہ، پیداوار، وسائل وغیر پر اچھی روشنی ڈالتی ہے اور اس دور کے لداخ کا ایک اہم ماخذ ہے۔ تھامس تھامسن نے لداخ کی نباتات پر ایک اچھی کتاب لکھی۔ سٹریچی نے لداخ کے بارے میں ایک خفیہ رپورٹ تیار کی اور اپنے سفر کے احوال لکھے جو راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذرے۔ ۱۸۴۹ء میں کمیشن کے ممبران واپس ہندوستان لوٹے اور حکومت کو اپنی رپورٹ پیش کی۔

گونڈ کرا نرائن راؤ نے جو ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ہند۔چین سرکاری بات چیت میں

ہندوستانی وفد کا مشیر کار تھا، اپنی کتاب The India-China Border- A reappraisal میں رقم طراز ہے: ''سٹریچی کے نقشے میں جو اطلاعات فراہم کی گئی ہیں، وہ حکومت ہند کے موجودہ دعویٰ سے بہت کم فرق رکھتا ہے''۔ وہ لکھتا ہے۔ ڈاکٹر تھامس تھامسن ہند چین سرحد سے متعلق کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہے۔

روس انیسویں صدی کے آوائل سے ایک توسیع پسند پالیسی پر عمل کر رہا تھا۔ وسط ایشیا کے بعد اس کی نظر ہندوستان پر تھی۔ زار روس پنجاب کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کے لئے کوشاں تھا۔

۱۸۷۳ء میں روسی فوج ہندوستان کی سرحد کے قریب پامیر تک پہنچی اور وہ ہندوستان کی طرف پیش قدمی کے لئے پر تول رہی تھی۔ ایسے میں برطانیہ ہند سرکار کی آنکھیں کھلیں اور روس کی توسیعی پالیسی کے تدارک کے لئے حرکت میں آئی جسے تاریخ میں گریٹ گیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

روسی توسیعی پالیسی سے متعلق قدرے تفصیل سے ''لداخ اور بڑی طاقتوں کی سیاسی کشمکش'' کے نام سے میرا مضمون شائع ہوا ہے۔ زیر نظر مضمون میں گریٹ گیم کے تناظر میں چین اور برطانوی ہند کے درمیان سرد جنگ اور چین اور ہندوستان کے درمیان موجودہ سرحدی تنازعے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

برطانوی ہند سرکار نے لداخ، تبت اور وسطِ ایشیا سروے ٹیمیں، اور جاسوس بھیجے۔ مہاراجہ سے گلگت پر حملہ کرایا۔ انگریزوں کی شہہ پر ۱۸۴۲ء میں ڈوگرہ کمانڈر نتھو شاہ نے استور کا قلعہ فتح کیا۔ معزول راجا کریم خان کی دعوت پر وہ گلگت گیا اور یاسین کے حکمران گوہر رحمان کو جو گلگت پر قابض تھا، شکست دی اور ایک معاہدہ کے تحت گلگت کا مالک ڈوگرہ حکومت بنا۔ انگریزوں نے یاسین کو بھی زیر نگیں لانے کے لئے کہا۔ پھر ڈوگرہ حکومت کی مرضی کے خلاف لیہہ، گلگت اور سرینگر میں اپنے پالیٹیکل افسر مقرر کئے۔ لیہہ میں انگریز افسر کو برٹش جوئنٹ کمشنر، گلگت میں پالیٹیکل ایجنٹ اور کشمیر میں ریذیڈنٹ کہلاتے تھے۔

انہیں غیر معمولی اختیارات تھے۔ یہ وقتاً فوقتاً سرکاری امور میں مداخلت کرتے تھے۔

۱۸۶۲ء میں خفیہ محکمہ کے ایک انگریز افسر کپتان تھامس جاج منٹگمری نے دیکھا کہ ہندوستان کے لوگ لیہہ سے بلاروک ٹوک لہاسہ اور وسط ایشیا جاسکتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ کسی بھی ہندوستانی کو ضروری آلات کے ساتھ خفیہ طور پر وسط ایشیا اور تبت بھیجا جائے تو وہ اپنا کام کرکے آسکتا ہے۔ منٹگمری نے متعلقہ افسران کے سامنے اپنی تجویز رکھی۔ منظوری ملنے پر ایک پنجابی نوجوان محمد حمید کو تربیت دے کر ضروری آلات کے ساتھ ۱۸۶۳ء میں مشرقی ترکستان بھیجا اور ۱۸۷۳ء میں الموڑہ کے ایک استاد نین سنگھ کو لیہہ سے ایک یاتری کے بھیس میں سفارتی مشن لوپچق کے ہمراہ لہاسہ روانہ کیا۔ دونوں نے بڑا عمدہ کام کیا۔ ایک سال بعد نین سنگھ دوبارہ لوپچق اراکین کے ہمراہ لہاسہ گیا۔ لہاسہ میں لداخی نسل کے دو مسلمانوں نے نین سنگھ کو مشکوک پایا اور حقیقت اگلوائی۔ تاہم انہوں نے افشا نہیں کیا۔

۱۸۶۵ء اور ۱۸۸۵ء کے درمیان Great Trignometrical Survey of Dehradun نے ہندوسانی محققوں اور جاسوسوں کو جاسوسی اور سروے کی تربیت دی اور انہیں تبت، وسط ایشیا اور منگولیا بھیجا۔ اندرا سنگھ راوت اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''۱۸۶۴ء میں ان خطوں کے نقشے خالی تھے اور حقائق مسافروں کی کہانیوں پر مبنی تھے یا چین کے مبہم نقشوں پر انحصار رکھنا پڑتا تھا۔''

ان محققوں اور جاسوسوں کے حسب ذیل نام دئے گئے ہیں۔ نین سنگھ، کشن سنگھ، کلیان سنگھ، ہری رام: لالہ، کینتھوپ، شرت چندر اداس، رگزین نمگیل، مرزا شیخ، عطا محمد، عبدالسبحان، ہری رام وغیرہ۔

نین سنگھ کی کارکردگی سے متعلق لکھا گیا ہے: ''ایک فرد جس نے ہمارے دور میں کسی اور فرد کے مقابلے میں ایشیا کے نقشے میں زیادہ مثبت معلومات کا اضافہ کیا ہے۔''

تاہم کشن سنگھ نے نین سنگھ کے مقابلے میں اپنی تحقیق سے زیادہ شہرت حاصل کی۔

۱۸۶۷ء میں ڈاکٹر کیلے کو لیہہ میں برٹش جوئنٹ کمشنر مقرر کیا گیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے احتجاجاً لکھا کہ یہ تقرری اس کے داخلی امور میں مداخلت کے مترادف ہے۔ انگریز حکومت سیتی میں رہ کر ترکستان اور تبت کے واقعات اور تجارتی معلومات جان سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں پنجاب کے انگریز لیفٹیننٹ گورنر نے لکھا کہ وائیسرائے کا حکم حتمی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد گورنر جنرل کا نام بدل کر وائیسرائے رکھا گیا تھا۔

انگریز یہ سمجھتے تھے کہ کشمیر انہوں نے گلاب سنگھ کے تحفے میں دیا ہے۔ سکھوں اور انگریزوں کی لڑائی میں گلاب سنگھ نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ تب گورنر جنرل لارڈ ہارڈینگ نے خفیہ کمیٹی کو اپنے خطوط میں اشارہ دیا تھا کہ وہ گلاب سنگھ کے لئے کوئی مفید کام کرنا چاہتا ہے۔ جب کشمیر کے گورنر شیخ امام الدین نے جموں سے کشمیر کے الحاق کی مخالفت کی تو انگریزوں نے کرنل لارنس کی سرکردگی میں سرکوبی کے لئے فوج بھیجی اور ۹ نومبر ۱۸۴۶ء کو گلاب سنگھ اور لارنس سرینگر میں فاتحانہ طور داخل ہوئے۔ تب گلاب سنگھ نے اپنے ایک خط میں وائسرائے کو لکھا تھا: ''میں جناب والا سے اپنی فرمان برداری کے ثبوت میں اپنی جان اور دولت قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔''

روس کی پیش قدمی کے بعد انگریزوں نے اپنی پالیسی بدل دی۔ ان کی نظر میں روس کا سامنا کرنے کیلئے ایک ہی راستہ تھا کہ ریاست میں زیادہ کنٹرول حاصل کریں۔ انہوں نے رنبیر سنگھ کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ سرحدی علاقوں پر قابض ہو جائے اور فوجی نقطہ نظر سے اہم درہ اشکومن کو اپنے زیر نگین لائے۔ چنانچہ وائیسرائے نے ۱۸۷۶ء میں مادھوپور میں مہاراجہ کو ذاتی طور اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ وائسرائے نے کہا: ''شمالی سرحدوں پر سیاسی حالات کے پیش نظر حکومت ہند چاہتی ہے کہ چترال جیسی ریاستیں کشمیر کی دشمن طاقتوں کی بجائے ہز ہائی نیس جیسے انگریز حکومت کے دوست اور حلیف کے زیر تسلط آئیں۔''

مہاراجہ نے قبول کیا۔ لیکن وائسرائے کی یہ تجویز اس شرط کے تابع تھی کہ مہاراجہ گلگت میں ایک انگریز پالیٹیکل افسر کی تقرری منظور کرے جو سرحد کی صورت حال سے

حکومت ہند کو براہِ راست مطلع کرے۔

کشمیر کو ہندوستان کا شمالی قلعہ کہا جاتا تھا اور گلگت بیرونی چوکی Out post قرار دی جاتی تھی۔ برگیڈیر جرنیل ڈبلیو۔سی۔لوکارٹ W.C.Lockart اور کرنیل ڈورانڈ گلگت کی جغرافیائی اہمیت سمجھتے تھے۔ اول الذکر نے گلگت میں برطانوی ایجنسی کھولنے کی ضرورت پر زور دیا۔ چین ہنزہ کو اہمیت دیتا تھا اور اپنا علاقہ سمجھتا تھا۔

اُن دنوں ہندوستان میں حکومت انگلیشہ چین کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی نظر میں سارا خطہ روس کی طرف سے منڈلا رہا تھا۔ انگریزوں کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ روس مشرقی ترکستان اور تبت کو ہڑپ کرنے پر تلا ہے۔

۱۸۶۵ء میں چین، مشرقی ترکستان کے مسلم باغیوں سے نبرد آزما تھا۔ مہاراجہ نے اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے شہید ولہ کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کیا اور لداخ کے ڈوگرہ تھانیدار بستی رام نے وہاں فوج کی ایک ٹکڑی رکھی۔ شہید ولہ لیہہ سے ۲۱۹ میل دور اور ترکستان کے شہر یارقند سے ۲۴۰ میل دور لداخ۔ ترکستان تجارتی راستے پر واقع ہے۔ یہاں کرغیز کمپ لگاتے تھے۔ ینگ ہاسبنڈ نے شہید ولہ کا مختصر ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> "اس کے گردونواح کا ماحول قدرے اچھا ہے۔ میدان میں ایک قلعہ ہے۔ قریب ایک چھوٹا جنگل اور چراگاہ ہے۔ یہاں قافلے رکتے ہیں۔ شہید ولہ میں تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ قراقش دریا یہاں بہتا ہے۔"

چند سال بعد انگریزوں کے حکم پر ڈوگرہ حکومت نے یہ قلعہ خالی کیا۔ انگریزوں کو رنبیر سنگھ کی یہ Leap Forward پالیسی پسند نہیں آئی۔ رنبیر سنگھ نے اسی پر بس نہیں کیا۔ ۱۸۶۷ء تک مہاراجہ نے کئی جاسوس وسط ایشیا بھیجے۔ ایک فوجی افسر سوہان خان بندوقی کو وسط ایشیا میں چینی فوج کی صورت حال جاننے کے لئے بھیجا۔ اس نے مہاراجہ کی سرکار کو ایک جامع رپورٹ پیش کی۔ اپنے جاسوسوں اور سیاسی مشیروں کی رپورٹ پڑھ کر مہاراجہ کو خطے کی بدامنی سے فائدہ اٹھانے کا خیال آیا اور برطانوی ہند حکومت سے استدعا کی کہ چینی

یا مشرقی ترکستان پر حملہ کرنے اور مفتوحہ علاقے کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی اجازت دے۔ برطانوی حکومت نے مہاراجہ کو اس کے ارادے سے باز رکھا۔ رنبیر سنگھ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے قاصدوں کے ذریعے روس کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی تاکہ انگریزوں سے چھٹکارہ پائے۔ میرے مطبوعہ مضمون ''لداخ اور بڑی طاقتوں کی سیاسی کشمکش'' میں اس کا تذکرہ قدرے تفصیل سے دیا گیا ہے۔

برطانوی ہندسرکار کے اعصاب پر روس کے حملے کا خوف سوار تھا اور اس کے توڑ کے لئے چین کے ساتھ کوئی معاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ جیسے لداخ کی سرحد سے چھونے والے سرحدی علاقے کو نو مین لینڈ میں تبدیل کیا جائے یا بفر علاقہ قائم کیا جائے لیکن چین کی پالیسی ڈھلمل تھی۔ شاید اس بنا پر برطانوی ہندسرکار نے چین پر انحصار نہیں رکھا۔ جب مشرقی ترکستان میں اتالیق غازی اور یعقوب بیگ کی حکومتیں قائم ہوئیں تو برطانوی ہندسرکار نے بے کم وکاست سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم کئے۔ ایک انگریز افسر رابرٹ شا اپنی کتاب Visit to High Teritory, Yarkand and Kashghar میں لکھتا ہے: ''اتالیق غازی بڑی صفات کا مالک تھا۔ وہ خود اپنے ہاتھوں سے کام کرتا تھا۔ پتھر تک اٹھاتا تھا۔ اس سے اس کے ہاتھ پیر پر زخم آئے تھے۔ لڑائیوں کے دوران اس کو گولیاں لگی تھیں۔ اس کے بدن پر ان کے نشانات تھے۔ ان سے درد ہوتا تھا تاہم اس نے کسی کے سامنے کبھی اُف تک نہیں کی۔ البتہ خلوت میں وہ درد سے کراہتا تھا۔''

اس کی فوج میں بہت سارے افغان اور چند ہندوستانی تھے جو بقولِ مصنف ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بھگوڑے سپاہی لگتے ہیں۔ توپ خانہ کے دو بڑے افسر مفرور ہندوستانی تھے۔ یارقند میں بلتی اور کشمیری بھی بستے تھے۔

رابرٹ شا رقم طراز ہے: ''اللہ اکبر کے نعرے کو ترکستان میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہر مجلس میں بازو لہرا کر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔'' مصنف نے خاص موقعوں پر اس کی نقل کی۔

چین سے خونریز بغاوت کے بعد جب یعقوب بیگ برسر اقتدار آیا تو انگریزوں نے ۱۸۷۲ء میں سر ڈوگلس فورستھ کی قیادت میں کاشغر مشن بھیجا۔ اس کے ایک سال بعد ۱۸۷۳ء میں دوبارہ سر ڈوگلس فورستھ کی قیادت میں ایک بڑا اسفارتی مشن یعقوب بیگ کے دربار بھیجا جو اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ اس بڑے مشن کی روانگی کے لئے مہاراجہ نے ۱۶۲۱ گھوڑے اور یاک، ۶۷۶۴ قلی وغیرہ کا انتظام کیا۔ جن میں ۱۳۳۶ پالکی بردار تھے۔

ایک طرف مہاراجہ نے بڑے انتظامات کئے جس کا لداخ کی معیشت پر چار سال بُرا اثر پڑا۔ دوسری طرف لداخ کے وزیر سید علی اکبر کو مشن کے کام میں رخنہ اور رکاوٹ ڈالنے کے لئے زبانی ہدایت دی۔ بعد میں رسد کی فراہمی میں کوتاہی برتنے پر فورستھ کی شکایت پر مہاراجہ نے سید علی اکبر سمیت کئی افسروں کو اپنے عہدوں سے برخاست کیا۔

مشن بڑا متاثر کن تھا۔ دسمبر ۱۸۷۳ء کاشغر پہنچا۔ ڈوگلس فورستھ نے یعقوب بیگ سے ممبروں کا تعارف کیا۔ ان میں سرجن میجر ایچ۔ ڈبلیو۔ بیلو، Ethnographist (ماہر علم الانسان) کپتان Biddulph، ماہر موجودات ڈاکٹر سٹولزیکا، ماہر ارضیات لیفٹیننٹ کرنسل ٹی۔ ای۔ گورڈن، وائیسرائے کا اے۔ ڈی۔ سی کپتان ٹروٹر اور کپتان چپ مین شامل تھے۔ فورستھ نے ملکہ وکٹوریہ کا خط یعقوب بیگ کو پیش کیا اور یعقوب بیگ نے عزت افزائی کے لئے شکریہ ادا کیا۔ وفد کے سو ہندوستانیوں نے تحفے تحائف پیش کئے۔ ان میں سلائی مشین، سٹیم انجن کے نمونے، میجک لنٹرین کے سلائیڈ، پروجیکٹر، میوزیکل بکسیز اور Talegrams کا چھوٹا سا Outfit شامل تھے۔

ڈاکٹر سٹولزیکا واپسی پر راستے میں دیپسانگ کے مقام پر ۱۸۷۴ء میں بلندی کی بیماری سے فوت ہوا۔ لیہہ میں ان کا مقبرہ ہے جس پر سنگی مخروطی مینار بنا ہوا ہے اور ان کی زندگی کے احوال دئے گئے ہیں۔

اس سے ایک سال پہلے ۱۸۷۲ء میں یعقوب بیگ کا سفیر حاجی تورا سرینگر آیا تھا اور یعقوب بیگ کی طرف سے مہاراجہ کو تحفے پیش کئے۔ انگریز سرکار نے مہاراجہ کو ہدایت

دی کہ سفیر کو کشمیر میں جاگیر عطا کرے۔ مہاراجہ کو متنبہ کیا کہ وہ Leap forward پالیسی کو ترک کرے اور ایک ریاست کے حکمران کا وطیرہ اختیار کرے۔ انگریزوں کو خدشہ تھا کہ مہاراجہ اپنی حدود سے تجاوز کر رہا ہے اور بیرون ملک سے سفارتی تعلقات قائم کر رہا ہے۔

فورستھ مشن اور یعقوب بیگ کے مابین ۲ فروری ۱۸۷۴ء کو ایک عہد نامہ ہوا، جس کی رُو سے انگریزی مصنوعات کی وسط ایشیا بر آمدات پر رعایت دی گئی اور ترکستان نے انگریز نمائندے کو اپنے دربار میں رہنے اور کاشغر میں جائداد منقولہ اور غیر منقولہ خریدنے کی اجازت دی۔

اسی سال ایک انگریز سیاح لمبرٹ کاوے نے اپنی کتاب A Trip to Kashmir and Ladakh(1877) میں لکھا ہے: ''جب ہم لیہہ لوٹے تو سنٹرل ایشین ٹریڈنگ کمپنی کے آدمی مسٹر رسل کی قیادت میں اپنا تجارتی مال ترکستان لے جانے کے لئے لیہہ آئے تھے۔ لیہہ کے تاجران مسٹر رسل کو مرچنٹ کنگ (ملک التجار) کہتے تھے۔ دوسرے روز رابرٹ شا کاشغر سے اپنا نیا عہدہ سنبھالنے کے لئے لیہہ پہنچا۔ ان کا گرم جوشانہ استقبال کیا گیا۔ لیہہ قلعہ سے توپوں کی سلامی دی گئی۔ لاموں نے موسیقی کے آلات بجا کر لیہہ بازار میں ان کا استقبال کیا۔

انگریز ایک دفعہ پھر چین کی طرف مائل ہوا اور روس کی توسیعی پالیسی کے پیش نظر سرحدی مسئلے پر کسی سمجھوتہ پر پہنچنے کی کوشش کی۔ ایک مسئلہ اکسائی چین کا تھا جس پر آج چین قابض ہے۔ برٹش انڈیا نے پہلی دفعہ چین سے ۱۸۹۶ء میں کاشغر میں اکسائی چین پر براہ راست بات چیت کی جسے ایس۔ پی۔ ورما کے مطابق انگریز حکومت نے ۱۸/مارچ ۱۸۹۹ء میں قبول کیا اور چین سے مطالبہ کیا کہ کنجوڈ (ہنزہ) کی ریاست اور تاغ دمبش اور ضلع وسلکم کے زیادہ علاقوں سے دستبردار ہو جائے۔ [1] یہ پیشکش میکارٹنی۔ میکڈونلڈ کے نام سے موسوم

---

[1] Struggle for the Himalayas- A study in Sino-Indian Relation- By: S.P.Verma

ہے لیکن چین نے اس پیشکش کا جواب نہیں دیا۔

برطانوی ہند ہنزہ کے بارے میں دلچسپی لے رہا تھا اور اسے برصغیر ہند کا علاقہ قرار دے رہا تھا جبکہ چین کا دعویٰ تھا کہ چینی حکمران چائین لنگ (۱۷۶۰ء) کے عہدِ حکومت کے ۲۵ ویں سال ہنزا چین کا باج گزار تھا۔

ہنزا پر چین کی فوج کشی کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے تاہم ہنزا نے ''تاغ ڈومشی پامیر کے کرغیز خانہ بدوشوں کو شکست دی اور اس پر اپنا قبضہ جمایا۔

فوج کے خفیہ ادارہ کے ڈائریکٹر نے ۱۸ر جولائی ۱۸۹۸ء کو امور خارجہ کے دفتر کو لکھا: ''اس سے پہلے کہ کاشغر کے صوبہ کو روس ہڑپ کرے، ہمیں ایک ایسی سرحد حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جو روس کو حتی الامکان ہم سے دور رکھے۔ وہ اس وقت چترال کے شمال میں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جب سرحدی حد بندی کا دن آئے تو ہم روس کو تغ ڈومبش اور قراقرم کے پاس پائیں جو ہمارے لئے بے چینی کا باعث ہوگا۔''

اس کے دو روز بعد وائسرائے نے یہ ہدایت دی۔ ''ہم چین کے ساتھ افغانستان، ہنزہ اور کشمیر کی سرحدیں طے کرنا قرین مصلحت سمجھتے ہیں۔ ہم تغ دومبش اور رسکم پر ہنزہ کا حق جتا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہمیں تیار رہنا چاہئے کہ ہنزہ پر اپنی عمل داری کے دعویٰ کو اگر چین واپس لے تو اس کے عوض تغ دومبش اور اسکم کے اپنے دعوے کو خیر باد کہہ سکتے ہیں۔ ہنزہ اور نگر پر اپنے سیاسی دعوے سے ہم دستبردار نہیں ہو سکتے۔''

برطانوی ہند کے وائیسرائے پلے یکے بعد دیگرے چین کو خبردار کرتے ہیں کہ روس کی پیش قدمی جاری رہے گی اور چین کو اس خطرے سے آگاہ ہونا چاہئے۔

اُدھر ہنزہ، نگر اور قبائیلی سردار ڈوگرہ عمل داری کے خلاف تھے۔ ۱۸۸۸ء میں انہوں نے غیر ملکی فوجیوں کو نکال باہر کرنے کے لئے حملے کئے اور بڑی تعداد میں فوجی پکڑے جنہیں پامیر کے کرغیزوں کو فروخت کیا گیا۔ ۱۸۹۲ء میں میکارٹنی نے یارقند سے یہ رپورٹ دی کہ ترکستان کے مختلف علاقوں میں مہاراجہ کے لگ بھگ پانچ ہزار فوجی بطور غلام

فروخت ہورہے ہیں۔

انگریزوں نے قبائیلی سرداروں کا وظیفہ مقرر کیا تھا تا کہ وہ بغاوت نہ کریں۔اس کے بعد ہنزہ اور نگر انگریزوں کے زیر اثر آئے تھے۔

محکمہ سراغرسانی کے ڈائریکٹر سر جان ارداغ (Sir John Ardagh) نے ایک ایسی سرحد کے تعین کی تجویز کی جو ہندوستان کے مفاد میں ہو۔اس کا اطلاق کیون لین دریائے یارقند اور جنوب کی طرف کا علاقہ تھا۔ ینگ ہاسبنڈ نے بھی یہی تجویز رکھی تھی لیکن وائسرائے لاڈ ایلگن کو یہ تجویز قبول نہیں تھی کیونکہ تجویز کردہ زیر قبضہ علاقے سے حملے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔خطرہ روس سے تھا۔اسی سال اکتوبر میں حکومت ہند نے اپنا الگ منصوبہ بنایا اور ۱۴ مارچ ۱۸۹۹ء کو سر کلاڈ میکڈونلڈ نے اسے چین کی حکومت کو پیش کیا۔اس کی رو سے ضلع رسکم اور تاغدومبش کا زیادہ حصہ چین کو دیا تھا اور ہنزہ سے دست بردار ہونے کی درخواست کی تھی۔گونڈ کرنا رائن راؤ نے اس کے لئے ایلگن انتظامیہ کی نکتہ چینی کی ہے۔ہنزہ کے میر سمیت کشمیر کے ریڈیڈنٹ سر۔اے۔تالبوٹ اور گلگت کے پالیٹیکل ایجنٹ کپتان میکموہن نے بھی اس پیشکش پر سخت نکتہ چینی کی۔

برطانوی ہند حکومت نے جہاں تغ دومبش اور رسکم کی علیحدگی اور ہنزہ کو برصغیر کے ایک ناقابلِ تقسیم علاقے سے مشروط بنادیا تھا۔وہاں جنرل سٹاف نے لندن لکھا کہ اگر روس نے مشرقی ترکستان پر قبضہ کیا تو ہندروس پر زور دے گا کہ تغ دومبش، رسکم، شہیدولہ اور اکسائی چین ہند کے علاقے قرار دئے جائیں۔

اسی طرح کاشغر میں برطانوی ہند کے تجارتی نمائندے میکارٹنی نے یہ تجویز رکھی کہ اگر چین تغ دومبش کو اپنے کنٹرول میں نہ رکھ سکے تو وہ اسے دستبردار ہو جائے اور تغ دومبش پر کشمیر اپنے حق کا دعویٰ کرے۔

تاہم اکسائی چین گریٹ گیم کے ہنگاموں سے غائب نہیں تھا۔اس دور کے متعدد محققوں نے اکسائی چین کا ذکر کیا ہے۔اکسائی چین ترکی لفظ ہے۔اس کا مطلب

''پتھروں کاریگستان'' ہے۔

سی سٹریچی غالباً پہلا یورپی تھا، جس نے ۱۸۴۷ء میں اکسائی چین دیکھا۔ اکسائی چین پہنچنے والے اوّلین یورپی ایک اطالوی Raero du Cortenze اور ایک جرمن مہم جو محقق شلیے گین وائٹ تھے۔ اولالذکر لداخ میں ۱۸۵۳ء اور ۱۸۷۵ء کے درمیان رہا۔ شلیے گین وائٹ ۱۸۵۷ء میں اکسائی چین سے کاشغر گیا۔ لداخ کے ایک ناظم اعلیٰ جانسن نے ۱۸۶۵ء میں یہاں سے ختن سفر کیا۔ ۱۸۶۸ء میں ہیورڈ، رابرٹ شا اور کیلے نے الگ الگ کسائی چین کا وسیع علاقہ عبور کیا۔ ۱۸۶۹ء میں لداخ کے ایک اور انگریز ناظم اعلیٰ فریڈرک ڈریو نے اکسائی چین کو دیکھا۔ ۱۸۷۲ء اور ۱۸۷۳ء میں یہیں سے فورستھ مشن مشرقی ترکستان روانہ ہوئے۔

فریڈرک ڈریو لکھتا ہے: ''اکسائی چین میں شاذ و نادر ہی کسی قسم کا سبزہ ہے۔ چراگاہیں اس سے بھی کم ہیں۔ حتیٰ کہ جنگلی جانوروں سے بہت کم آمنا سامنا ہوتا ہے۔''

Dorothy Woodman نے لکھا ہے: ''اس علاقے کو سوڈا Plain (میدان) کہا جاتا تھا۔ یہاں لداخ کو نمک جاتا تھا۔ بکریوں، بھیڑوں اور یاک کے لئے کچھ چراگاہیں تھیں۔''

بقول ڈوروتھی ووڈ مین تب اکسائی چین تجارتی اور فوجی حکمت عملی کے نقط نظر سے اہم سمجھا نہیں جاتا تھا۔[1]

چین کے لئے اکسائی چین غیر معمولی اہم ہے۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق ساتویں آٹھویں صدی سے اس کے راستے تبت آمد ورفت تھی۔ ۱۷۱۷ء میں منگول حملہ آور یہاں سے تبت کے ایک تجارتی مرکز رودوق پہنچے اور لہاسہ روانہ ہوئے۔ شین جیانگ تبت شاہراہ یہی سے گزرتی ہے۔ یہ سڑک چین کے ایک مقام یچینگ سے شروع ہوتی ہے اور پہلے گرتوق میں ملتی ہے۔ یچینگ سے نیپال کی سرحد کے راستے سے تبت بہت دور پڑتا ہے۔

[1] Himalayan Fronters-Dortothy Woodman-1969

ہیورڈ جانسن اور رابرٹ شا نے انیسویں صدی میں اس ضمن میں اکسائی چین کی افادیت کا ذکر کیا ہے۔ ہیورڈ لکھتا ہے:

''مشرقی ترکستان کے پہاڑوں سے ہندوستان آنے والی راستہ کی تلاش میں کوشاں کسی بھی فوج کو نشیبی ہمالیہ کی گھاٹیوں تک پہنچنے سے پہلے کوئی بڑی رکاوٹ نہیں ہے۔''

جانسن نے اس کی تصدیق کی ہے کہ اسی راستے سے رودوق سے ختن اور یارقند تک گاڑیاں جاسکتی ہیں۔ شا نے بھی لگ بھگ ایسے ہی خیال کا اظہار کیا ہے۔

دوڈ مین رقم طراز ہے: ''انیسویں صدی میں انگریز محققوں نے اکسائی چین سے سنٹرل ایشیا تک رسائی کے لئے جس راستے کا تذکرہ کیا ہے۔ بیسویں صدی میں چین نے گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے سڑک تعمیر کر کے اسے عملی جامہ پہنایا۔''

انیسویں صدی میں اکسائی چین کے بارے میں متضاد اور مفروضے بیانات دئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں چین اور ہندوستان دونوں متذبذب confused نظر آتے ہیں۔ فورستھ مشن ۱۸۷۳ء کی رپورٹ کے مطابق ۱۸۷۰ کی دہائی کے دوران علاقے کے بارے میں جغرافیہ دانوں میں بڑا اختلاف پایا جاتا تھا۔

السٹر لمب کا خیال ہے کہ اکسائی چین No Man Land کی طرح تھا۔ اس کی ملکیت کے بارے میں قطعی علم نہیں ہے۔ فورستھ مشن ۱۸۷۳ء کے ایک ممبر ڈاکٹر ہنڈرسن نے اکسائی چین کو نومینز لینڈ بتایا ہے۔

کیتھ جانسن کے '۱۸۹۰ء کا اٹلس' کے ایک نقشہ میں اکسائی چین کو کشمیر کا علاقہ دکھایا گیا ہے۔ کاشغر میں تعینات برٹش انڈین کونسل کے نمائندے جارج میکارٹنی نے کہا ہے کہ اکسائی چین کا کچھ حصہ چین اور کچھ کشمیر میں ہے۔ فوجی خفیہ محکمہ کے ڈائریکٹر سر جان ارداغ Sir John Ardagh میکارٹنی سے متفق نہیں تھا کہ چین ہندوستان کا حلیف ہے۔ وہ اکسائی چین کو ہندوستان کا علاقہ سمجھتا تھا۔ ڈوروتھی ووڈمین کے مطابق ۱۸۹۳ء میں چین کے ایک سینئر اہلکار ہانگ ٹا۔ لین نے اکسائی چین اور الینگوی تھنگ کو کشمیر کی

قلمرو میں دکھا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں کاشغر کے ٹاؤ تائی (Tao Tai) نے اسے تبت میں دکھایا۔ ۱۸۹۹ء میں میکڈونلڈ کے پیش کردہ نقشے میں تقریباً سارا اکسائی چین، چین کا علاقہ قرار دیا تھا۔ البتہ شین جیانگ تبت سڑک کا علاقہ ہندوستان کی حدود میں دکھایا تھا۔ راؤ کے مطابق یہ دراصل وزارت خارجہ کے سکریٹری سر ڈبلیو کننگھم کا منصوبہ تھا جس کو اس کے جانشینوں نے ہدفِ تنقید بنایا۔

۱۹۱۸ء میں چین نے دعویٰ کیا کہ چینی فوج کے ایک نقشے کے مطابق سارا اکسائی چین، چین کا ہے۔ ہندوستان نے اس دستاویز پر شک کا اظہار کیا۔

جیوفری ہڈسن Geoffrey Hudson نے اسے چینی فوجی حلقے کا aspiration چاہ قرار دیا ہے تاہم چین کا رویہ اُن دنوں آج کی طرح جارحانہ نہیں تھا۔ دعویٰ بیان تک محدود تھا۔

۱۹۲۷ء میں ایک جرمن ماہرِ ارضیات ڈاکٹر ایمیل ٹرینکلر Emil Trinkler اکسائی چین پہنچا۔ اس نے اسے تبت کے انتہائی مغربی سطح مرتفع Platean بتایا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتا ہے۔ جغرافیائی طور لینگوی تھنگ اور اکسائی چین تبت میں ہیں۔ تاہم سیاسی طور یہ لداخ میں واقع ہیں۔

۱۸۸۸ء میں برطانوی ہند حکومت نے Ney Elias کو روس کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے مشرقی ترکستان اور بدخشاں بھیجا۔ Ney نے اپنی رپورٹ میں چین کا روس کے تئیں اس کی نرم پالیسی کو دیکھ کر Impractacle Nation بے عمل قوم قرار دیا ہے۔ اور اپنی تجویز پیش کی۔

وائسرائے لارڈ لانس ڈاؤن (Lansdowne) نے الیاس کے اس نظریہ سے اتفاق کیا اور کہا: ''میرے علم میں قراقرم اور کیون لین سلسلہ ہائے کوہ کا درمیانی علاقہ کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ نہایت ہی دشوار گذار ہے اور روس اس پر قبضہ جمانے کے لئے مشتاق نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اگر چین چاہتا ہے اُسے اس علاقے کو اپنی تحویل میں لینے

کے لئے حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ ہماری اور چین کی سرحد پر نومینز لینڈ سے یہ بہتر رہے گا۔اس سے روس کی پیش قدمی روکی جاسکتی ہے۔"

وائسرائے نے کپتان ینگ ہاسبنڈ کو ۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۰ء میں مذکورہ پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کاشغر اور یارقند بھیجا۔ ۵ ستمبر ۱۸۹۰ء کو ینگ ہاسبنڈ یارقند میں چینی آمبان (افسر اعلیٰ) سے ملا اور برطانوی حکومت کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ چین کو شہیدولہ سے قراقرم تک کا علاقہ اپنے تسلط میں لینے کے لئے ترغیب دی اور یہ دلیل دی کیونکہ چین لیہہ یارقند تجارتی راستے کی حفاظت کرتا ہے اس لئے وہ اس علاقے پر اپنی سرداری قبول کرے۔ چین نے اس معاملے میں دلچسپی دکھائی۔ قراقرم پر ایک ستون نصب کرنے کے علاوہ ہنزہ کو چین کا باج گذار ہونے کے دعویٰ کا اعادہ کیا۔ ینگ ہاسبنڈ نے آمبان کو کشمیر کا نقشہ دکھایا اور کہا کہ وائسرائے کشمیر اور یارقند کے سرحدی مسئلے کو حل کرنے کے لئے چین سے مفاہمت چاہتا ہے۔ چین نے قراقرم درہ پر ایک بڑا بورڈ آویزان کیا تھا جس پر موٹے حروف میں لکھا تھا: "یہ بورڈ چین کے شہنشاہ کی قلمرو میں ہے۔" اس کا ایک ستون درے کی چوٹی پر لداخ کی سمت ۵۰ فٹ نشیب میں تھا۔ لداخ کے وزیر نے جموں و کشمیر کونسل کو اس سے آگاہ کیا اور چینی آمبان کے خلاف شکایت کی جس نے یہ بورڈ لگوایا تھا۔ خارجہ امور کے شعبہ نے بھی اس ضمن میں تشویش کا اظہار کیا۔ قراقرم بھی ترکی لفظ ہے۔ اس کا مطلب سیاہ کنکر ہے۔ بقولِ ینگ ہاسبنڈ قراقرم کی خصوصیت کے پیش نظر یہ بالکل موزون نام ہے۔

لیکن چین روس کے علاوہ برطانوی ہندسرکار سے بھی بدظن تھا اور اس کی سرگرمیوں کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ برطانیہ ہند حکومت چاہتی تھی کہ چین اور افغانستان میں سمجھوتہ ہو اور اپنی سرحدوں کی حد بندی کریں۔............ چین اور افغانستان ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اسی طرح روس کو انگریزوں پر شبہ تھا کہ وہ شمال کی طرف سے پیش قدمی کرے گا اور انگریزوں کو خدشہ تھا کہ روس جنوب کی طرف سے بڑھے گا۔

خفیہ ادارہ کے ڈائریکٹر میجر جنرل سرجان ارداغ نے ایک خفیہ رپورٹ میں چین

کی کمزوری پر مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے یوں تبصرہ کیا ہے:

"حالیہ چین۔جاپان جنگ میں چین کی شکست فاش اس کی طاقت پر ممکنہ حلیف کی حیثیت سے بھروسہ کرنا عبث لگتا ہے۔ (۱۸۹۵ء میں چین، جاپان سے ہارا تھا) اور یہ یقین کرنے میں حق بجانب ہے کہ روس اور ہندوستان کی جنوبی سرحد کے درمیان چین ایک بغیر ریاست کے طور بھی بے کار رہے گا۔ رپورٹ میں چترال کے شمال اور ہنزہ اور لداخ کی قدرتی سرحدوں کو برصغیر ہند کی قابل قبول دفاعی سرحدیں بتائی ہیں۔

کئی ماہرین جے ایلگن، جی۔این۔وائٹ، جے۔ویسٹ لینڈ، کولین وغیرہ نے چین سے متعلق میجر جرنیل ارداغ کی رپورٹ سے اتفاق نہیں کیا ہے اور سکریٹری آف سٹیٹ لارڈ جارج ایف ہملٹن کو لکھا ہے کہ وہ ارداغ کی رپورٹ کے کئی نکات سے متفق نہیں ہیں۔ چینیوں نے کئی مرتبہ بھارتی سرحد کی جانب اپنی علاقائی حدود کو موثر طور جتانے میں اپنا عزم دکھایا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کئی مثالیں دی ہیں۔

روس کی توسیع پسند پالیسی کے پیش نظر برطانوی ہند نے اٹھارہویں صدی کے اختتام پر برصغیر ہند کے گرد بفر Buffer ریاستیں قائم کیں۔ ان میں برما، بھوٹان، سکم، نیپال، تبت اور افغانستان شامل تھے۔ روس تبت میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کے لئے کوشاں تھا۔ تبت کی سرحد مذکورہ کئی ملکوں سے ملتی ہے۔ انگریزوں کو خوف تھا کہ روس ہندوستان میں داخل ہونے کے لئے تبت کو گزرگاہ Gate Way کے طور استعمال کرے گا۔

John Mac Gregor اپنی کتاب Tibet- A Chronicle and Exploitation میں رقم طراز ہے:

"روس کی نظر تبت کے سونے پر تھی۔ روسی حکومت نے تبت کی سرکار کو لکھا کہ وہ اکیلا ہی انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے تبت کو بچا سکتا ہے۔"

روس کے مہم جو جاسوس نکولس میکھائل لووِیچ پرجاولسکی (Nicholas Makhail Lovich Prajaivalski) ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان چار مرتبہ

وسط ایشیا اور تبت کی مہمات پر آیا۔ اس نے لہاسہ پہنچنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ وہ لوپ نور اور کیون لین بھی پہنچا۔

گراہم سینڈ برگ [1] نے لکھا ہے نکولس میکھائل نے روسی حکومت کی امداد سے چار مرتبہ لہاسہ پہنچنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ لہاسہ میں یہ افواہ گرم تھی کہ روسی دلائی لاما کو اغوا کرنے اور تبتیوں کے مذہبی عقیدے کو ختم کرنے آرہے ہیں۔ ۱۸۸۸ء میں نکولس میکھائل ۴۹ سال کی عمر میں ٹائفس سے مر گیا۔

تبتی حکومت نے ایک مرحلے پر غیر ملکیوں کے تبت میں داخلہ پر پابندی لگائی۔ دلائی لاما نے چین کے شہنشاہ کو اس ضمن میں دو وجوہات دی ہیں۔ اوّل جب سے سفید فام مشنریاں اور دوسرے تبّت آئی، عورت ذات اپنے شوہروں سے بے وفا ہوگئی ہے اور لوگ اپنے دیرینہ عقیدے کی پاسداری سے ڈگمگاتے ہیں۔ دویم غیر ملکی سیاح بندوق لے کر آتے ہیں اور ان کا گمپوں کے سامنے جانوروں اور پرندوں کو مارنا تبتیوں کو ناگوار ہے۔

نین سنگھ ۱۸۶۵ء میں لہہ ہچق مشن کے ساتھ تبّت پہنچتا ہے اور مشن کے اراکین کے ہمراہ دلائی لاما سے ملتا ہے اور خادقس (ریشمی رومال) پیش کرتا ہے۔ ۱۳ سالہ دلائی لاما نے اس کو ذیل کے تین سوالات پوچھے۔

۱۔ کیا آپ کا بادشاہ ٹھیک ہے؟

۲۔ کیا آپ کا ملک ترقی کر رہا ہے یا خوشحالی کی راہ پر ہے؟

۳۔ کیا آپ کی صحت اچھی ہے؟

اِس سے پہلے اسکو یہی سوالات پنچھن رینگبو چھے نے بھی پوچھے۔

لداخ کے ایک برٹش جوئنٹ کمشنر اے۔ ایل۔ کینیون A.L.Kennion نے لکھا ہے: "تبتی غیر ملکیوں کو اپنے علاقے میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ ان کے روکنے کا

[1] The Exploration of Tibet- Its History and Particulars, 1904- Graham Sandberg

طریق کار دلچسپ اور معقول ہے۔ سرحد پر رہنے والے تبتی پہلے اجنبی مسافر کو واپس جانے کے لئے ترغیب دیتے ہیں۔ اس پر دھیان نہ دے تو دھمکیاں دیتے ہیں۔ اگر دھمکیاں کارگر نہ ہوں تو ڈنڈوں سے مارتے ہیں اور پکڑ کر سرحد کے پار دھکیل دیتے ہیں۔ اگر اجنبی بندوق سے اپنی مدافعت کرے اور کوئی تبتی ہلاک ہو جائے تو انہیں (تبتیوں) کو بھی بندوق استعمال کرنے کی اجازت ہے۔"

متعدد یورپیوں نے لہاسہ پہنچنے کی کوشش کی لیکن میری دانست میں سوائے دو کامیاب نہیں ہوئے۔ ان میں ایک فرانسیسی عورت الیکزنڈر ڈیوڈ نیل تھی۔ وہ ایک یاتری بنکر لہاسہ پہنچی۔ اس نے اپنے چہرے اور بالوں کو سیاہ کیا تھا اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے تھے۔ وہ تبتی زبان جانتی تھی۔ نیل اپنے روئداد یوں بتاتی ہے۔ "پوتالا کا درشن کر کے جب میں نیچے اتر رہی تھی تو مجھے دیکھ کر ایک آدمی نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا، "تمہارے خیال میں یہ کہاں سے آئی ہے؟ اس آدمی نے خود اس کا جواب دیا۔ 'یہ ایک لداخی ہونی چاہیے۔' دوسری مرتبہ جب میں چوکھنگ دیکھ رہی تھی۔ تب بھی مجھے لداخی سمجھا گیا۔ کسی نے پیچھے سے کہا۔ 'اس عورت کو پوتر پانی دو۔ بچاری دور لداخ سے آئی ہے۔ اس کی گہری عقیدت کو دیکھو۔' میں نے اپنے گرد مسکراتے چہرے دیکھے۔ ایک آدمی میرا بازو پکڑ کر لے گیا اور ہیرے جڑے ایک برتن سے پوتر پانی پلایا۔"

دوسرا یورپی رابرٹ برائٹ تھا۔ اس نے بھی اپنا بھیس پوری طرح بدل دیا تھا اور تبتی لگتا تھا۔ وہ لہاسہ میں ایک مکان میں مقیم تھا۔ ایک دن اس کی قومیت پر شک ہوا اور اس کو ایک غیر ملکی گردانا گیا۔ غیض وغضب سے بھری ہوئی ایک بھیڑ نے اس کے مکان کا گھیراؤ کیا اور پتھراؤ کیا۔ وہ بڑا چالاک اور ذہین تھا۔ مکان کے عقبی دروازے سے باہر نکلا اور بھیڑ میں شامل ہو کر ایک چھوٹا پتھر مکان کی طرف پھینکا۔

تبتی حکومت پہلے یورپیوں اور دوسرے سفید فام لوگوں کو تبت آنے کی اجازت دیتی تھی۔ ۱۷۷۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگو نے جارج بوگلے کو

سیاسی اور تجارتی مشن پر تبت بھیجا۔ ۱۷۸۳ء میں سموئل ٹرز اور ۱۸۱۱ء میں تھامس مانینگ سیاسی مشن پر تبت روانہ ہوئے۔

۱۸۹۹ء میں لارڈ کرزن وائسرائے بنا۔ ۱۹۰۱ء میں کرزن نے لکھا کہ ایشیا پر غلبہ حاصل کرنا روس کی بڑی امنگ ہے۔ تبت میں اپنی مداخلت کو وہ برصغیر کو روس کے حملے سے محفوظ رکھنے سے تعبیر کرتا تھا۔ وہ تبت کو افغانستان کی طرح بفر سٹیٹ بنانا ضروری سمجھتا تھا اور روس کو معقول دوری پر رکھنا چاہتا تھا۔ اگر چین اس سلسلے میں قدم نہ لے تو وہ دلائی لاما سے براہ راست بات چیت کرنے کا خواہش مند تھا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ یہ ناممکن ہے۔" کرزن نے لکھا۔ وہ دلائی لاما کو خط پہنچانے کے لئے ایک موزوں آدمی چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں حکومت برما کے ایک مشیر کو جو نسلی طور آدھا چینی تھا، بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا لیکن اس کو جسمانی طور موٹا پایا جس کی وجہ سے وہ تبت کے مشکل سفر کو برداشت نہیں کر پائے گا۔ اس لئے اس کو نہیں لیا۔ دوسرا امیدوار لداخی سکالر منشی چھرنگ سپلیگس تھا۔ اس نے لوکچق کی قیادت کی تھی لیکن وہ بلانوش تھا۔ اس بنا پر وہ اس کام کے لئے موزون نہیں سمجھا گیا۔ آخر کار لیہہ کا برٹش جوئنٹ کمشنر آر۔ ایل۔ کیعیون نامزد ہوا اور انہیں مغربی تبت کے گرمائی صدر مقام گرتوق بھیجنے کا فیصلہ ہوا، جہاں سے وہ لہاسہ کی حکومت سے رابطہ قائم کرے گا لیکن تبتیوں نے اس کو گرتوق پہنچے سے پہلے روکا۔ افسر اعلیٰ گرپون نے بذات خود خط لہاسہ بھیجنے کا وعدہ کیا لیکن چند ماہ بعد یہ خط کیعیون کو واپس آیا۔ لکھا تھا کہ لہاسہ نے خط نہیں لیا۔ ایک ماہ بعد گرپون نے اپنی بات بدل دی اور لکھا کہ اس نے خط لہاسہ نہیں بھیجا۔ لیکن مہریں توڑی تھیں۔ کیعیون کا یہ پختہ خیال تھا کہ لہاسہ کے سرکاری افسروں نے کرزن کے پیغام کو پڑھا ہے لیکن کرزن کو یقین نہیں آیا اور ایک قاصد کی تلاش کی۔ آخر کار بھوٹان کے وزیر قاضی اُرگیان کو خط حوالہ کیا۔ لیکن اب کے یہ کھولے بغیر واپس آیا۔ ۱۹۰۱ء میں جب قاضی کلکتہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ دلائی لاما نے خط نہیں لیا اور اس کا یہ جواز دیا کہ انگریز جیسے غیر ملکیوں سے پیغامات قبول کرنا روایتی طور اس کے لئے ممنوع ہے۔ دلائی لاما بولے۔ وہ خط نہیں لے سکتا

ہے اور نہ امبان کے مشورے کے بغیر خط لکھ سکتا ہے۔ چین کے ساتھ یہی معاہدہ ہوا ہے۔ اس لئے ان کو افسوس ہے کہ وہ خط نہیں لیں گے اور نہ وائسرائے کو لکھیں گے۔

کرزن کو اب بھی شک تھا۔ غصہ بھی آیا اور بولا اگر دلائی لامانے اپنا خط نہیں بدلا برطانیہ ایسے اقدام لینے کا حق رکھتا ہے جو اس کے لئے ضروری ہوں۔''

پھر تبت روس کے نزدیک گیا۔ تبت پر حملے کی صورت میں روس سے مدد کی گارنٹی مانگی۔ ۱۹۰۰ء میں تبتی سفارتکار دورجیو، روس روانہ ہوا۔ دورجیو کے دوسرے مشن پر کرزن برافروختہ ہوا اور اس کے بارے میں سراغ لگایا۔ دوسری کتاب میں دورجیو کا نام دورج اوف دیا ہے۔ اوف روسیوں کا اضافی نام لگتا ہے۔ وہ پیدائش طور بریات منگول تھا۔ اس لحاظ سے وہ روسی شہری تھا۔

ایک جرمن ماہر مستشرقیات ولیم Filchner کی کتاب Storm over Asia-Experience of secret Diplomatic Agents سے ہلچل سی مچی۔ اس نے انہیں تعلقات کے بارے میں لکھا تھا۔ ایک جاپانی بودھ Ekai Kawajuchi کی کتاب Three years in Tibet سے مزید انکشافات ہوئے۔

کرزن کو پورا شک تھا کہ روس اور چین میں اندرونی طور ایک معاہدہ ہوا ہے۔ کرزن اب دباؤ کی راہ اختیار کرنا چاہتا تھا۔ لندن میں انڈیا آفس نے کرزن کو دباؤ کے بجائے متبادل راستہ اختیار کرنے کے لئے زور دیا لیکن کرزن پر اثر نہیں ہوا۔ لارڈ کرزن نے ۷ مئی ۱۹۰۳ء کو لہاسہ کے امبان کو تاکیدی خط لکھا کہ سرحد اور تجارتی امور اور دوسرے معاملات پر سمجھوتہ کرنے کے لئے گونپہ جونگ ملے۔ لیکن کام نہیں بنا۔ آخرکار وائیسرائے نے لہاسہ میں تعینات چین کے ریذیڈنٹ کو خط لکھا جس میں اپنے مصالحاتی مشن زبردستی لہاسہ لینے کی دھمکی دی۔

کرزن کی نظر میں مقصد براری کے لئے ینگ ہاسبنڈ بالکل موزون تھا۔ ینگ ہاسبنڈ کے ساتھ ڈپٹی کمانڈر سکم کا ریذیڈنٹ جان کلاڈ وائٹ John Cloud

White تھا۔ کپتان فریڈرک اوکونور خفیہ محکمہ کا افسر تھا۔ وہ تبتی زبان میں ماہر تھا۔

کرزن نے بہانہ تراشا کہ برطانوی رعایا کے دو آمیوں کو ایذا پہنچا کر ہلاک کیا گیا ہے، سکم کے دو آدمیوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کو پیٹا بھی گیا تھا اور جیل میں رکھا تھا لیکن ہلاک نہیں کیا گیا تھا۔

یکم اکتوبر کو لندن سے یہ پیغام آیا کہ سمجھوتہ نا ممکن ثابت ہوا ہے۔ لندن نہ صرف وادی چوبی کو زیر قبضہ لانے پر غور کرے گا بلکہ گیانگچے پیش قدمی پر سوچے گا۔

۱۹۰۴ء میں کرنل ینگ ہاسبنڈ کی سرکردگی میں فوجی مہم تبت روانہ ہوئی۔ مہم میں ۲۵۰۰ فوجی تھے۔ بعد میں ایک ہزار کا اضافہ کیا گیا۔ کل ۶۰۰۰ قلی تھے۔ جن میں بہت سارے بلتی، لداخی اور گڑھوالی تھے۔ لداخی کارواں لیڈر محمد عیسیٰ بھی تھا۔ وہ وسط ایشیا کی مہم میں ینگ ہاسبنڈ کا کارواں لیڈر رہا تھا۔ تب رسول گلوان سب سے کم عمر قلی کی حیثیت سے کارواں میں شامل ہوا تھا۔ ینگ ہاسبنڈ کو لداخیوں اور بلتیوں سے بڑا لگاؤ تھا۔

انگریز فوج نے پیش قدمی کی اور جھڑپیں ہوئیں۔ ان کی گولہ باری کی شدت بہت تیز تھی۔ انگریزوں کی پیش قدمی پر چین کو بڑی کوفت ہوئی۔ ۱۱/نومبر کو بیجنگ نے احتجاج کیا۔ دلائی لاما چین فرار ہوئے۔ تبتی فوج کو شکست ہوئی۔ روس نے بھی مداخلت نہیں کی۔ ۲/اگست ۱۹۰۴ء کو ینگ ہاسبنڈ کو پوتالا نظر آیا۔ دلائی لاما کے نامزد ریجنٹ ٹری رینگبو چھے نے معاہدہ کیا۔ پوتالا میں اس پر دستخط ہوئے۔ اس کے مطابق انگریزوں کو تجارتی مراعات حاصل ہوئیں۔ گیانگچے، گرتوق اور یالونگ میں تجارتی ایجنسیاں کھولیں۔ برطانوی ہند نے ایک معاہدے کے تحت تبت پر چینی حاکمیتِ اعلیٰ کو تسلیم کیا۔ ینگ ہاسبنڈ کی مہم کے بعد بھوٹان، سکم اور نیپال میں چین سے زیادہ ہندوستان کا اثر و رسوخ بڑھا اور عملداری قائم ہوئی۔

۱۹۱۲ء میں دلائی لاما نے خودمختاری کا اعلان کیا۔ چینی فوج کو نکال دیا۔ ۱۹۱۱ء میں چین میں چینگ کی حکومت ختم ہوئی تھی اور جمہوریت کا اعلان ہوا تھا۔ مشرقی ترکستان میں دنگا

فساد اٹھنے کے بعد ایک اور مرتبہ کاشغر پر روس کے حملے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔ تب میکموہن خارجہ سکریٹری تھا۔ اس نے سرجان ارداغ کی مجوزہ سرحد کو دوبارہ لاگو کرنے کی سفارش کی۔

۱۹۱۳ء میں برطانوی سرکار کی قیادت میں شملہ کانفرنس ہوئی جس میں چینی اور تبتی نمائندوں نے شرکت کی۔ اِس میں سرہنری میکموہن، ارچی بلڈروس اور سرچارلس بیل نے شرکت کی۔

۱۹۲۴ء میں ہند اور تبت کے مابین لداخ کی مشرقی سرحد پر پنگونگ کے مشرقی علاقے میں چند چراگاہوں کی ملکیت کے تنازعے پر بات چیت ہوئی۔ اس سے پہلے فریقین میں لانق لا، سپنگور اور دمجوق کے علاقوں پر کوئی تنازعہ نہیں تھا۔ بات چیت میں مسئلہ حل ہوتا ہوا لگتا ہے۔

تیرھویں دلائی لاما تبت کی آزادی اور خودمختاری کے بڑے داعی تھے۔ وفات سے پہلے انہوں نے یہ لکھا: "جب تک ہم اپنے ملک کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ دلائی لاما اور پنچن لاما، باپ اور بیٹے (جیسے ہیں) دھرم کے محافظ ہیں۔ بصورت دیگران کے عظیم الشان دوبارہ جنم کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا اور کسی نام کے بغیر یہ رہ جائیں گے۔"

۱۹۳۵ء میں برطانوی ہند سرکار نے گلگت کو ۶۵ سال کے لئے پٹے پر حاصل کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کے بٹوارے کے اعلان کے بعد وہ گلگت سے دستبردار ہوا اور اس پر مہاراجہ کی حکومت بحال کی۔ مہاراجہ نے بریگیڈیر گھنسارام کو بطور گورنر گلگت بھیجا۔ کشمیر پر حملے کے بعد گلگت سکاوٹس نے اس کو گرفتار کر کے قید کیا۔ انگریز افسر میجر براؤن گلگت سکاوٹس کا کمانڈر تھا۔ اس نے ۴ نومبر کو گلگت میں پاکستان کا جھنڈا لہرایا۔ نومبر کے تیسرے ہفتے میں پاکستان کا پالیٹیکل ایجنٹ گلگت پہنچا اور اپنا کام سنبھالا۔ بعد میں قیدیوں کے آپسی تبادلے میں گھنسارام کو رہا کیا گیا۔

۱۹۵۶ء میں آزاد ہند سرکار نے سارے معاملات کا از سرِ نو جائزہ لیا اور اکسائی چین پر اپنا دعویٰ جتایا۔ حکومت پاکستان نے سرحدی معاہدے کے تحت شکسگام چین کو حوالہ

کیا۔اس پر میر ہنزہ کی عمل داری تھی۔اس کا تذکرہ قدرے تفصیل سے بعد میں آئے گا۔

۱۹۴۹ء میں چنگ کائی شیک کی چینی قومی حکومت پنچن لاما کو تبت کی حکومت سونپتی ہے اور تبتی حکومت جولائی میں چینی قونصلسٹ مشن کو لہاسہ سے نکالتی ہے۔اس کے تین ماہ بعد ۷/اکتوبر کو کمیونسٹ فوج نے تبت پر دھاوا بولا ہے اور کسی خون خرابے کے بغیر تبت کو اپنے کنٹرول میں لیا جاتا ہے۔

وسط ایشیا سے کاروان ۱۹۵۰ء تک لداخ آتے رہے۔اکتوبر ۱۹۵۱ء میں چینی حکام نے شمالی دروں کو بند کیا جس سے مشرقی ترکستان سے تجارت بند ہوئی۔متعدد ترکی تاجر لیہہ میں پھنس گئے۔قصبے میں ترکی ساخت کی مصنوعات کا کال پڑ گیا۔البتہ لداخ۔تبت کی تجارت ۱۹۵۹ء تک جاری رہی۔چودھویں دلائی لاما کی ہندوستان آمد کے بعد تبت کے ساتھ صدیوں پرانی تجارتی، مذہبی اور ثقافتی تعلقات کو دھکا لگا۔

۱۹۵۰ء میں کاشغر میں بھارتی کونسل اور ارومچی میں امریکی کونسل بند ہوئی اور ان کے عملہ ارکان اپنے وطن لوٹے۔

پی۔این۔کول نے جو ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۱ء کے درمیان لہاسہ میں کونسل جنرل تھا، اپنی کتاب Frontier Callings میں لکھا ہے: ''لہاسہ، شیگاچے اور کئی قصبوں میں کشمیری اور لداخی نسل کے مسلمان آباد تھے۔یہ خاچے کے نام سے جانے جاتے تھے۔ان کی تعداد ایک ہزار سے اوپر تھی۔ان کی اکثریت ہندوستان لوٹنا چاہتی تھی۔لمبی بات چیت اور خط و کتابت کے بعد ان کی اکثریت کو جانے کی اجازت ملی۔چند اپنی مرضی سے رُکے۔کئیوں کو اجازت نہیں دی۔چند قید کئے گئے۔نیز درجنوں لداخی لامے تھے۔چین کے خارجہ بیورو کو تحریری نوٹ اور احتجاج کرنے کے بعد اکثروں کو واپس وطن آنے کی اجازت دی۔ان میں ٹھکسے اور فیانگ گنپوں کے بڑے لاما بھی تھے۔''

تاہم ہمس گنپہ کے بڑے لاما کو شوق ستق سنگ راسپا کو لداخ واپس جانے کی اجازت نہیں ملی۔

وسط ایشیا سے گونا گوں لوگ فرار ہو کر لداخ اور کشمیر آتے تھے جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔ محی الدین فوق نے 'مکمل تاریخ کشمیر' میں لکھا ہے: "۱۶۷۰ء میں عبداللہ خان والئی کاشغر کا بھتیجا ارسلا خان بیٹے کی دست قید سے بھاگ کر کمک ڈھونڈنے کشمیر آیا۔ خود عبداللہ خان کشمیر کے گورنر مبارز خان کے زمانے میں ۱۶۶۸ء میں اپنے بیٹے نوازش خان کی مخالفت سے حکومت چھوڑ کر کشمیر آیا۔ اورنگزیب کی ہدایت پر اس کی خوب خاطر داری کی۔"

ایک روسی پی۔ ایس۔ نازارون لداخ سے ہوتا ہوا کشمیر جاتا ہے۔ اس نے ۱۹۱۸ء میں کمیونسٹوں کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ روس سے جان بچا کر وہ بھاگتا ہے اور کاشغر میں چار سال رہتا ہے۔ جب چین کی حکومت کمیونسٹ سرکار تسلیم کرتی ہے تو کاشغر سے بھاگ جاتا ہے اور ہندوستان میں انگریزوں کی پناہ میں آتا ہے۔ From Kashghar to Kashmir (مطبوعہ ۱۹۳۵ء) اُن کا دلچسپ سفرنامہ ہے۔

۱۹۳۱ء میں لداخ میں بہت سارے تونگن پہنچے تھے۔ تونگن تاتار مسلم اور چینی عورت کی مخلوط نسل کی اولاد ہیں۔ یہ چین کے مغربی علاقوں میں آباد ہیں۔ ان کی زبان چینی ہے۔ تونگن کا لفظی مطلب Military Colonist (فوجی نوآبادیات) دیا گیا ہے۔ لداخ کے برٹش جوئنٹ کمشنر کی ۳۸-۱۹۳۷ء کی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ لیہہ۔ یارقند سڑک عملی طور بند ہے۔ بہت سارے مسلح تونگن اور ترکی، جنہوں نے اُرمچی کے صوبائی حکام کے خلاف ناکام بغاوت کی تھی، لیہہ پہنچے ہیں۔ انہوں نے اپنے ساتھ جو سونا لیا، اس سے تجارت بند ہونے کے نقصان کا کچھ خسارہ پورا ہوا۔

۱۹۴۱ء میں بہت سارے تونگن لداخ فرار ہوئے۔ ایک غیر ملکی John Snelling نے اپنی کتاب The Sacred Mountain (مطبوعہ ۱۹۹۰ء) میں اس کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہے:

"۱۹۴۱ء میں ۳۰۰۰ کرغیز/قزاق خانہ بدوش لوٹ مار کرتے اور تباہیاں پھیلاتے ہوئے مغربی تبت سے گزرے۔ انہوں نے ۱۹۳۸ء

کے آس پاس وسط ایشیا میں اپنے گھر بار اور زمینیں چھوڑ دی تھیں اور اس دورانیہ کے تین سال بعد کیون لین پہاڑوں کو عبور کرنے اور چنگ تھانگ میں داخل ہونے سے پہلے چینی ترکستان اور شنگھائی میں گزارے۔ دریائے برہم پتر پار کر کے انہوں نے نیپال میں زبردستی داخل ہونے کی کوشش کی لیکن سرحدی گورکھا پہرہ داروں نے روک لیا۔ ان سے دستیاب ۵۰۰ بندوقوں اور رائفلوں کی خبر صحیح مان لی جائے تو وہ اچھی طرح مسلح تھے۔ وہ تیرتھ پوری، کھیونگ لینگ اور میسر سے گزر کر مغربی تبت کے گرمائی اور سرمائی صدر مقامات گرتوق اور غار گونسا میں عمارتوں کو مسمار کیا۔ نومبر میں وہ لداخ میں گھس گئے جہاں آخر کار انہیں انگریز اور کشمیری نوجوان نے غیر مسلح کیا۔"

تبت لداخ میں کوئی انگریز فوج نہیں تھا۔ کچھ ڈوگرہ سپاہی تھے۔ میں نے سُنا جب تونگن مغربی تبت سے لداخ کی سرحد میں داخل ہوئے تو سرحدی گاؤں چھوشول میں ان کی ملاقات ایک لداخی حکم الدین سے ہوئی جس نے چند تونگن کو بتایا کہ لداخ میں فوج کا افسر مسلمان ہے۔ ان دنوں میجر عبدالحمید لیہہ میں ڈوگرہ کمپنی کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ پچاس سپاہیوں پر مشتمل یہ کمپنی لیہہ کے زور آور سنگھ قلعہ میں تعینات تھی۔ فوجی افسر کے مسلمان ہونے پر تونگن پناہ گزینوں نے اطمینان کا اظہار کیا اور اپنے ہتھیار ڈال دئے۔

لیہہ سے تونگن سردیوں میں سرینگر روانہ ہوئے۔ کہتے ہیں، بہت سارے تونگن برف وباد میں مر گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے، چند لالچی رہبروں نے ان کو غلط راستہ دکھایا۔ بعد میں ان کو شمال مغربی سرحدی صوبہ میں ضلع ہنزارہ میں بسایا۔

۱۹۵۱ء میں ایک فوجی افسر دلیل خان حاجی کی قیادت میں چند پناہ گزین لداخ آئے۔ دلیل خان چنکا شائیک کی کومنتنگ فوج میں بریگیڈیر تھا۔ لداخ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ کشمیر گئے۔ بعد میں حکومت تائیوان نے ان کی خدمات

حاصل کیں۔

ایک سال پہلے ۱۹۵۰ء میں مشرقی ترکستان سے کئی ہزار ترکی مسلمان بھاگ کر لیہہ پہنچے جہاں فوجی طیاروں میں ان کو سرینگر پہنچایا گیا۔ بعد میں یہ ترکی اور مشرقی وسطیٰ روانہ ہوئے۔

اس سال (۲۰۱۳ء) میں تین ترک مشرقی ترکستان سے فرار ہو کر دولت بیگ اولدی پہنچے۔ایک رپورٹ کے مطابق ان UYGHUR ترکوں کا کہیں بغاوت میں ہاتھ تھا۔

۱۹۵۰۔۱۹۵۱ء میں چینی فوج تین اطراف سے تبت میں داخل ہوئی۔جن میں ایک شین جیانگ، تبت کا قدیم راستہ تھا جو اکسائی چین سے گزرتا ہے۔ چین نے ۱۹۵۴ء۔۵۵ء میں اکسائی چین کا سروے کیا اور مارچ ۱۹۵۶ء اور اکتوبر ۱۹۵۷ء کے درمیان گاڑیوں کی آمدورفت کے لئے شین جیانگ۔تبت سڑک تعمیر کی۔ اس سے قبل ۱۹۵۰ء سے اس راستے کو چین کی حکومت نے نقل و حمل اور آمدورفت کے لئے وسیع پیمانے پر استعمال کیا تھا۔۱۹۵۳ء میں تبت کے تمام قصبوں کا تار لائنوں سے رابطہ قائم کیا۔سڑکیں تعمیر کیں۔۱۹۵۵ء میں ۲۱۶۰ کلومیٹر لمبی سڑکوں پر گاڑیاں چلتی تھیں۔

۱۹۵۷ء کی گرمیوں میں لداخی لیڈر کوشوق بکولا نے شین جیانگ۔تبت کے درمیان بڑے پیمانے پر اس سڑک کو تعمیر کرتے دیکھا تھا۔کوشوق بکولا تبت یاترا پر گئے تھے۔ شین جیانگ (مشرقی ترکستان) چینیوں کا رکھا ہوا نام ہے جس کا مطلب بیرونی سرحدیں ہے۔چین میں مشرقی ترکستان کے لفظ کے استعمال پر سخت پابندی ہے۔

ہندوستان نے اکسائی چین گشتی دستے بھیجے۔انہوں نے رپورٹ دی کہ سڑک ہندوستانی علاقے سے گزرتی ہے۔ چین کے سرحدی محافظوں نے ایک گشتی دستے کے جوانوں کو پکڑا اور دوسرے کو روکا۔چین نے اپنے نقشوں میں اسے چینی علاقہ دکھایا تھا۔

ہند۔چین سرحدی بات چیت کے ہندوستانی وفد کے صلاح کار گوبند کرنرائن راؤ رقم طراز ہے:

"۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۶ء میں چین نے ہندوستان سے کہا کہ وہ اس کے نقشوں کو سنجیدگی سے نہ لے کیونکہ یہ کومنتنگ کے بنائے ہوئے نقشے ہیں۔ وہ (چین) حقیقت پسندانہ طور سرحدی مسلہ حل کرے گا۔"[1]

شین چیانگ۔تبت سڑک تعمیر ہونے کے کچھ عرصہ بعد چین نے اس کی تکمیل کا اعلان کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ہندوستان نے چین کی حکومت کے ساتھ یہ مسئلہ اٹھایا اور ہندوستانی موقف کے ضمن میں دستاویزات دکھائیں۔ اسی اثناء میں چینی فوجوں نے ہندوستانی افسروں اور جوانوں کی ایک ٹیم کو گرفتار کیا اور دو ماہ قید کیا۔ ۲۰/اکتوبر ۱۹۰۹ء کو لداخ میں کونکالا پر ۹ ہندوستانی سرحدی محافظ مارے گئے اور ۱۰ قیدی بنائے گئے۔

ہند۔چین سرحدی تنازعہ: موجودہ دور

۱۹۵۰ء کی دھائی میں ہندوستان اور چین کے درمیان سرحدی مسئلے پر لمبی گفت و شنید نے ہوئی اور فریقین نے اپنے دعوے پیش کئے۔ لیکن دونوں کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ ہندوستانی حکومت کے مذاکرات کاروں نے لداخ کی ایک ہزار سالہ شاہی تاریخ (لداخ گیالربس) اور ۱۶۸۴ء، ۱۸۴۲ء، ۱۸۴۷ء، ۱۸۵۲ء اور ۱۸۹۹ء کے معاہدوں کا حوالہ دیا۔ ۱۸۴۲ء کے معاہدے کے ضمن میں یہ واضح کیا کہ یہ معاہدہ چین کے شہنشاہ، لہاسہ کے لاما گورو اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے نمائندے کے درمیان ہوا تھا۔ جس میں ۱۶۸۴ء کے عہد نامہ کی روشنی میں روایتی طور قائم شدہ سرحد کی توثیق کی گئی تھی۔ ۱۸۵۲ء میں ایک مقامی تنازعے کے سلسلے میں لداخی حاکم بستی رام اور مغربی تبت کے روداق کے کلون رگزین کے مابین ایک میٹنگ ہوئی اور انہوں نے ایک اور مرتبہ سابقہ معاہدوں کی توثیق کی اور یہ واضح کیا کہ لداخ اور تبت کی سرحد پہلی جیسی رہے گی۔ تاہم چینی مذاکرات کاروں نے مذکورہ معاہدوں کے

---

[1] The India-China Border- A Repraisal(1968), Gundkar Narayan Rao

بارے میں بھارتی توجیہات کو چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ یہ باہمی طور عدم جارحیت کا ایک واضح معاہدہ تھا۔ ۱۸۵۲ء کے معاہدے سے متعلق چینی مذاکرات کاروں نے کہا کہ یہ معاہدہ صرف یہ حوالہ دیتا ہے کہ طرفین کی پرانی سرحد قائم رہے گی اور یہ بتاتا ہے کہ لداخ تبت کو اپنا سالانہ خراج tributeادا کرے گا۔ جسے ہندوستان نے قبول نہیں کیا۔ ہندوستانی مذاکرات کاروں نے اپنی جوازیت میں انیسویں صدی کے انگریز سیاحوں کی تحریروں کا حوالہ دیا۔ جس کا چینی وفد نے یہ جواب دیا کہ یہ لداخ پر انگریزوں کے حملے کے بعد کی تحریریں ہیں اور تاریخ میں انہیں روایت سے محمول نہیں کی جاسکتیں۔ انہوں نے ایک انگریز ڈیزی کا ذکر کیا، جس نے بیجنگ کی حکومت سے یہ درخواست کی تھی کہ اس کو اکسائی چین کے راستے لداخ جانے کی اجازت دی جائے لیکن اجازت نہیں ملی۔ بھارتی مذاکرات کاروں نے کشمیر سرکار کے ریکارڈ پیش کیے جن کے مطابق اکسائی چین اور لینگزی تھنگ تحصیل لداخ کے علاقے ٹانکچے کے ذیلی ضلع تھے۔

چین کے نمائندوں نے ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۲ء کی چینی مہمات کا تذکرہ کیا، جن کے تحت شین جیانگ اور لداخ کی سرحدوں کا سروے عمل میں آیا۔

ہندوستانی وفد کے صلاح کار گونڈ کرنرائن راؤ نے کہا ہے کہ ۱۸۴۶۔۴۷ء کے سرحدی کمیشن کی سرحد بندی سے متعلق ہانگ کانگ کے گورنر سر جون ڈیویز کے ۱۸ر نومبر ۱۸۴۶ء کے ایک خط کے جواب میں کونٹو کے چینی وائسرائے نے ۱۳ر جنوری ۱۸۴۷ء کو لکھا ہے کہ یہ سرحدیں (لداخ۔ تبت) ٹھیک طرح اور واضح طور قائم کی جاچکی ہیں اور اس قدیم انتظام پر قائم رہنا بہترین امر ہوگا۔

راؤ نے بھی اپنی کتاب میں انگریز سروے کاروں اور سیاحوں کی تضاد بیانی کا ذکر کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہے: "ولیم مور کرافٹ اور جارج تربیک نے اگر یہ کہا ہو کہ دجوق تبت کے علاقے میں ہے تو یہ سنی سنائی بات ہے۔ یہ لوگ لداخ کے علاقے میں ہی رہے

اور سرحد تک نہیں گئے ــــــــ فریزر لکھتا ہے کہ ڈمجوق لداخ میں ہے اور ٹشی گانگ چین میں ہے۔"

ڈمجوق لیہہ۔ تبت سرحد پر ایک چھوٹا تاہم اہم گاؤں ہے جو ہندوستان کی قلمرو میں ہے۔ یہ لیہہ سے ۳۰۰ کلومیٹر دور اس کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔

ہند۔چین بات چیت پر ڈوروتھی ووڈمین اپنی کتاب Himalayan Frontiers میں لکھتا ہے کہ بھارتی حکومت اپنا موقف پیش کرنے میں زیادہ محتاط اور ماہر تھی۔ اس کے برعکس چینی حکومت نے حیران کن حد تک لاپروائی سے اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ ووڈمین اس ضمن میں چین پر اپنا موقف پیش کرنے کا بے محل حوالہ جات، Internal maze of inconsistencey (داخلی بے ثبات گورکھ دھندا) حتا کہ Blatant and discernable falsehood (بے تکا اور نمایاں دروغ بافی) جیسے الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔

نامور محقق اور آئینی امور کے ماہر اے۔جی۔نورانی نے اس دور کی ہند۔چین بات چیت پر وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی منتخب نگارشات سے ماخوذ مواد پر جریدہ Frontline کے حالیہ شمارہ میں Turning Point in Ties with China کے عنوان سے چند اہم معلومات دہی ہیں۔[1] انکی تلخیص پیش خدمت ہے:

"۲۴/مارچ ۱۹۵۳ء میں ایک نئی سرحد تعین کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ پنڈت نہرو نے یکم جولائی ۱۹۵۴ء کو اس ضمن میں اس پر عمل آوری کے لئے حکم جاری کیا۔ اس فارمولا کے تحت اکسائی چین ہندوستان کا علاقہ قرار دیا گیا تھا۔ نہرو نے ۲۲/مارچ ۱۹۵۹ء کو چین کے وزیر اعظم چواین ،لائی کو ایک خط میں واضح کیا کہ یکم جولائی ۱۹۵۲ء کو سرحد کا جو نقشہ پیش

---

[1] Turning Point in Ties with China-A.G.Noorani, based on selected works of Jawahar Lal Nehru, 1-31March 1959, Second series (Volume 47)

کیا گیا، اس میں بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ یہیں سے ہند۔ چین تعلقات میں تناؤ آیا اور ۱۹۶۲ء میں دونوں ملکوں کے درمیان جنگ ہوئی۔

اس سے پہلے ۲۱ / اگست ۱۹۵۸ء کو ہندوستان نے چین سے شکایت کی تھی کہ چین کے نقشے میں مشرقی لداخ کا بڑا علاقہ دکھایا گیا ہے، جو جموں و کشمیر کا حصہ ہے۔ نہرو نے ۱۴ / دسمبر ۱۹۵۸ء کو اپنے ایک خط میں یہ بھی واضح کیا تھا کہ شمال مشرقی فرانیٹر ایجنسی (اروناچل پردیش) دیرینہ طور ہندوستان کا علاقہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں چواین لائی نے ۲۳ / جنوری ۱۹۵۹ء کو لکھا کہ چین۔ ہند سرحد کی کبھی حد بندی نہیں ہوئی ہے اور تاریخی طور چین کی مرکزی حکومت اور ہندوستانی حکومت کے درمیان کوئی عہدنامہ عمل میں نہیں آیا ہے۔ میکموہن لائن کو مسترد کرتے ہوئے چواین لائی نے کہا تھا کہ اس پر کم و بیش حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ تب چین کو اکسائی چین میں شین جیانگ۔ تبت سڑک بنائے لگ بھگ دو سال ہو چکے تھے۔ جس سرزمین پر ہندوستان نے اپنا حق جتایا تھا اور اس کے حقِ ملکیت کے بارے میں اپنے ۲۲ / مارچ ۱۹۵۹ء کے خط میں کسی قسم کی گفت وشنید کرنے سے انکار کیا تھا۔

نہرو نے تب۔ لداخ کی سرحد کے سلسلے میں ۱۸۴۲ء کے معاہدے کا حوالہ دیا۔ جس کا ذکر اوپر آیا ہے جو چین کے شہنشاہ، تبت کے لاما گورو اور کشمیر کے مہاراجہ کے درمیان عمل میں آیا جس کو ۱۸۴۲ء میں چین نے تسلیم کیا۔ چین جس علاقے کو اب دعویٰ کرتا ہے۔ اسے سابق سرکاری نقشے میں ہندوستان کا علاقہ دکھایا گیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۳ء کے چین نقشے میں بھی اسے بھارتی قلمرو میں دکھایا گیا ہے۔ لیکن چینی اپنے دعوے پر اڑا رہا اور جواب دیا کہ ۱۸۴۲ء کے معاہدے میں اسے دونوں خطوں کے مابین سرحد بالکل قرار نہیں دی گئی ہے۔ یہ لڑائی کے بعد عدم جارحیت کا ایک عہدنامہ تھا۔

چین کے لئے اکسائی چین افادیت رکھتا ہے۔ اسی طرح میکموہن لائن ہندوستان کے لے اہمیت کا حامل ہے۔

نہرو کو چین کی طرف سے حملے کا اندیشہ نہیں تھا۔ نومبر ۱۹۵۰ء میں انہوں نے اپنے سینئر وزیر سردار ولبھ بائی پٹیل کو ایک خط میں لکھا تھا کہ امن یا جنگ دونوں صورتوں میں چین کی طرف سے کسی حملے کا بہت کم امکان ہے۔ نہرو نے لکھا تھا کہ مختلف عالمی عوامل کے تحت وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ امن میں ایسا کوئی حملہ عالمی جنگ پر منتج ہوگا۔ چین پر بحری اور ہوائی حملے ہوسکتے ہیں۔ اپنے سے طاقت ور دشمنوں کے سامنے اس کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس لئے نہرو نے چین سے کسی بڑے حملے کو خارج از امکان قرار دیا۔

آگے جاکر وزیر اعظم کی یہ خوش فہمی غلط ثابت ہوئی۔ البتہ انہوں نے یہ لکھا تھا کہ چین کا ضرور ہماری سرحد کے اندر رفتہ رفتہ در اندازی اور متنازعہ علاقے پر قابض ہونے کا پورا امکان ہے۔ جو صحیح ثابت ہو رہا ہے۔

پاکستان کے فوجی صدر ایوب خان نے برصغیر ہند کو بیرونی خطرہ اور خارجی امور کے ضمن میں جو پالیسی مرتب کی ہے، ڈوروتھی دوڈمین نے اپنی کتاب یں اس کا ایک اقتباس دیا ہے۔ ایوب خان رقم طراز ہیں:

> ''جنگ اور فوجی حکمت عملی (Strategy) کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں بالکل صاف طور شمال سے بحر ہند کے گرم پانی کی طرف بے تحاشا پیش قدمی کو دیکھ سکتا ہوں۔ ہندوستان اور پاکستان اگر ایک دوسرے سے جھگڑتے رہیں تو یہ Push (دھکیل) بڑھے گی۔ اس کے برعکس جب ہم اپنے مسائل حل کریں اور اندرون ملک آج تعینات اپنی مسلح افواج کو بیرون ملک کی سرحد پر تعینات کریں، تو میرا خیال ہے، ہمارے لئے ماضی کی تاریخ دہرانے کے تدارک کا یہ اچھا موقع ہے۔ جب بھی برصغیر آپسی طور منقسم تھی، کسی نہ کسی نے بیرونی طاقت کو گھس پیٹھ کے لئے دعوت دی۔''

تین سال بعد مارچ ۱۹۶۳ء میں چین اور پاکستان کے مابین قراقرم کے مغرب میں سرحدی مسئلہ طے ہوا اور پاکستان نے وادی شکگام چین کو دیا۔

۲۱/اکتوبر ۱۹۶۷ء کو چین سے گلگت تک ایک سڑک کی تعمیر کے لئے ایک معاہدے پر دستخط ہوئے، جو بعد میں شاہراہ قراقرم کی تعمیر پر منتج ہوئی۔

شکسگام برصغیر کے سرحدی علاقہ ہنزا کے زیر نگیں تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے کہ چین کی حکومت اور برطانوی ہند سرکار کے درمیان ہنزہ اور اس کے مقبوضہ علاقے تغ دومبش اور رسکم پر تنازعہ رہا تھا۔ اے۔ جی۔ نورانی کی کتاب India-China Boundry Problem.1846-1947, History and Diplomacy کی روشنی میں شکسگام جموں وکشمیر کا علاقہ نہیں تھا۔ بعد میں نئے نقشے میں اسے اجاگر کیا گیا۔

گونڈ کرنرائن راؤ کے مطابق ۱۹۵۹ء میں چین اپنے اس بیان سے مکر گیا کہ وہ حقیقت پسندانہ طور سرحدی مسئلہ حل کرے گا۔ چین نے یہ نئی تجویز رکھی کہ تصفیہ ہونے تک متنازعہ علاقے کو کالعدم قرار دیا جائے۔ ستمبر ۱۹۶۲ء میں ہندوستان نے بات چیت کیلئے ۱۵/ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی تھی لیکن چین بات چیت کے لئے آمادہ نہیں تھا اور لداخ اور نیفا پر حملے کئے۔ اس کے بعد کے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔

لداخ۔ تبت سرحد پر زمینی حقائق (Ground Realities) اچھے نہیں ہیں۔ کئی دھائیوں سے چین اکسائی چین کے ۳۸ ہزار مربع میل علاقے پر قابض ہے۔ معتبر ذرائع اور جانکار حلقوں کے مطابق ۱۹۸۶ء کے بعد چینی فوج (پیپلز لبریشن آرمی) مزید ۴۵ کلومیٹر لداخ کے علاقے میں گھس آئی ہے۔ مشرقی لداخ کے دمجوق سیکٹر میں سکق جُونگ کی سرمائی چراگاہ اپنے قبضے میں لی ہے۔ جس سے سرحدی گاؤں کے خانہ بدوش چنگپاؤں کے ہزاروں مال مویشیوں اور بھیڑ بکریوں کی خوراک کی ضرورت پوری ہوتی تھیں۔ چین نے لداخ کے کئی سرحدی گاؤں میں ترقیاتی کام روک دیا ہے۔ اپریل ۲۰۱۳ء

میں چینی فوج لداخ کے علاقے میں ۱۹ کلومیٹر اندر گھس آئی اور بیس دن بعد مشروط طور واپس چلی گئی۔ یہ سارے واقعات ہندوستان اور چین کے مابین امن و آشتی کے معاہدوں کی آڑ میں ہوئے ہیں۔

نومبر ۱۹۵۰ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے سردار پٹیل کے نام ایک خط میں چین سے جس اندیشے کا اظہار کیا تھا۔ وہ صحیح ثابت ہوا ہے۔

اس صورت حال سے لداخیوں میں غم و غصہ پایا جاتا ہے اور حکومت کو کئی مرتبہ اپنی عرضداشتیں پیش کی ہیں کہ صورت حال سے نپٹنے کے لئے چین کے مدِ مقابل ایک موثر قدم لے۔

اس اجمال کی تفصیل دینے سے پہلے لداخ کے سرحدی علاقوں کا مختصر تذکرہ پیش ہے:

جمہوریہ ہند اور عوامی جمہوریہ چین کی سرحد کی لمبائی ۴۰۵۷ کلومیٹر ہے۔ جس میں ۴۰۰ کلومیٹر سے زیادہ لمبی سرحد لداخ میں پڑتی ہے۔ چین۔ ہندوستان سرحد (LAC) Line of Actual Control کہلاتی ہے۔ یہ لمبی سرحد ہندوستان کے مغربی، درمیانی اور مشرقی سیکٹروں سے گزرتی ہے۔ مغربی سیکٹر میں لداخ، درمیانی سیکٹر میں اتراکھنڈ اور ہماچل پردیش اور مشرقی سیکٹر میں اروناچل پردیش اور سکم کی ریاستیں آتی ہیں۔ مشرقی اور شمالی لداخ کی سرحد پر چند گاؤں آباد ہیں۔ اکسائی چین سمیت بیشتر علاقے میں کوئی بستی یا انسانی آبادی نہیں ہے۔ جہاں آبادی ہے۔ وہاں زیادہ تر خانہ بدوش چنگپا رہتے ہیں۔ پورے علاقے کو چنگ تھانگ کہا جاتا ہے۔ جس کا معنی شمالی میدان ہے اور اس نسبت سے چنگپا یا شمالی میدان کے باشندے کی اصطلاح بنی ہے۔ چنگپا کو ڈوقپا یا 'بالائی علاقے کے باسی' بھی کہا جاتا ہے۔۔ کچھ آباد علاقے پندرہ ہزار فٹ بلند ہیں۔

چنگپا منگول نسل کے ہیں۔ یہ مال مویشی خاص کر پشمینہ بکریاں پالتے ہیں جن سے ایک لداخی محقق چھرنگ پنچگ کے مطابق ۴۵ ہزار کلوگرام پشمینہ پیدا ہوتا ہے۔ پشمینہ سے کشمیر میں عمدہ شالیں بنتی ہیں۔ چھرنگ پنچگ نے لکھا ہے کہ ۱۲۰۰ خانہ بدوش کنبے نقل مکانی کرتے ہیں اور سال میں ۵ سے ۱۲ مرتبہ اپنے کمپ بدلتے ہیں۔

جریدہ Border Affairs کے اپریل۔ جون ۲۰۱۳ء کے شمارے میں چھرنگ پنچگ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ چین نے ۱۹۸۰ء کی دھائی سے بڑے علاقے پر قبضہ کیا ہے۔ ۱۶۸۴ء اور ۱۸۴۲ء کے معاہدوں کے مطابق تبت اور لداخ کی سرحد کیگو نارو پر تھی جو ڈم چھلے سے پورے ایک دن کا راستہ ہے۔ جہاں ۱۹۶۲ء کی ہند۔ چین جنگ سے پہلے ہماری ایک اگلی چوکی تھی۔ ڈم چھلے اب بھارت کے پاس نہیں ہے۔

مضمون نگار آگے لکھتا ہے: ''علاقے کے بزرگ بتاتے ہیں کہ چھوشول سے لداخ۔ تبت کی سرحد دو دن کا سفر تھا اور سپنگور جھیل کے مشرقی کنارے سے ایک دن کا سفر تھا۔ یہ بزرگ تجارت کے سلسلے میں چھوشول سے تبت کے سرمائی صدر مقام رُودوق جاتے تھے۔ آج چھوشول لداخ۔ تبت سرحد پر آخری گاؤں ہے۔

کیرغستان میں ہندوستان کے سابق سفیر اور دفاعی تجزیہ کار پی۔ ستبدن کے مطابق ۱۹۸۶ء سے چین نے مشرقی لداخ کے دمجوق سیکٹر میں سکق جُونگ کے بڑے علاقے پر قبضہ کیا ہے۔ اب چینی شمال مشرقی لداخ کے چپ چاپ علاقے میں داخل ہوئے ہیں۔ ۴۵ کلومیٹر لمبا سکق جُونگ لداخ کے چھوشُول، چھاغا، نیدر، نیوما، مُوت، دونگتی، ٹویول اور لوما گاؤں کے خانہ بدوشوں کے جانوروں کی واحد سرمائی چرگاہ ہے۔ جوان کی گزر بسر کا ذریعہ ہے۔

اس ضمن میں چھرنگ پنچگ نے Border Affairs میں لکھا ہے:

''۱۹۸۰ء کی دھائی کے نصف تک لداخی چنگپا سردیوں میں بلا روک ٹوک اپنی بھیڑ بکریاں چرانے کے لئے سکق جُونگ لے جاتے تھے۔ ہماری حکومت کی لاپروائی سے اب اس چراگاہ پر تبتی خانہ بدوش جولائی اگست میں اپنے مویشی چرانے لاتے ہیں۔''

مصنف لکھتا ہے: ''سکق جُونگ کی سرمائی چراگاہ سے لگ بھگ ۸۰ ہزار بھیڑ بکریوں اور ۴ ہزار یاک کو سرمائی ڈھائی ماہ کے لئے گھاس میسر تھی۔ یہاں ایندھن اور تازہ پانی بھی دستیاب ہے اور مقابلتاً سردیوں میں یہ جگہ گرم ہے اور کم برف پڑتی ہے۔ تب بھیڑ

بکریاں ساٹھ ہزار کوئنٹل گھاس کھاتی تھیں۔ جس کی مالیت لداخ میں گھاس کی موجودہ شرح قیمت کے مطابق ساڑھے سات کروڑ روپے ہے۔ بڑے جانور پندرہ ہزار کوئنٹل گھاس کھاتے تھے۔ پنچگ نے لکھا ہے کہ مذکورہ اور دوسری وجوہات کی وجہ سے بہت سارے چنگپاؤں نے بھیڑ بکریاں پالنا چھوڑ دیا ہے اور روزگار کے دوسرے وسائل تلاش کر رہے ہیں۔'' (متعدد کنبے نقل مکانی کر کے لیہہ منتقل ہوئے ہیں۔)

چین کے بارے میں یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ لداخ کے علاقے کو آہستہ آہستہ nibble (کتربیونت) کرتا جارہا ہے۔ چھرنگ پنچگ نے چین کی ایک کہاوت کا ذکر کیا ہے۔ ''اگر تم ایک ملک فتح کرنا چاہتے ہو، تو اس کو گزوں کے بجائے انچوں سے فتح کرو۔'' چنگ تھانگ کے سب ڈویژنل مجسٹریٹ چھرنگ نوبو نے چین کے incursion پیش قدمی کے ضمن میں ۱۰-۲۰۰۹ء میں اپنے افسر بالا کو اپنے ایک خط میں اسی کہاوت کا حوالہ دیا تھا۔

پنچگ لکھتا ہے: ''یہی چین کی موجودہ پالیسی کی عکاس ہے۔ چین نے چھوشول۔ چھاغا سڑک پر ریزونگ لا کے پاس ایک چوکی قائم کی ہے۔۔۔۔۔ کوئی مزاحمت نہ پاکر نوے کی نصف دہائی میں چین نے تاجروں کے لئے ہمارے علاقے (ڈم چھلے) میں مکانات تعمیر کرنے شروع کئے اور ڈم چھلے تک ایک سڑک بنائی۔''

کئی دفعہ چین نے سرحد پر ترقیاتی کاموں میں رکاوٹیں ڈالی ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں ہندوستانی گاؤں دمجوق میں چینی فوج نے لداخ کے انتظامیہ کو بس سٹاپ پر شیڈ بنانے سے روکا اور کام ادھورا چھوڑنا پڑا۔ دمجوق سے لداخی بودھ صدیوں تک کیلاش مانسرور کی یاترا پر جاتے رہے ہیں۔ اب یہ راستہ بند ہے۔ یاتری اتر پردیش کے پیتورگڑھ سے کیلاش جاتے ہیں۔ یہ راستہ بہت لمبا اور دشوار گذار ہے۔

جولائی ۲۰۱۲ء میں چین نے چومود کے علاقے میں ہیلی کاپٹروں کی مدد سے ہندوستانی دمدمے اور خیمے تباہ کئے۔ ٹائمز آف انڈیا نے ۱۹ر ستمبر ۲۰۱۲ء کے شمارے میں اس خبر کو China Needles India in Eastern Ladakh کی سرخی سے شائع کیا۔

۲۰۱۳ء میں سب سے بڑا واقعہ ۱۵ اپریل کو پیش آیا۔ جب ۳۰ سے ۴۰ کے درمیان چین کے فوجی دو ہیلی کاپٹروں کی مدد سے ڈیپ سانگ کے علاقے میں لداخ کے ۱۹ کلو میٹر اندر دولت بیگ اولڈی[1] کے برثے کے مقام پر آئے اور خیمے نصب کئے۔ انہوں نے ایک بینر آویزاں کیا۔ جس پر لکھا تھا: ''یہ علاقہ چینی قلمرو میں ہے۔''

۱۶ اپریل کو سرحدی محافظ ITBP (انڈو تبتن بارڈر پولیس) نے اسے ۵۰۰ میٹر کے فاصلے پر خیمے لگائے اور فورٹین کور کی طرف سے ۵ لداخ سکاوٹس کے پیدل بٹالین کو علاقے کی طرف جانے کا حکم ملا۔

۱۸ اپریل کو سرحدی گاؤں چھوشول میں بھارتی اور چینی کمانڈروں کی پہلی فلیگ میٹنگ ہوئی۔ چین نے جگہ چھوڑنے سے انکار کیا اور دعویٰ کیا کہ مقبوضہ جگہ چین کا علاقہ ہے۔ دوسری فلیگ میٹنگ بھی کسی تصفیے کے بغیر ختم ہوئی۔ اس کے بعد دو اور میٹنگیں ہوئیں۔ فریقین کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ ایک میٹنگ میں چینی مذاکرات کاروں نے مشرقی لداخ میں Infrastructures تعمیرات مسمار کرنے کا مطالبہ کیا۔ جن میں ایک اہم مقام چُومُور میں چند نئے دمدمے تعمیر کئے گئے تھے۔ اس سرحدی خلاف ورزی کا سرکاری اور ملکی سطح پر رد عمل دیکھنے میں آیا۔

دفاعی تجزیہ کار پی۔ ستبدن نے انڈین اکسپریس کے ۲۰ اپریل کے شمارے میں The Ladakh Drift کے عنوان سے ایک مضمون میں صورت حال پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے: ''یہ بات خارج از امکان ہے کہ چین بے آب و گیاہ اکسائی چین میں دریائے شایوق اور دریائے چنگ چھنمو کا رُخ موڑنے کا منصوبہ بنا سکتا ہے۔

---

[1] دولت بیگ اولدی ایک اعلیٰ خاندان کی ترکی خاتون کا نام بتایا جاتا ہے۔ جو ماضی میں نامعلوم سن اور تاریخ کو قراقرم درہ پار کرنے کے بعد اس جگہ چل بسی تھی۔ اولدی ترکی میں موت کا معنی دیتا ہے۔ درہ قراقرم لداخ کے انتہائی شمال میں شین جیانگ۔ لداخ تجارتی راستے پر چین کی سرحد سے ۸ کلو میٹر دور واقع ہے۔ اور اکسائی چین کی سرحد LAC سے ۹ کلو میٹر دور ہے۔

ستبدن نے یہ قیاس آرائی کی ہے کہ چین کا ارادہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قراقرم کے جنوب سے ہوکر مشرق سے دریائے شایوق کو پار کرے۔ جس سے جغرافیائی طور اہم نوبرا وادی میں نقل و حمل کے ذرائع متاثر ہوں گے۔

اندرونی لداخ میں چین کے میلوں داخل ہونے کی کئی وجوہات اور تاویلات پیش کی جاتی ہیں۔ ہندوستان نے دولت بیگ اولدی، فوکچے اور نیوما جیسے اگلے علاقوں میں ہوائی اڈے تعمیر کیے ہیں اور انہیں بروئے کار لایا ہے۔ لیہہ اور دولت بیگ اولدی کو سڑک سے ملانے کے لئے اقدام کئے ہیں۔ چومور سیکٹر میں نئے مورچے اور دمدمے تعمیر کئے ہیں اور بھارتی سرحدی محافظ دستوں نے اپنی گشت تیز تر کی ہے۔ ان عوامل سے چین برافروختہ ہوا ہے۔ چین، سرحدی تنازعے کو جلدی طے کرنے کے لئے بھی مصر رہا ہے۔ یہ چند اسباب ہوسکتے ہیں لیکن خود چین نے سرحد کے پار اپنے علاقے میں اسے کہیں زیادہ دفاعی تعمیرات کی ہیں۔ ہوائی مستقر بنائے ہیں۔ ہندوستانی سرحد تک چار لاینوں والی دورویہ پختہ سڑک بنائی ہے۔ ماہرین کے مطابق چین ۱۳۰۰ اکلومیٹر دور لہاسہ سے ۳۰ گھنٹے میں ایک بڑی مسلح فوج تبت۔ لداخ سرحد تک لاسکتا ہے۔

دیپ سانگ سے چینی فوج کا انخلا پانچویں فلیگ میٹنگ کے بعد ۵ مئی کو عمل میں آیا۔ فریقین میں کیا فیصلے ہوئے ان سے متعلق میڈیا کو کچھ نہیں بتایا گیا۔ دیپ سانگ سے چین فوجیوں کے انخلا کے بارہ روز بعد ۱۷ مئی کو چینی فوجیوں نے ہندوستانی ایک گشتی دستے کو LAC جانے سے روکا۔ یہ واقعہ سری جاپ علاقے میں پیش آیا۔

چین کے ساتھ ۱۴ میں سے ۱۲ ازمینی ہمسایہ ملکوں نے اپنے سرحدی مسئلے طے کئے ہیں لیکن مشرقی چینی سمندر میں چین نے دفاعی ہوائی زون قائم کیا ہے جسکی امریکہ، جاپان، جنوبی کوریا اور تائیوان نے مخالفت کی ہے۔ جنوبی کوریا نے اپنا ہوائی زون قائم کیا ہے۔ اس صورت حال سے خطے میں تناؤ پایا جاتا ہے۔

ہرچند چین ایک پارٹی والی سخت گیر (Authoritrian) ملک ہے۔ قطع نظر

اس کے چین کی ہمسری کرنے کے لئے چین کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایک امریکی مارک لیونارڈ نے حال میں ایک کتاب What Does China Think لکھی ہے۔ اس میں مصنف نے چین کے Think Tank اور دانشوروں کا ذکر کیا ہے جو زیر آسمان مختلف مسائل اور نکات پر سوچتے ہیں۔ تبادلہ خیال کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ امریکہ میں دس ہزار سے زیادہ Think Tank نہیں ہیں۔ انگلینڈ میں صرف چند سو ہیں۔ چین میں صرف ایک ادارہ اکادمی اور سوشل سائنسز میں ہمہ وقت کام کرنے والے چار ہزار دانشور اور مفکر ہیں۔ جن میں بہت سارے امریکہ میں تعلیم یافتہ ہیں۔ اس طرح چین، بقولِ مصنف Powerhouse of Ideas (فکر و نظر کی آماج گاہ) بنا ہے جو دُنیا میں اپنا اثر و نفوذ ڈال سکتا ہے۔

پچھلے پچیس سال کے دوران چین اور ہندوستان کے مابین متعدد میٹنگیں ہوئی ہیں ان میں ماہرین کی پندرہ گروپ میٹنگیں، جوئنٹ ورکنگ گروپ کی پندرہ میٹنگیں اور خصوصی نمائندوں کی اتنی ہی میٹنگیں شامل ہیں۔ سرحد پر امن قائم رکھنے اور باہمی مسائل کو بات چیت سے حل کرنے کے کئی معاہدے ہوئے ہیں لیکن کئی دفعہ چین نے ان معاہدوں کو پس پشت ڈالا ہے اور لداخ کے علاقوں پر قابض ہوا ہے۔

حال میں Border Defence Cooperation Agreement(BDCA) 'عہدنامہ' سرحدی دفاعی تعاون، کے نام سے وزیر اعظم منموہن سنگھ اور چینی وزیر اعظم لی۔ کے کیا نگ کے مابین بیجنگ میں ۲۳ر اکتوبر ۲۰۱۳ء کو ایک اہم معاہدہ ہوا ہے، جس پر گریٹ ہال آف دی پیپُول میں دستخط ہوئے۔ اس کے تحت دونوں ممالک اپنا سرحدی تنازعہ باہمی بات چیت سے حل کریں گے۔ ایک دوسرے کے خلاف طاقت کا استعمال اور طاقت کی زبان استعمال نہیں کریں گے اور مسلح تصادم سے گریز کریں گے۔

☆☆☆

☆ راجہ نذر بونیاری

جہلم ویلی روڈ تاریخ کے اوراق میں

ستی سر کشپ مر، شی می لو، کشمیر، کاشمر اور کشیر یہ سب نام صرف ایک ایسے خطہٗ کے ہیں جو شمال میں وسط ایشیائی ممالک روس اُزبکیستان۔ قزاقستان۔ تاجیکستان جنوبی آرمیدیا، افغانستان، چینی ترُکستان اور چین جنوب میں ہندوستان مغرب میں ایران اور مشرق میں شمالی ہمالیائی خطے کی ریاستوں تک پھیلی ہوئی قلمرو کے ہیں جو تواریخ اور دستاویزی تذکروں نیز سفرناموں اور سیاحت کے گائیڈوں میں ایک طویل نام سے مشہور ہے۔ اِس قلمرو یعنی سلطنت میں، جو صوبے یا علاقے شامل تھے وہ ہیں جموں، لداخ، تبت، گلگت بلتستان و شمالی علاقہ جات۔ مشہور مورّخ اور اس قلمرو کی حکومت میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے والے افسر مولوی حشمت اللہ خان نے اپنی تاریخِ جموں و کشمیر میں جن علاقوں کو شامل کیا ہے وہ اس طرح ہیں۔ کشتواڑ جو ۱۸۱۹ء تک ایک الگ خود مختار راجواڑے کے حیثیت سے شمالی ہمالیائی ریاستوں میں شمار ہوتا تھا، سِکھ دورِ حکومت میں اسے ملک کاشمر میں شامل کیا گیا۔ تبت اصلی (لہاسہ) تبت بزرگ (لداخ) تبت خورد (بلتستان) پوریگ (کرگل و زانسکار) گلگت دردستان کے علاوہ ملحقہ جات کافریا کافرستان کرغیزستان، یارقند اور بدخشاں مختلف ادوار میں اِس قلمرو میں شامل رہے ہیں۔ اپنی جغرافیائی اور ٹوپوگرافی کی حیثیت سے یہ قلمرو انتہائی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ کیونکہ مشرق بعید کے ممالک۔ یورپ جنوبی ایشیائی ممالک اور خصوصاً سینٹرل ایشیا بشمول (ترُکستان) کے لئے یہ خطہ ارضی تجارت، سیاحت کے لحاظ سے

ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ حملہ آوروں، سیاحوں، تاجروں، مذہبی مشنریوں، لٹیروں، خانہ بدوش قبائل کے لئے یہ جنتِ ارضی کشش کا مرکز رہی ہے۔ غرض جو لوگ بھی فرداً فرداً یا پھر اجتماعی حیثیت سے اِس جنت میں مختلف دروازوں سے وارد ہوئے ہیں وہ یا تو یہیں کے ہو کر رہ گئے یا پھر بادلِ ناخواستہ واپس اپنے وطن لوٹ گئے لیکن ہر آنے جانے والا یہاں پر اپنی کوئی نہ کوئی نشانی یا چھاپ چھوڑ گیا۔ جو اجنبی جس نیت سے بھی آیا، اس دھرتی نے گویا اُس پر جادو کر دیا اور اُسے اتنا متاثر کیا کہ وہ اُس نے اپنے تاثرات سفرناموں، سیاحتی گائیڈوں، تذکروں اور تواریخ میں بیان کئے ہیں جو اس قدیم ترین خطۂ ارضی کی تاریخ و جغرافیہ یہاں کے باسیوں کے حالاتِ زندگی، تہذیب و تمدّن، مذہب عقائد و ثقافت، معیارِ حیات کو سمجھنے میں بے حد مدد و مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔

اِس عجیب و غریب قلمرو کا مرکز وادیٔ کشمیر ہی رہا ہے۔ وادیٔ کشمیر جس کے بارے میں ہر وہ شخص جسے اس وادی کی سیاحت کی ایک ہی رائے ہے کہ اگر جنت کہیں ہے تو وہ یہیں ہے۔ اِس جنت کے چاروں طرف قُدرت نے ایک بے مثال فصیل تعمیر کی ہے جو فلک بوس پہاڑوں، برفانی پہاڑیوں اور چوٹیوں۔ سنگلاخ چٹانوں، خطرناک گھنے جنگلات، پُراسرار گھاٹیوں اور درّوں پر مشتمل ہے۔ بظاہر یہ جنت کا ٹکڑا ناقابلِ تسخیر و رسائی لگتا ہے لیکن جن لوگوں کے عزائمِ آہنی اور اپنی سنگلاخ چٹانوں کی طرح حوصلے مضبوط اور فطرت کے جادوئی حُسن کی طرح خیالات اور سوچ خوب صورت اور اعلیٰ ہوتے ہیں وہ اپنی منازل مقصود اور ٹارگٹ حاصل کر ہی لیتے ہیں۔ اگر ہم آج کے ترقی یافتہ سائینسی دَور کا مقابلہ آج سے ہزاروں سینکڑوں سال پہلے کے حالات سے کریں تو یقین ہی نہیں آتا کہ پانچ ہزار سال پہلے اِس وادی میں زندگی کے آثار ہوتے یا پھر باہر سے کوئی فرد انتہائی نامساعد موسمی حالات میں اِس وادی کی طرف رُخ کرنے کی ہمت کرتا لیکن تحقیق و تلاش کرنے والے عظیم لوگوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انتہائی مُشکلات کے باوجود فطرت پسندوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر ایک مثال قائم کر دکھائی کہ اگر حوصلہ بلند ہو اور ایمان مستحکم تو وہ کون

سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا۔ عاشقوں نے کشمیر کو دریافت کر ہی لیا۔ کہتے ہیں کہ فاہیان کشمیر کی باقاعدہ سیاحت کرنے والے پہلا غیر ملکی سیاح تھا۔ اپنے سفرنامے میں فاہیان نے کشمیر کی خوب صورتی کا ذکر کرنے کے علاوہ لکھا ہے کہ اِس جنت میں داخل ہونے کے لئے ہمت، حوصلے اور مستحکم عزم کی ضرورت ہے۔ یہ مُلک دیو مالائی کردار کا حاصل ہے۔ کشمیر مافوق الفطرت، جنات، حشرات الارض، انتہائی خوفناک اور وحشت ناک جنگلی وحشی جانوروں، کا دیس ہے جہاں قدم قدم پر جہاں فطرت ہماری رہنمائی کرتی ہے اور قدم چومتی ہے وہیں موت کا فرشتہ ہر لمحہ ہمارے استقبال کے لئے تیار رہتے ہیں۔ خوب صورت جھرنے پہاڑی ندی نالے دریا، جھیلیں وافر مقدار میں ہیں لیکن انہیں عبور کرنے کیلئے نہ کوئی پُل ہے نہ کوئی اور ذریعہ۔۔۔۔۔۔۔ فاہیان کے تذکرے کو ادھورا چھوڑ کر جب ہم دُنیا کے مختلف ممالک سے مختلف اغراض و مقاصد کے لئے آنے والے سیاحوں، حملہ آوروں کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہاں ہزاروں سال پہلے سے (بودھ اور ہندومت سے پہلے) بھی جو لوگ آئے ہیں وہ عجیب و غریب عقائد سے تعلق رکھتے تھے۔ جن میں ایسے لوگ بھی تھے جو ہر اُس شئے کو اپنا خالق، معبود یا مالک سمجھتے تھے جو انہیں ہلاک کرنے کی اہلیت کی حامل ہو۔ جیسے آگ، پانی، سانپ، بچھو، آفاتِ سماوی، درخت، دریا، دھوپ، سردی وغیرہ۔ درخت سے گِر کر مر جانا۔ یا کسی کے اوپر درخت یا درخت کی شاخ کا گرنا اور مر جانا۔ دریا میں بہہ جانا، شدت کی دھوپ سے مر جانا۔ برف یا شدید سردی سے مر جانا۔ لڑھک کر یا چٹان سے ٹکرا کر یا پتھر لگنے سے مر جانا، وحشی جنگلی جانوروں کا کاٹ کھانا، آگ میں جل کر مر جانا، وغیرہ۔ اِن سب کو پُوجا کرنے والوں کے بھی مختلف مذاہب تھے جب آریہ کشمیر میں داخل ہوئے تو وہ پنجاب اور سندھ شامل ہیں۔ چنانچہ پال خصوصاً دریاؤں کی پُوجا کرنے والے جہلم جس کا نام ابتدائی دور میں ویتھ یا وِتستا تھا کے دونوں کناروں پر سے سفر کرتے ہوئے وادی میں درنگہ بل اور اوشکرہ کے مقامات سے وارد ہوئے جو بارہ مولا کے تاریخی قصبے کے دائیں اور بائیں کناروں پر آباد چیک پوئنٹ تھے۔ جہاں پر

وادی میں داخل ہونے والوں کو ٹیکس یا چونگی ادا کرنا پڑتی۔ درنگ وتستا کے دائیں کنارے پر آج تک اسی نام سے موجود ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے، ویتھ یا وِتستا کے دائیں طرف کے پرگنہ جات کو دچھن پارہ کہتے تھے۔ جو پرگنہ کامراج (کمراز) کے درنگ بل کی گزرگاہ سے آگے چکڑی (موجودہ مظفر آباد) کے گاؤں لوہار گلی تک کے علاقے کو کہتے تھے (آج اس سارے علاقے کو دچھنہ (دائیاں) کہتے ہیں اور لسبجن ۔۔۔۔۔۔۔ وسطی کشمیر کے پرگنہ بیروہ ۔۔۔۔۔۔۔ ماگام کریری پٹن ۔۔۔۔۔۔۔، سنگرامہ ۔۔۔۔۔۔۔ کنڈی سلطانپورہ شیری (فتح گڑھ)، گانٹہ مولا، نوشہرہ، بونیار رام پور، اورن پورہ، چندہ واڑی مہورہ اور اُوڑی کو کھادڑیارہ یا کھاوڑہ کہتے تھے۔ کھاوڑہ دراصل ویری ناگ سے کوہالہ تک وتستاء کے بائیں کنارے پر آباد دیہات و پرگنہ جات کو کہتے ہیں۔ پانی اور دریا کے منبع کو آریہ شکتی اور شکتی آگُر یعنی طاقت اور طاقت کے منبع بالترتیب کہتے تھے۔ وہ شکتی سے زیادہ شکتی آگر کو اہمیت دیتے تھے اسی لئے وہ دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر چلتے چلتے اور شکتی آگُر (منبع) کی تلاش میں ویری ناگ جا پہنچے۔ کشمیر ہو یا ہمالیہ کے دوسرے علاقے جہاں سے کئی دریا نکلتے ہیں ہر دریا کے منبع پر منادر تعمیر کئے گئے ہیں۔ یہ منادر کن لوگوں نے بنائے ہیں اس کے بارے میں مختلف تواریخ اور تذکروں میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا ذکر ہے لیکن چونکہ کشمیر میں مجموعی طور پر شیوازم کا دَور دورہ طویل عرصے تک رہا ہے جسے بعد میں فاتح سندھ، محمد بن قاسم کے سندھ فتح کرنے کے بعد سندھ کے رہنے والوں کو سندھو اور ہند کے رہنے والوں کو ہندو کہا اور کشمیر میں جو فرقہ تھا اِسے بھی ہندو کہا جانے لگا۔ دیکھا جائے تو شاستروں اور قدیم تذکروں میں یہ لفظ کہیں بھی نہیں۔ بیرونی سیاحوں اور حملہ آوروں کے لئے وادی میں داخل ہونے کے لئے کئی راستے موجود تھے جن میں پنجاب سے ہزارہ، کاغان پکھلی یا مری چکڑی یعنی مظفر آباد سے اوڑی اور پھر بارہمولہ سے آگے وادی جس کی لمبائی ۸۵ میل اور چوڑائی ۲۵ میل اسوقت کے تذکروں میں لکھی ہے شروع ہوتی ہے۔ کوہالہ اوڑی بارہمولہ راستے کو قدیم تذکروں تِستا شی می لو اور ۱۸۸۹ء کے بعد کے تذکروں میں

جہلم ویلی کارٹ روڑ لکھا گیا ہے۔ کچھ تذکروں میں اسے مظفر آباد بارہمولہ اور کچھ سیاحتی گائیڈوں میں دچھن پارہ اور پکھلی راستہ بھی لکھا ہے۔ دُوسرا راستہ بذریعہ حاجی پیر اوڑی اور بارہمولہ۔ تیسرا راستہ بذریعہ توسہ میدان چرار شریف۔ چوتھا راستہ جسے ہم آج مغل روڑ کہتے ہیں جو راجوری پونچھ بہرام گلہ اور شوپیاں۔ پانچواں راستہ اسکردو سے کرگل۔ دراس۔ زوجیلا اور سونہ مرگ، چھٹا راستہ کشتواڑ وڈون۔ ڈکسم سے جنوبی کشمیر کے کوکرناگ اور ایک راستہ جو بانہال سے قاضی گنڈ آتا تھا۔ جسے ہم آج بانہال کارٹ روڑ کہتے ہیں۔ بانہال سے کارٹ روڑ اور مغل روڑ آج کی تاریخ میں وادیٔ کشمیر کو ساری دُنیا سے ملا رہے ہیں جبکہ بارہمولا کوہالہ روڑ ۱۹۴۷ء کے قبائیلی حملے کے بعد آج تک بند ہے۔ اوڑی سے 15 کلومیٹر آگے بطرف مظفر آباد جہلم ویلی روڑ کے اوپی کھلانہ نالہ پر ایک زبردست ناقہ اُبھرآیا ہے جسے ہم کمان پل اور امن ستھو بھی کہتے ہیں۔ اِس پُل کے نیچے وہ خونی لکیر ہے جسے ہم ایل او سی LOC یعنی لائن آف کنٹرول کہتے ہیں۔ پُل کے اس طرف پاکستانی فوج کا قبضہ ہے اور پُل کے اِس طرف وادی کے ملانے والی سڑک پر ہندوستانی فوج کا قبضہ ہے۔ اس طرح سے یہ واحد اہم شاہراہ جو قلمرو جموں و کشمیر و گلگت بلتستان و شمالی علاقہ جات کی راجدھانی اور اہم مرکز سرینگر کو راولپنڈی اور بقیہ دُنیا سے ملاتی تھی، بند ہے۔ یہ شاہراہ تواریخ کی کتابوں میں جہلم ویلی کارٹ روڑ کے نام سے مشہور ہے جو ۱۸۸۹ء میں مہاراجہ پرتاب سنگھ نے تعمیر کروائی تھی۔ اس سے پہلے تقریباً ۹۰ سال تک اس سڑک پر تانگے (یکے) اور گھوڑے کی سواری میسّر تھی۔ یہ سڑک کھاوڑ یعنی وتستا (جہلم) کے بائیں کنارے سرینگر سے کوہالہ تک جاتی ہے۔ کوہالہ اس قلمرو کا آخری پڑاو ہے۔ کوہالہ میں دریائے جہلم پر ایک پُل تعمیر کیا گیا جسے عبور کرتے ہی جب ہم دوسُرے پلر یا ٹھٹھے پر پہنچتے ہیں تو وہاں سے صوبہ سرحد کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ آگے جہلم کے دائیں کنارے پر سات کلومیٹر سفر کرنے کے بعد پنجاب (موجودہ پاکستان سے ہی) شروع ہو جاتا ہے۔ اِسی راستے پر مری (کوہ مری) مارگلہ۔ ایوبیہ فیض آباد، اسلام آباد (پاکستان کی موجودہ راجدھانی) اور راولپنڈی کا شہر آجاتا ہے۔

فیض آباد جنکشن سے دائیں مُڑیں تو راولپنڈی اور بائیں مڑیں تو اسلام آباد راولپنڈی اور اسلام آباد اب Twin Cities کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہیں درمیان سے دو حصّوں میں تقسیم کرنے والا صرف فیض آباد بس اڈہ ہے۔ جہاں ایک بڑے سائن بورڈ پر لکھا ہے:

سرینگر ۲۳۰ کلومیٹر

وِتستا ندی (جہلم) کا دائیاں کنارہ ہو یا بائیاں 90 فی صد سیّاح۔ انہی دو راستوں سے وادیٔ کشمیر میں داخل ہوئے ہیں جس کے لئے سینکڑوں دستاویزی تذکرہ گواہ ہیں۔ یہ راستہ وادی میں داخل ہونے کے لئے آسان ترین راستہ تھا۔ باوجود اس کے پنجاب کے میدانی علاقوں سے جب سیاح کشمیر کی سیاحت کا مقصد کرتے تھے تو اُنہیں کاغان ہزارہ اور سرحد کے قبائل کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا جو اُنہیں لوٹ لیتے تھے اور اکثر ہلاک ہو کر مرتے تھے۔ ہزارہ سے آگے کے علاقے میں بھی ناگ قبائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہ ناگ اور پشاچ قبائل دراصل دستی سر یا کشب مر کے پشتنی باشندے تھے۔ پہاڑوں میں ناگ اور میدانی علاقے (وادی) میں پشاچ رہتے تھے۔ ناگ سانپ کو بھی کہتے ہیں اور کشمیری زبان میں چشمے کو بھی۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ ناگ یا ناگا قبیلے کے لوگ اِن پہاڑوں میں سانپوں کی طرح رہتے تھے۔ جیسے سانپ دراوڑ اور بلوں میں رہتے ہیں۔ اِسی طرح یہ ناگ دراوڑوں، بلوں، سوراخوں، گپھاؤں اور غاروں میں رہتے تھے اور اِن کے پاس نہ کوئی گھر ہوتا تھا نہ مکان۔ اِن میں سے بعض ننگے بھی رہتے تھے۔ اسی لئے کئی بیرونی ممالک کے سیاحوں نے اُنہیں ''ناگا'' بھی لکھا ہے۔ یہ غیر مہذب ہونے کی وجہ سے راہ گیروں، مسافروں اور سیاحوں کو لوٹ لیتے تھے اور لوٹے ہوئے مال پر گذارہ کرتے تھے۔ شدید سردی سے اکثر ناگا مر جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے پنجاب کے میدانی علاقوں کی طرف سفر کرنا شروع کیا یا پھر بیرونی حملہ آوروں نے انہیں قید کر کے اور غلام بنا کر اپنے ہمراہ لے لیا جس سے کہ وہ تھوڑی بہت انسانیت اور تہذیب سے واقف ہوئے اور پھر بیرونی سیاحوں کے گائیڈوں کا کام کرنے لگے۔ مزدوری کرنے لگے۔ بار برداری اور گھوڑے ٹٹو پالنے

لگے۔ پالکیاں ڈولیاں اور اِسی قسم کی چیزیں تیار کر کے سیاحوں کو دشوار گزار پہاڑی دروں اور سنگلاخ چٹانوں کو کندھے پر اٹھا کر اوڑی اور بارہ مولا تک لے جاتے۔ایک دو ٹکے یا پھر چند کلو اناج کے مزدوری کے طور پر پاتے۔کئی سیاحوں نے اپنے تذکروں میں اُن لوگوں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ کیڑے مکوڑوں اور وحشی جانوروں کی جیسی زندگی گزارتے ہیں۔ نہ اُنہیں پہننے کے لئے کپڑے ہوتے تھے نہ کھانے کے لئے اناج، نہ دوائی کا کوئی تصور تھا۔ اب ان پہاڑوں سے آگے وادی کی طرف آتے ہیں تو تقریباً سب قدیم تواریخ بشمول راج ترنگنی مورّخ کلہن راج ترنگنی جون راج، تاریخِ فرشتہ، تاریخ حسن، سفرنامہ فاہیان، ہون سانگ وغیرہ رقمطراز ہیں کہ وادی کے قدیم باشندوں کے (ستی سر ختم ہونے کے بعد) پشاچ کہتے تھے۔موجودہ کشمیری زبان کا قدیم نام بھی پشاچی تھا۔ پشاچی قبائل بھی غیر مہذب، غریب اور بُودل تھے۔ ہر بیرونی سیاح اور حملہ آور کی غلامی بخوشی قبول کر لیتے تھے۔ چنانچہ جب آرین وارِدِ وادی ہوئے تو اُنہوں نے بڑے پیمانے پر پشاچی عورتوں کو اپنی رکھیل بنا لیا یا پھر اُن سے شادیاں کیں اور پھر وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ کشمیری قوم آریہ نسل کی مانی جاتی ہے حالانکہ یہاں آریوں کے بعد بہت سے حملہ آور آئے، جو تُرکی، وسط ایشیاء، افغانستان (جنوبی ہندوستان کے دراوڑ نسل کے لوگ) ایران، چین اور ہندوستان کے رہنے والے تھے۔اُن میں سے اکثر وادی ہی میں بس گئے۔ بودھوں کے بعد ہندو اور پھر مسلمانوں کی آمد سے یہاں کا نہ صرف نسلی تشخص سو فی صد بدل ڈالا بلکہ تہذیبی، مذہبی اور سماجی طور پر بھی اس جنت میں ایک سو فی صد نئی نسل کی بنیاد ڈال دی جو آج تک موجود ہے۔ اس طرح سے ایک مخلوط سماج اس قلمرو کے تشخص کا آئینہ دار بن گیا۔ جس میں آرین، یہودی، تُرکی، چینی، منگول، عربی، ایرانی اور ہندوستان نسلی رنگوں اور خون کا امتزاج آج کی تاریخ تک مترشح ہے۔

ایک اہم بات کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جتنے بھی بیرونی سیاح حملہ آور یا دینی مبلغ کشمیر آئے ہیں اُن میں سے سب نے راستے کے پڑاوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اِس

کی وجہ جو میری سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ اُن کی آمد کے وقت یا تو وہ گاؤں یا قصبے تھے ہی نہیں یا پھر چند جھونپڑوں یا گھروں پر مشتمل تھے جن کا ذکر کرنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا یا پھر وہاں سے گزرتے وقت یا تو وہ پالکی ٹانگے یا بیل گاڑی میں محوِ خواب تھے یا پھر کسی نے اِس لوکلٹی کا نام انہیں نہ لکھوایا۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ جب وہ آئے تو آتے وقت وہ بعض مقامات کا ذکر کرنا بھول گئے۔ لیکن جب وہ اُسی راستے سے واپس وطن لوٹے تو انہوں نے اُن مقامات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور اپنے نقشوں میں اور گائیڈ بکس میں درج کیا۔ خود کشمیر کے مختلف سیاحوں نے مختلف نام لکھے ہیں۔ روسی سیاح نِکولاس ٹودیچ فاہیان اور ہیون سانگ نے شی، می، لو لکھا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں یہ وہی جانیں۔ کتھا سرت ساگر مصنف سوم دت نے کہیں کاشی مرا اور کہیں کشپ مرا اور کہیں کاشمر لکھا ہے۔ فاہیان اور ہیون سانگ کے بعد او کونگ وارِدِ کشمیر ہوا۔ اس کے ۲۰۵ سال کے بعد کتاب الہند کے مصنف عربی النسل سیاح ابو ریحان البیرونی کشمیر میں تشریف لائے۔ اُنہوں نے بھی جہلم ویلی روڑ (سرینگر راولپنڈی راستے کا ذِکر کیا ہے) اگر چہ وہ محمود غزنوی کے ہمراہ درہ توسہ میدان کے راستے سے وارِدِ کشمیر ہوئے لیکن اُن کی واپسی اُوڑی کے راستے ہوئی ہیں۔ خواجہ اعظم دیدہ مری نے اپنی تاریخ واقعات کشمیر میں لکھا ہے کہ ۱۱۲۴ء بمطابق ۱۷۰۸ء عنایت اللہ خاں صوبہ دار کشمیر نے پکھلی پر بہ راستہ اوڑی حملہ کر کے اسے کشمیر میں ملالیا تھا جو اس وقت سلطان مظفر خاں کی جاگیر تھی۔ منشی محمد الدین فوق جو کئی مرتبہ اسی راستے سے آئے بھی اور گئے بھی۔ اُن کی دو مشہور کتابوں "سفر نامہ کشمیر" مطبوعہ ۱۹۰۷ء اور Travelguide to Kashmir (رہنمائے کشمیر) ۱۹۲۳ء میں صرف اسی راستے کا ذکر ہے۔ بلکہ فوق نے کشمیر اور بیرون دُنیا کے مابین تجارتی اور سفارتی تعلقات کے لئے بھی صرف اِسی ایک راستے کی وکالت اور دلالت کی ہے۔ تاریخِ حسن میں دو اہم جنگوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ذوالقدر خاں اور سلطان ہیبت خاں نے ۱۷۳۶ء میں اِسی راستے سے کشمیر پر حملہ کیا اور فقیر اللہ کنٹھ اور محمود خان نے ۱۷۶۷ء میں اسی راستے سے حملہ کر کے سرینگر پر قبضہ کر لیا۔

ہیون سانگ کے بارے بھی کچھ دستاویزی تذکروں میں لکھا ہے کہ وہ توسہ میدان یا بہ راستہ پونچھ کشمیر میں داخل ہوا ہے لیکن ہیون سانگ کے سفرنامے میں بونیار کے پانڈو مندر کا ذکر یہ ثابت کرتا ہے کہ یا تو وہ اسی راستے سے آیا یا واپسی کا سفر اِسی رستے سے کیا۔ محمود غزنوی کے بارے میں تاریخِ فرشتہ اور کچھ مسلمان تذکرہ نگاروں اور سیاحوں نے لکھا ہے کہ وہ مُلک کاشمر میں ہزارہ کی طرف سے آئے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر وہ بھی جہلم ویلی کے راستوں سے گزر کر وادی میں آئے ہیں۔ اگرچہ عبدالرحمن بلبل شاہ تبت کے راستے واردِ کشمیر ہوئے لیکن حضرت امیرِ کبیر میر سید علی ہمدانی اور اُن کے ہمراہ تشریف لانے والے سات سو یا گیارہ سو سادات کے کشمیر میں تشریف لانے کے بارے میں موجودہ مغل روڈ اور سرینگر راولپنڈی روڈ دونوں کا ذکر ہے چونکہ وہ ایک سے زیادہ مرتبہ کشمیر تشریف لائے اس لئے اغلب ہے کہ کم سے کم ایک مرتبہ وہ یا تو جہلم ویلی راستے آئے یا تشریف لے گئے۔ اسلام کی کشمیر میں آمد کے بعد بے شمار علمائے دین۔ بزرگاں، صوفیائے عظام، اولیائے کرام، مبلغین، زاہدین و سالکین، صالحین لگاتار عرب، ایران، ترکی، وسط ایشیاء اور مشرق وسطی کے ممالک سے دین اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں یا کِسی اور وجہ سے ہجرت کر کے وادیٔ کشمیر میں آئے اور اَن گنت ایسے اسماء گرامی ہیں جو وادیٔ کشمیر سے بہ سلسلہ تجارت و سفرو حج بیرونی ممالک میں چلے گئے۔ اِن میں حضرت بابا داؤد خاکی، شیخ یعقوب صرفیؒ، حضرت مرزا اکمل الدین بدخشی، میر شمس الدین عراقی، میر میرک اندرابی وغیر قابلِ ذکر ہیں۔ شاہمیری اور چک دورِ حکومت میں بھی کئی اولیاء کرام اور بزرگانِ دین اِسی راستے سے تشریف لائے اور یہاں بے حد خطرناک اور نامساعد حالات کو دیکھ کر اور حاکم وقت کی طرف سے پذیرائی نہ ملنے کے سبب واپس لوٹ گئے۔ مغلوں، پٹھانوں اور سکھوں کے دَورِ اقتدار میں بھی حملہ آور اسی راستے سے آئے۔ البتہ مغل بادشاہوں نے زیادہ تر پونچھ مغل روڈ کو ہی استعمال کیا۔ لیکن ملکہ نُور جہاں، جہانگیر اور اورنگ زیب نے سرینگر سے لاہور کا سفر ایک یا دو مرتبہ بہ راستہ بارہمولہ اوراوڑی کیا ہے۔

تزکِ جہانگیری صفحہ نمبر ۳۰۳ سے ایک اقتباس:

کشمیر اور بیرونی دُنیا کے درمیان عظیم بلند و بالا پہاڑوں کی جو فصیل کھڑی ہے قدرت نے وادی کے شمال مغرب میں اس دیوار میں ایک کھڑکی کُھلی چھوڑ دی ہے اور اس کھڑکی سے کشمیری اور غیر کشمیری کارواں در کارواں منزلیں اور مسافتیں طے کرتے رہتے ہیں۔ اس کھڑکی سے جو مشہور تجارتی راستہ کھلا ہے، اس نے کشمیر کو نہ صرف غیر منقسم ہندوستان سے بلکہ پارس اور ترکستان سے بھی ملادیا ہے۔ یہ کشمیر کا سب سے اہم تاریخی تجارتی راستہ رہا ہے۔ کیونکہ آمد و رفت اور نقل و حرکت کیلئے یہ راستہ سب سے بہتر تھا۔ اس پر باقی راستوں کے مقابلے میں برف بھی کم گرتی ہے۔ اس لئے یہ سال بھر تجارتی سرگرمیوں کے لئے کُھلا رہا ہے۔[1] تجارتی لحاظ سے اس کی اہمیت کو زمانہ قدیم سے اُن سب لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔ جنہوں نے اس راستے سے سفر کیا ہے بالخصوص ہیون سانگ، ابوالفضل، جہانگیر عبدالحمید لاہوری اور اُن لوگوں نے جو ایران اور وسط ایشیا سے یہاں آئے۔ اسی راستے کی بدولت نہ صرف یہ کہ کشمیر کی تجارت ایران اور ترکستان سے بڑھی جو وہ تمام جید علماء اور صوفی جو ایران اور مغربی ترکستان سے کشمیر میں آئے، اسی راستے سے آئے۔ اس طرح سے اِس کی تجارتی، تہذیبی اور ثقافتی اہمیت بھی مسلمہ ہے۔ گویا وادی کے شمال مغرب میں کُھلی ہوئی اس کھڑکی سے وہ تازہ ہوائیں بھی یہاں آئیں جنہوں نے اُن پھولوں کو بھی نکھارا جو یہاں کے ذہن میں کھل رہے تھے۔ تاریخی کتب میں اس راستے کی کئی نام رہے ہیں۔ سنسکرت جاننے والے اِسے وتستا یا ورمولہ کہتے ہیں اور کشمیری و فارسی جاننے والے اِسے بارہ مولا کہتے ہیں۔ مغل مورخوں نے اِسے پاکھلی کہا ہے اور آج اسے جہلم ویلی روڈ کہا جاتا ہے۔

پٹھان حملہ آور مغل روڈ سے ہی واردِ کشمیر ہوئے لیکن اُن کا وطن آنا جانا بذریعہ بارہمولا اور اوڑی ہی رہا۔

سِکھ، پنجاب سے بذریعہ مظفر آباد کشمیر آئے، چنانچہ مظفر آباد سے سرینگر تک بہت سے دیہات ایسے ہیں جہاں سکھوں کی اچھی خاصی آبادی آج تک موجود ہے۔

[1] منصور احمد منصور ''کشمیر کے تجارتی راستے مطبوعہ شیرازہ جموں و کشمیر لداخ نمبر، جلد ۵''۔

مظفر آباد کے بعد بارہ مولہ قصبہ میں سکھ سب سے زیادہ تعداد میں رہتے تھے۔ مظفر آباد، گڑھی دوپٹہ، چکوٹھی اور اوڑی کی پہچان سِکھوں سے ہوتی تھی۔ جو ۱۹۴۷ء کے قبائیل حملے تک اِن علاقوں میں سکونت پذیر رہے اور قبائیلی حملہ آوروں نے اُنہیں بڑی تعداد میں ہلاک کیا جس سے وہ ترکِ وطن کر گئے۔

ڈوگروں نے کشمیر پر حملہ نہیں کیا بلکہ گلاب سنگھ نامی خالصہ حکومت کے افسر نے ۷۵ لاکھ روپے ضرب شاہی کے عوض انگریزوں سے کشمیر کو خرید لیا۔ اُس وقت کشمیر کے حیثیت صرف ایک جاگیر کے رہ گئی تھی۔ پٹھانوں اور سکھوں کی نسبت ڈوگرہ شاہی سے لوگوں کو قدرے راحت نصیب ہوئی۔ ڈوگرہ سرکار کے عہد میں اس مملکت کو تھوڑی سی وسعت ملی۔ لداخ اور تبت کو از سرنو اس قلمرو میں شامل کر لیا گیا۔ سلطنت انگلیشہ کے دوران بلتستان، گلگت، ہنزہ، اسکردو، یاسین چلاس، کُفرستان چترال، دردستان وغیرہ میں بے چینی اور بغاوتیں ہوئی تھیں جنہیں سِکھوں اور انگریز سرکار نے کُچل دیا تھا۔ ڈوگروں نے اس بکھیری کو سلطنت کو دوبارہ متحد کیا۔ لیکن ایک عجیب سی بے چینی پھر بھی رعایا پر طاری ہوئی۔ ڈوگرہ حکومت نے کشمیر آنے کے لئے کچھ اور راستے کھول دیئے اور تمام رابطہ سڑکوں اور شاہراہوں پر مسافر خانے اور ڈاک بنگلے تعمیر کئے۔ کشمیر میں داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ تجارت کرنے والوں کو ٹیکس اور مالیہ دینا پڑتا تھا۔ درنگ بل اور مظفر آباد کے نزدیک دُومیل پُل پر دو کسٹم کھول دیئے گئے۔ دچھن پارہ یا دچھنہ میں یہ ذمہ داری وہاں کے مقامی جاگیرداروں، سلطان گھوڑی، سلطان بوئی ہزارہ سلطان گھڑھی دوپٹہ اور سلطان کٹھائی کے سپرد کی گئی۔ کوہالہ دھلائی اور اوڑی میں ڈاک بنگلے تعمیر کئے گئے۔ مہاراجہ نے اپنے رام پور کے مقام پر ایک شاندار ڈاک بنگلہ برلب ریائے جہلم تعمیر کر دیا۔ سرینگر سے بذریعہ مغل روڈ سفر کرنے والوں کے لئے تین راستے مقرر کئے گئے۔ شوپیاں، پیر کی گلی، بغلیار، سورن کوٹ، پونچھ، راولاکوٹ، باغ، ہجیرہ، ارجہ، سدھنوتی، مظفر آباد (۲) سرینگر شوپیاں، بغلیار، راجوری، نوشہرہ، کوٹلی، تتہ پانی، پنجن، ترا ڈکھل، کھڑی شریف، میر پور جہلم، راولپنڈی،

(۴) سرینگر، آری پاتھن، توسہ میدان، لوہرن، کنڈی سلطانپورہ، پونچھ، تھنہ منڈی راجوری، اکھنور، جموں (۴) سرینگر سے پٹن، بارہ مولا ویرون، شیر فتح گڑھ، کچھامہ (کنس ہوم) گانٹہ مولا۔ نوشہرہ بونیار، رام پور، مہورہ، اوڑی، سلی کوٹ، خواجہ بانڈی حاجی پیر، بساں شریف، چھانجل، علی آباد، فارو ڈ کہوٹہ، عباس پور، باغ، پلندری، چناری ہٹھیاں، مظفر آباد، راڈہ، کوہالہ، (۵) سری نگر، اننت ناگ (سلام آباد)، قاضی گنڈ، بانہال، رام سو، رام بن، بٹوت، کد، چینی اودھم پور اور جموں۔

سرینگر سے راولپنڈی جانے کے لئے جو شاہراہ ۱۸۸۹ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ والی قلمرو جموں وکشمیر ولداخ تبت وگلگت وبلتستان وشمالی علاقہ جات نے یورپی انجینئروں اور ٹھیکیداروں سے تعمیر کروائی اور بلاشبہ اس وقت ایک عجوبے سے کم نہ تھی۔ اس شاہراہ کی وجہ سے وادئ کشمیر دُنیا کے نہایت قریب آ گئی اور اِس کا نام دُنیا کے نقشے پُر نمایاں اور جلی حروف میں لکھا جانے لگا۔ سفر آسان اور مختصر ہونے کی بدولت بیرونی ممالک سے علمائے دین، مشنریوں، دانشوروں، فلاسفروں، مفکروں، مصنفین، سماجی شخصیات، سیاسی لوگوں کی آمد میں کئی گُنا زیادہ اضافہ ہو گیا۔ تجارت بھی بڑے پیمانے پر ہونے لگی۔

کشمیر سے اونی اور پشمینہ کے شال، ریشم کا کپڑا، زعفران، نمدے گبھے، تازہ اُمبری سیب، پیپر ماشی، لکڑی پر نقش گُندہ گری، بھوج پتر، (بُرزہ)، راجماش، سوکھی مچھلی، سنگھاڑے، وغیرہ کشمیر سے باہر اور بیرونی ممالک میں برآمد کئے جانے لگے۔ درآمد ہونے والی اشیاء میں کپڑا، تانبے اور پیتل کے برتن، شیشے کی اشیاء، نمک، کھانڈ، گرم مصالحے، لوہے کے اوزار، کتابیں وغیرہ شامل ہیں۔ راقم کے دادا مرحوم راجہ محمد اکبر خان جو اپنے علاقے (بونیار) کے جاگیر دار تھے اکثر ایسے واقعات کا ذکر کرتے رہتے تھے جن میں کچھ باتیں تو ذہن سے اتر گئی لیکن کچھ ابھی تک یاد ہیں مثلاً یہ کہ ایک ہفتہ پہلے سرکاری کارندوں یا پولیس کے ذریعے مقامی جاگیرداروں کو مطلع کیا جاتا تھا کہ فلاں تاریخ کو ہز ہائی نس سپہ سالار سلطنت مہاراجہ صاحب کا آپ کے علاقے سے گُور ہو گا (سرینگر سے راولپنڈی یا راولپنڈی

سے سرینگر) اس لئے پروٹوکول اور سیکورٹی کی ذمہ داری مقامی جاگیردار کو ہوگی۔ اُنہیں چاہئے کہ وہ اپنے علاقے Jurisdiction میں سڑک کے دونوں کناروں پر کارندوں کو کھڑا رکھیں اگر رات کے وقت مہاراجہ کی سواری وہاں سے گزرے تو اُن کارندوں کے ہاتھوں میں مشعلیں یا روشنی کیلئے چوب چراغ[1] کے مُٹھے ہوں اور اگر ڈاک بنگلہ یا مسافر خانہ نزدیک ہو تو راجہ اور اُن کی فوج اور حکام کیلئے کھانے کا بندوبست بھی کیا جائے۔

مقامی جاگیردار کو حُکم مِلتا تھا کہ وہ ایسے کارندوں کو جو رات کو سڑکوں پر سخت سردی میں بھوکے ننگے کھڑے رہیں۔ مجوزہ یا مالیہ معاف کر دیا جائے۔ راویوں کے مطابق سڑک کی دیکھ بھال کے لئے معقول انتظام ہوتا تھا۔ مسافر خانوں اور ڈاک بنگلوں میں بھی معقول رہائشی بندوبست ہوتا تھا، لیکن اِن مسافر خانوں اور ڈاک بنگلوں میں عموماً اعلیٰ حُکام، مہاراجہ کے کارندے، بیرونی ممالک کے سیاح مرد و خواتین قیام کرتے تھے۔ سرینگر سے کوہالہ تک دریا جہلم پر لکڑی کے 22 پُل تھے۔ جن میں سے صرف 9 پلوں کے اوُپر سے ٹانگے۔ چھکڑے یا لاریاں گزرتی تھیں۔ باقی سب صرف فُٹ برج تھے۔ ۱۸۸۰ء میں مہاراجہ نے ایک انگریز انجینئر جنرل ڈی بوربیل کو سرویر جنرل کے عہدے پر تعینات کیا۔ اس کے ذمہ ایک کام پوری قلمرد میں راستوں، دروں، گھاٹیوں اور سڑکوں کا ایک جامع سروے کرنا تھا۔ ڈی بوربیل De-Bourbel نے ۱۸۹۱ء میں سروے مکمل کر لیا اور ایک کتاب رُوٹس اِن جموں اینڈ کشمیر کے نام سے شائع کی جس کے جلد پر یہ تحریر پڑھی جاسکتی ہے۔

Routes in Jammu & Kashmir:

Dedicated by permission to Maj General His Highness the Maharaja Sir Partap Singh GCSI. Inder Mehandar Bahadue Spar-e-Saltanat Maharaja of Jammu & Kashmir

قلمرد جموں و کشمیر میں رُوٹس (راستوں) کے بارے میں اس کتاب میں جو

[1] لتی یا دینی کائیر و یا دیودار کی لکڑی جس میں ایک قسم کا تیل ہوتا ہے، جسے لوگ رات کو روشنی کیلئے جلاتے تھے، اسے انگریزی میں Torchwood کہتے ہیں۔

تفصیل معلومات درج ہیں وہ بے حد اہم اور قابلِ استفادہ ہیں۔

جن ملکی اور غیر ملکی سیاحوں نے کشمیر کا سفر کیا ہے اُن کی فہرست بے حد طویل ہیں لیکن کچھ ایسی اہم شخصیات بھی ہیں۔ جنہوں نے اپنے سفر کشمیر کے حوالے سے Travelogne اور Travelguides سفرنامے وغیرہ شائع کر کے مستقبل تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے کام آسان کر دیا ہے۔ آگے چل کر ہم چند مشہور سیاحوں اور مورخوں کی سفری دستاویزات کے ضروری اور اہم اقتباسات شامل کریں گے۔ یہاں ہم چند مشہور سیاحوں اور مورخین کے نام درج کر رہے ہیں۔

۱۔ فادرژاویر ۱۶۰۱ء

۲۔ فاسٹر ۱۷۸۳ء تا ۱۷۸۶ء کشمیر میں قیام رہا

۳۔ پیروڈاٹس

۴۔ مارکوپولو لداخ کے شمالی حصے گزرا ہے۔

۵۔ ولیم مورکارفٹ

۶۔ نکولاس نوٹووپچ

۷۔ سی ای بیٹس

۸۔ سی بی ہنگل

۹۔ مِس بروز

۱۰۔ مس ماریون ڈوھٹی

۱۱۔ ژاک مونٹ

۱۲۔ جنرل الرڈ

۱۳۔ بیرسٹر گارڈنز ۱۸۳۸ء

۱۴۔ مارگریٹ موریسن

۱۵۔ ای ایف نائٹ

۱۶۔ جنرل ڈی بوریل[1]

۱۷۔ جنرل سپڈن اوڑی کا ڈاک بنگلہ سیڈن نے ہی تعمیر کیا تھا۔

۱۸۔ پیٹرو کینو

۱۹۔ مس فنورنس پار بری ۱۹۰۲ء[2]

۲۰۔ ہنڈرسن

۲۱۔ نادر ژاویر ۱۶۰ء

۲۲۔ فرانکو بزیر بریز

۲۳۔ ٹنڈل بسکو

۲۴۔ ڈی سدر بوبک

۲۵۔ فینسی بٹلر

۲۶۔ آرتھر رینو

۲۷۔ مسز ہاروے

۲۸۔ ہنگٹن ۱۹۰ء 21 مارچ کو وہ بارہ مولہ سے راولپنڈی کی طرف روانہ ہوئے تھے۔

۲۰۔ پنڈت جواہر لعل نہرو ''کشمیر'' یہ مضمون نہرو کے اخبار نیشنل ہیرالڈ میں کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا۔[3]

---

[1] روئس آف جموں اینڈ کشمیر نامی کتاب کے مصنف۔

[2] مصنفہ Emarald Set with Pearls 1902۔

[3] پنڈت نہرو چھ مرتبہ کشمیر آئے اور چھ میں سے تین مرتبہ وہ اوڑی کے راستے سے آئے۔ ایک مرتبہ مہاراجہ ہری سنگھ نے انہیں کوہالہ میں روک لیا اور گرفتار کر کے دھالی کیمپ میں رکھا اور پھر واپس بذریعہ پنجاب دہلی روانہ کیا۔ ایک مرتبہ وہ مولانا آزاد، خان عبدالغفار خان، ڈاکٹر انصاری وغیرہ کے ہمراہ کشمیر آئے۔ (آتش چنار شیخ محمد عبداللہ)

۳۱۔ تھامس مور ۱۸۲۲ء

۳۲۔ جان کولیٹ ۱۸۹۷ء

۳۳۔ میجر جنرل محمد اکبر خان مصنف ریڈرس اِن کشمیر۔ ؁

کوہالہ سے مری مری سے مارگلہ مارگلہ سے راولپنڈی:

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وِتستا کے دائیں کنارے سے زیادہ اُتنے سیاح نہیں آئے جتنے کہ بائیں کنارے حالانکہ دائیاں کنارہ زیادہ محفوظ اور آسان تھا۔ اِس طرف برف بھی نہ ہونے کے برابر گرتی ہے اور جنگل بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ زمین کی سطح ہموار ہے اور بائیں طرف (کھاوڑہ) گھنے جنگلات، ڈھلوان زمین، ندیوں اور نالیوں کی بھرمار اور پلوں کا گویا قحط ہی رہا ہے۔ دچھنہ والے راستے میں ماسوائے ایک دو تاریخی ماخذوں اور عمارتوں کے بغیر کوئی بھی قابل ذکر چیز نہیں۔ ان میں ایک پرن پیلاں کا گوردوارہ چھٹی پادشاہی اور اسی جگہ کچھ کھنڈرات اور شاہدرہ میں کسی بزرگ کا ایک آستان موجود ہے۔ اِدھر اسی طرف پیرنیاں کے مقام پر بابا غفور صاحب کا مقبرہ مرجع خلائق ہے اور کھاوڑہ سارے کا سارا تاریخی مقامات سے معمور ہے۔ اِن میں اوشکرہ کانسپورہ جہاں بودھ دھرم کے اہم ادارے رہے ہیں، شیری فتح گڑھ کے ساتھ ویرون ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں سے تھوڑے فاصلے داندھکن کے پاس پہاڑ پھٹنے کے نتیجے میں ستی سر جھیل خشک ہوگئی اور موجودہ وادیٔ کشمیر وجود میں آگئی۔ آگے شیری گاؤں ہے جسکے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شری بھٹ کا بسایا ہوا گاؤں ہے اس کے مشرق میں فتح گڑھ کے تاریخی منادر اور کھنڈرات چند سال پہلے تک موجود تھے شیری میں بھی کھدائی کے بعد بہت سی نایاب مورتیاں، مجسمے اور آلات برآمد ہوئے ہیں۔ اِس کے آگے کچھامہ کا تاریخی گاؤں ہے جس کا اصلی نام کنس ہوم تھا یہاں بھی کسی اہم تاریخی عمارت کے کھنڈرات ملے ہیں۔ گلدستہ کشمیر کے مصنف پنڈت ہرگوپال خستہ لکھتے ہیں کہ کھنس ہوم میں راجہ کنشک نے ایک یونیورسٹی اور بودھ عبادت گاہ تعمیر کی تھی۔ اِسی راستے سے چلتے ہوئے آگے بونیار کا تاریخی مندر آتا ہے جو آج

تک 80فی صد اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ یہ مندر پٹن پری ہاسپورہ اور مارتنڈ اور اونتی پورہ کے مندروں کے ڈیزائین کا ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر بلیو Dr Blue کے سفر نامے کشمیر اور کاشغر میں سے ایک اقتباسِ پیش خدمت ہے۔ لیکن اس سے پہلے مہورہ کے داتا مندر کا ذکر کرنا ضروری ہے جو بونیار اور مہورہ کے درمیان جہلم کے کنارے ایک پہاڑی کے دامن میں آج تک موجود ہے۔ گلدستہ کشمیر کے مصنف نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن، مُکتی نام کی ایک چھوٹی سی کتاب جسکا نام پنڈت اشوک ہے میں اِس کا ذکر ہے۔ میں حیران ہوں کہ سفر ناموں اور سیاحتی گائیڈ بکس وغیرہ میں اس مندر کا نام کیوں نہیں؟

اب پیش ہے ڈاکٹر بلیو کے سفر نامہ کشمیر اور کاشغر میں سے چند اقتباسات [1]

☆ ''ہمارے سفر سے پہلے بارشیں شروع ہوگئیں تھیں اور ہمارے کارواں کو جو ایک سو پچاس خچروں اور گھوڑوں پر مشتمل تھا اور جس کے ساتھ تیس چالیس قلی تھے، مشکلات کا سامنا ہوا۔ آخر ہم لوگ ۲۱ جولائی ۱۸۷۳ء کو کوہالہ پہنچے۔ موسم خوش گوار تھا اور ہمیں ڈاک بنگلے میں جگہ ملی۔ دو دن کے بعد چکوٹھی پہنچے اور وہاں ایک دن قیام کیا۔''

☆ ''ہم نے تھنڈالی کے مقام پر عجیب نظارہ دیکھا۔ یہاں دریا کا بہاؤ بہت تیز تھا اور لوگ اس خطرناک بہاؤ میں دو کھالوں کی بنی ہوئی کشتی کے ذریعے پانی پر تیرتے ہیں۔ یہاں کی زباں میں اِسے شی ناز Shinaz کہتے ہیں۔''

☆ ''ایسا ہی دوسرا نظارہ ہم ہٹھیاں میں دیکھا۔ جہاں کے پُل کو جھولا پُل کہتے ہیں دریا جہلم پر یہ پل قریباً اسی گز لمبا ہے۔''

☆ ''بُونی یار (Buniar) کے معنی بن وہار کے ہیں۔ یعنی جنگل میں وہار ہمیں

---

[1] . ڈاکٹر بلیو کے سفر نامے میں کچھ تیکنیکی خرابیاں یا کیمیاں موجود ہیں۔ مثلاً کوہالہ سے چلنے کے بعد اُنہوں نے چکوٹھی میں قیام کرنے کا ذکر کیا ہے اور اس کے آگے تھنڈالی اور ہٹھیاں کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ تھنڈال نام کا کوئی گاڑی اس روڈ پر موجود نہیں البتہ کڑلی اور گڑھی اور چناری نام کے پڑاؤ ہیں اور ہٹیاں چکوٹھی سے بہت پیچھے چناری اور گڑھی کے درمیان واقع ہے اور یہ گاؤں آج ضلع ہیڈ کوارٹر ہے۔

معلوم پڑتا ہے کہ اس جگہ بودھوں کا وہار Vihara تھا۔ وسط کی پتھریلی بنیاد کے اردگرد جو قریباً 53 چلہ خانے ہیں (Cells) وہ بھکشوؤں کے مراقبے کے لئے بنائے گئے تھے۔ بدھ مت کے عہد میں یہ وہار کافی اہم رہا ہے۔[1]

ڈاکٹر بلیو، مختلف زبانوں کا ماہر تھا اس لئے وہ وجہ تسمیہ کی کھوج اور ہر لفظ کے پیچھے پنہاں معنی کی تلاش میں رہتا تھا۔ اوڑی کے بارے میں اُس کا خیال ہے اس نام کی بنیاد کشمیر کے خاص درخت ''دیر'' یعنی ہے۔ یعنی وجہ جگہ جہاں دیر کے درخت ہوں یاد رہے کہ کشمیری میں اُوڑی کو ''ؤ ور'' کہتے ہیں نہ کہ ویر اوڑی اور بارہ مولا کی وجہ تسمیہ کے بارے میں اکثر مورخین اور سیاح خاموش ہیں۔ بارہ مولہ جس کا اصلی نام وَرہ مُول ہے اور مُولا یا مُل کشمیر وادی کے تقریباً چھبیس دیہات کے نام کے آگے بطور لاحقہ استعمال کیا جاتا ہے جیسے کہ دُرگہ مُل۔ گانٹہ مُل، ہَل مُل وغیرہ۔ بہرکیف یہ ہمارا موضوع نہیں اس لئے ہم پھر روٹس یا راستوں کی طرف آتے ہیں۔ انجینئر اور جنرل ڈی بوریل نے اپنی کتاب روٹس آف کشمیر میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اُن کی اس کتاب سے پہلے بھی مختلف روٹس کے بارے مطبوعات اُنہیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جن سے اُس نے استفادہ کیا ہے اُن کی کتاب کے Preface میں سے چند اقتباسات:

☆ "The notes taken during my own journey in Jammu & Kashmir have enabled me to revise the length of the marches on some of the routes previously published."

☆ The routes in this book are mainly copied from the books of various authors and travellers, who have published a description and map of their journeys in or through Jammu & Kashmir. '

Some are taken from Lieutenant-Colnel Montgomeries RE Route Book and map."

1۔ بونی یار یا بونیار کی وجہ تسمیہ غلط ہے۔ کیونکہ ایسے دیہات اور قصبہ جات کی تعداد وادی میں تقریباً 30 ہے جسکے آگے ''یار'' کا لاحقہ لگتا ہے جیسے کھادن یار، بم یار، خان یار، ہورس یار، رے یار، نائید یار، بان یار وغیرہ اور بونیار میں صرف مشرق کی طرف والی پہاڑی پر جنگل ہے۔

"Routes of Jammu and Kashmir" by De-Bourbel. (1)

The Pir Punjal pass is open from May to about the middle of November, the two Durhal passes are open only from July to end of October. The route over the first Durhal pass is said to be the easiest to travel when the rivers are low and fordable.

From Baramgalla 68 miles 4 furlongs, a good road goes west down the Suran valley by Suran 80 miles, to Poonch 94 miles. There are 7 bridges over the Suran river, and the passage of traffic depends upon these being maintained in good order.

From Rajaori 63 miles, there is a cross road through the hills to Kotli, it ascends the Charkoh valley to the Ajeengurh pass 103 miles, and descends [illegible] Seheta 119 miles, and to Kotli 135 miles.

From [illegible] miles, a road goes direct S.-W. under the Pabbi hills to the Kharian Railway Station 163 miles, and is used in the rainy season to avoid any crossing of the Bhimber river.

From [illegible] 164 miles 4 furlongs, a road goes westwards crossing the Bhimber river at 171 miles to the Lala Musa Railway Station 174 miles, and [illegible] by Jalalpur 175 miles, to Sialkot 199 miles, crossing the Chenab river by the Muhutab ferry at 185 miles.

[illegible] SRINAGAR to POONCH — See Route—

Route		Via		Height		Distance
XXX	by	Haji Pir	Pass	8,500	feet,	98 miles.
XXXI	„	Pajja	„	10,000	„	92 „
XXXIa	„	Gajan	„	9,135	„	102 „
XXXIII	„	Firozepur	„	12,000	„	74 „
XXXIIIa	„	Zamir	„	13,470	„	73 „
XXXIV	„	Tosha Maidan	„	12,500	„	68 „
XXXIVa	„	Nurpur or	„	13,610	„	75 „
		Sangsofed	„			83 „
XXXVa	„	Chhoti gulli	„	14,090	„	85 „

In May and June the Haji Pir or Gajan route should be selected: in July to October inclusive, the Firozepur, Tosha Maidan and Nurpur routes are shortest, while the Chhoti gulli is the easiest of all, and the Pir Punjal route is the longest. There is lovely scenery with fine views on every route, the Gajan, Tosha Maidan and Pir Punjal being perhaps superior in this respect. From November to April, all these routes are, as a rule, closed by snow, while in April, when the snow melts, they are all liable to *avalanches* of snow, especially on the Haji Pir, Pajja, Firozepur and Zamir passes.

XL SRINAGAR to RAMPUR by GULMARG—

	Srinagar ...	...	...	0	...	Good road to Purana Chowni, thence narrow raised bank through swamps, very muddy and slippery after rain to Magam.	.....	Amiran Kadal	5235	S. G. F. W. T. abundant.	Capital of Kashmir State, large city, &c.
	P. O., T. O., C., E.—	...	...	1	4		......	Dudh Gunga bridge.			
	Purana Chowni ...	...	...	4	...						-
	Narbal ...	...	...	10	...		.. ...	Suknag bridge.			
1	**Magam** ...	16	...	16	...		......	......	......	S. G. F. T. procurable in season, W. plentiful.	Small village.
	B., E. small—										

Routs of Jammu & Kashmir, by De-Bourbel(P-01)

URI

Number of Marches.	Names of Stages.	Distance in miles and furlongs. Inter-mediate. m.	f.	Total. m.	f.	Nature of Route.	Main Valleys and Mountain Passes.	River Crossings and Lakes.	Altitude above Sea Level in feet.	Supplies and Transport at Stages.	Remarks.
XL	*ROUTE*—(*contd.*) ...	16	...	16	...						
2	**Gulmarg** ... *P. O., T. O., hotel, E.*	14	...	30	...	Good road hence to Gulmarg, though	......	......	8500	S. and T. moderate in season, W. distant, G. F. ample.	Sanitarium and bazar in season.
		...	..	35	...	stony in places.	......	Ningul ford			
3	**Linian marg** ...	10	...	40	...	Fair road through alternate pine forest and marg down to Nowshera, where it joins the Jhelum cart-road.	......	Kechama ford	9400	S. and T. nil, G. F. W. ample.	Shepherd's huts.
	E.— ...	...	...	49	...		......	......			
	Nowshera ...	...	...	52	4						
	Bhuniar ...	...	...	53	...		.....	Harpetkai bridge.	5000	... ..	Ancient Buddhist temple.
4	**Rampur** ... *P.O., T.O., . B., E.*	14	...	54	...		......	......	4900	S. G. F. W. moderate a few coolies.	All supplied by Nawab of Bhuniar.

There is another track from Srinagar to Gulmarg across the Hokarsar swamps to Syboog 8 miles, Hardu 16 miles, where the Suknag river is crossed by a ford, Khundahama 18 miles, Firozepur 26 miles, Gulmarg 30 miles. At Firozepur several streams of the Bahun river have to be crossed. There is no advantage in this route, and during the rainy season the swamps and Bahun streams are often unfordable.

XLI. [illegible] PATAN—

	[illegible] P. O., T. O., [illegible] ...	...	...	0	...	Carriage road under construction to Patan.	......	Amiran Kadal	5235	S. G. F. W. T. abundant.	Capital of Kashmir State, large city, &c.
		...	...	2	...		......	Dudh Gunga bridge.			

'Routes of Jammu & Kashmir' by De-Bourbel

3

	[illegible]		13		......	......	Sindnag bridge.			
	Hanjipur		16		......	......	Hanjipur bridge.			
	[illegible]	19	19		Good mule track over Karewah land and through pine forest to Gulmarg.	......	......	... ...	S. G. F. T. available, W. from spring.	Village and ancient ruins.
	[illegible]		26	4						
	Baba Marishi B., C., E.—		34			......	... ...	......	S. G. F. W. procurable, T. nil.	Mahomedan shrine.
2	**Gulmarg** P.O., T.O., hotel, E.—	17	36		... ..	......	...	8500	S. T. moderate in season, W. distant, G. F. plentiful.	Sanitarium and bazar in season.

This though longer is likely to become the favourite land route as soon as the carriage road between Srinagar and Patan to Baramulla is finished. Visitors will drive in their carriage or tongas to Patan in 3 hours and either rest there, when a bungalow is built for the accommodation of travellers, or ride over at once to Gulmarg, doing the whole journey in one day. Eventually a carriage road from Patan to Gulmarg is quite feasible with a ruling gradient of 1 in 20.

XLb SRINAGAR to GULMARG by POLHALLAN—

	Srinagar P. O., T. O., C., E.—		0	By boat down the Jhelum river to Shadipur, thence by Noroo canal and western branch to Polhallan. Good mule track over Karewa land and through pine forest to Gulmarg.	......	......	5235	S. G. F. W. T. abundant.	Capital of Kashmir State, large city, &c.
	Shadipur		15						
1	**Polhallan** E.—	25	25		......	...	......	S. G. F. W. T. procurable.	Large village.
	Chandesir		31						
	Baba Marishi B., C., E.—		40		......	.. ...	......	S. G. F. W. procurable, T. nil.	Mahomedan shrine.

Routs of Jammu & Kashmir, by De-Bourbel(P-03)

4

Number of Marches.	Names of Stages.	Distance in miles and furlongs. Intermediate. m.	f.	Total. m	f.	Nature of Route	Main Valleys and Mountain Passes.	River Crossings and Lakes	Altitude above Sea Level in feet.	Supplies and Transport at Stages.	Remarks.
XLb	*ROUTE—contd.* ..	...	...	40	...						
2	**Gulmarg** ... *P. O., T. O., hotel, E.—*	17	...	42	...	......	......	.....	8500	S. T. moderate in season, W. distant, G. F. plentiful.	Sanitarium and bazar in season.

This route is often taken in May and June when there is water enough in the Noru canal, and its western branch through the Rurangarn swamp to Polhallan. In July and August the musquitoes and insects are a terrible pest, and musquitoe nets are indispensable. From Polhallan the march to Gulmarg is done in one day, being reckoned as 1½ stages.

XLc SRINAGAR to GULMARG by SOPUR—

Number of Marches.	Names of Stages.	Intermediate m.	f.	Total m	f.	Nature of Route	Main Valleys and Mountain Passes	River Crossings and Lakes	Altitude	Supplies and Transport	Remarks
	Srinagar ... *P. O., T. O., C., E.—*	...	...	0	...	By boat down Jhelum river and across Woolar Lake to Sopoor.	Down Jhelum river.	......	5235	S. G. F. W. T. abundant.	Capital of Kashmir State, large city, &c.
	Shadipur ...	...	...	15	...						
[illegible]	[illegible]	[illegible]	...	27	...	......	... ...	Across Woolar Lake.	......	......	Large village of boatmen at mouth of Woolar Lake.
[illegible]	[illegible]	18	...	45	...	Good mule track to Gulmarg.	Up Ningul valley.	.. ...	5185	S. G. F. W. T. plentiful.	Town, bazar and head-quarters of Kamraj zillah.
	Minagam ...	...	...	57	...						

5

3	**Kontra** E.—	15	60	......	Up Nambalnar valley and spur.	......	......	S. G. F. W. T. procurable.	
	Baba Marishi B., C., E.—	...	65	......					
4	**Gulmarg** P. O., T. O., hotel E.—	7	67	......	...	.....	8500	S. T. moderate in season, G. F. plentiful, W. distant.	Sanitarium and bazar in season.

There is another road to Gulmarg by Baramulla, the whole distance from Srinagar to Baramulla being by water 60 miles round by Woolar Lake, or 50 miles by the Noru canal between Shadipur and Sopur, or by carriage road *vid* Patan 35 miles. From Baramulla there is a good road ascending a spur on to the table land and along this watershed to Kontra 11 miles, where it crosses the Ningul [illegible] the Sopur road onwards by Baba Marishi to Gulmarg 7 miles. Total 18 miles.

XLI SRINAGAR to JHELUM by JHELUM VALLEY—

	Srinagar P. O., T. O., C., E.—	...	0	Carriage road bridged and metalled under construction to Baramulla.	Down Jhelum valley left bank to Kohala.	Amiran Kadal Dudh Ganga bridge Saknag bridge	5235	S. G. F. W. and T. abundant.	Capital of Kashmir State, military cantonment and fort, large city and bazar, &c.
	Harprat	...	13						
1	**Patan** E.—	19	19	......	......	......	5200	S. G. F. T. available, W. from springs.	Village and ancient ruins, road turns off to Gulmarg.
	Bulgaon	...	27	......	... ...	Ningul bridge			
2	**Baramulla** P. O., T. O., D. B., C., E.	16	35	Carriage road through to Kohala, bridged and metalled.	...	......	5175	S. G. F. W. plentiful, T. after notice	Town, bazar and tehsil.
	Sher	...	39		... ...	Kechama bridge.			
	Bhunniar	...	49 4	...	......	Harpetkai bridge.	5000	......	Ancient Bhuddist temples.

Routs of Jammu & Kashmir, by De-Bourbel(P-05)

Continued Srinagar to Muzaffarabad & Rawalpindi

Number of Marches	Names of Stages.	Distance in miles and furlongs. Intermediate. m.	f.	Total. m.	f.	Nature of Route.	Main Valleys and Mountain Passes.	River crossings and Lakes.	Altitude above Sea Level in feet.	Supplies and Transport at Stages.	Remarks.
XLI	*ROUTE—contd.* ...	...	...	49	4						
3	**Rampur** ... *P.O., T.O., D.B., E.—*	15	5	50	5	This hill road recently constructed passes through metamorphic rocks between Baramulla and Uri and the Murree rock formation, hence to Kohala.	......	......	4900	S. G. F. W. moderate, few coolies.	Beautiful camping ground on terrace lined with deodars.
				62	...		.. ...	Namila bridge			
4	**Uri** ... *P. O., T. O., D. B., E. confined—*	13	3	64	...		......	—...	4390	S. G. F. procurable, W. scarce, few coolies.	Village on fine plateau well cultivated.
				65	.		......	Islamabad ,,	......	......	Fort and tehsil.
				76	...		......	Opi ,,			
5	**Chakoti** ... *D. B., E. very small—*	13	4	77	4	After heavy rain landslips are liable to occur owing to the friable nature of the shaly rocks.	Down Jhelum valley on left bank.	......	3700	S. G. F. W. moderate, T. available.	Small village on cultivated plain.
	Chenar stage ...	..	...	82	2						
	Neli ..	...	...	86	2						
6	**Hatian** ...	10	6	88	2	......	......	Hatian bridge	3000	S. G. F. T. moderate, W. plentiful.	Police post, old D. B. in ruins.
	[illegible]	..	..	93	6						
7	Garhi [illegible] ..	10	4	98	6	......	......	......	2700	S. G. F. W. and T. available.	Open cultivated plain, large village on opposite bank.

Routs of Jammu & Kashmir, by De-Bourbel(P-06)

Continued Srinagar to Kohala 7

8	**Dumel** ... P. O., T. O., D. B.,	13	4	115	2	The same Murree rock formation continues down the Jhelum valley to Owen ferry where it gradually merges into the Sewalik or tertiary formation.	......	......	2225	S. G. F. W. plentiful. T. available.	Bazar, junction of Jhelum and Kishenganga rivers.
	[illegible] ...	...	...	117	6						
9	Dulai [illegible]	9	2	121	4		......	......	2105	S. G. F. W. procurable, few coolies after notice	Hamlet.
	[illegible]			125	..		......	Agar bridge	2029		
	[illegible] ...	...	...	122	...		......	......	2010	......,	Bungalow reserved for H. H. Maharaja.
10	**Kohala** ... *P. O., T. O., D. B., E. very small—*	12	...	133	4	From Kohala ascend cart-road 7 m. 3,108f., and descend footpath sharply to Kopadar, thence keep along old road made by Captain Hall, Dy. Commr. of Pindi, along right bank down to Soha.	Down Jhelum valley right bank	Jhelum bridge	1916	Ditto	Small bazar, customs post.
								......	1868	... ..	Jhelum river.
	...	...	...	139	4			...	3108		
11	**Kopadar ferry** ...	10	4	141	...		......	......	1815	S. from Jhanjhaur, G. F. W. plentiful, T. nil.	Used by men carrying timber to Murree.
12	**Malot or Dhara ferry** ...	10	...	154	...		......	......	1677	S. from Malot, G. F. W. plentiful, few coolies.	Crossing of road from Poonch to Murree.
13	**Rampatan** ...	10	...	164	...	This old road much neglected and in bad order, has become very difficult for laden animals.	......	......	1568	S. precarious, G. F. W. plentiful, T. nil.	Ditto.
	Makroch ...	..	...	167	...		......	......	2205		
14	**Luchmun Bhatea**	7	...	171	...		......	......	1460	S. from Baroi, G. F. W. plentiful, T. nil	Crossing of Poonch and Rawal Pindi road.

	Kutiali ferry	... ...	244	...	......	......	......	......	Crossing of road from Mirpur to Jhelum.
	Sukchainpur	... ...	247	...	......	......	780	......	Forest depôt on left bank in Kashmir.
21	**Jhelum** P.O., T.O., D B., C., E.	13 ...	254	...	......	......	740	S. G. F. W. and T. abundant.	Cantonment, civil station, town, head-quarters of district, station on N.-W. Ry.

On this route from Kohala to Jhelum the heights of river at each crossing are given. The section Kohala to Tangrot is not passable for laden mules or riding ponies, and is used only by occasional fishermen who find grand sport. From Tangrot small and large boats can be floated down the rapids to Jhelum City.

Where vertical cliffs project into the river, the only way is to cross over to left bank, if there is a convenient ferry or to surmount the hill spur above and descend again to right bank

The halting places are at the ferries, and the ground for camping very small. A traveller should take through transport, unless he can afford to wait at each stage and give notice to the nearest large village for coolies.

From Uri 64 miles, a road branches off southwards over the Haji Pir pass to Poonch 97 miles, see Route XXX, and for its continuation to Kotli 128 miles, and to Jhelum 197 miles, see Route XXIV, which is much shorter and easier than following down the Jhelum valley.

For the Poonch and Murree road crossing at Dhara ferry, see Route XXVII.

For the Poonch and Rawal Pindi road crossing at Luchmun Bhatea, see Route XXVI.

XLII SRINAGAR to RAWUL PINDI by MURREE—

	Srinagar P.O., T.O., C., E.	...	0	Carriage road under construction bridged and metalled to Baramulla.	Down Jhelum valley on left bank.	Amiran Kadal Dudh Gunga bridge.	5235	S. G. F. W. T. abundant.	Large city, fort, summer capital of Kashmir State. Road branches to Gulmarg.
	[illegible]	...	2						
	[illegible]	...	5			......	......	......	
	[illegible]	...	13		......	Sukuag bridge			
1	[illegible] E.—	19	19	......	......	...	5200	S. G. F. T. available. W. from springs.	Small village, two ancient Hindu temples in ruins.

Number of Marches.	Names of Stages.	Distance in miles and furlongs. Inter-mediate. m.	f.	Total. m.	f.	Nature of Route.	Main Valleys and Mountain Passes.	River crossings and Lakes.	Altitude above Sea Level in feet.	Supplies and Transport at Stages.	Remarks.
XLIII	*ROUTE—contd.*	19	...	19	...						
	[illegible]	...	...	21	...	......	......	.. ...	......	......	Road branches to Gulmarg.
	[illegible] ...	..	...	27	...	......	......	Ningul bridge	......	......	Road branches to Sopur.
2	**Baramulla** ... *P. O., T. O., D. B., E.*	16	...	35	...	Carriage road through to Rawul Pindi used by all wheeled traffic, bridged and metalled.	......	......	5175	S. G. F. W. plentiful, T. after notice.	Town, bazar, tehsil, temple ruins at Uskara.
	Sher ...	...	...	39	...		......	Kechama bridge.	... ..	......	Wide plain, cultivated.
	Naoshera ...	...	...	46	4		.. ...	Naoshera bridge.	......	......	Road branches to Gulmarg.
				48	...	......	......	.. ...	......	......	Ancient Buddhist temple.
	Bhunniar ...	...	..	49	2	......	......	Harpetkai bridge.	5000	......	Saw mill, workshop, residence of Road Engineer.
3	**Rampur** ... *P. O., T. O., D. B., E.*	15	5	50	5	From Baramulla to Uri, the road traverses metamorphic rocks, and from Uri to Tret passes through the Mur-	......	......	4900	S. G. F. W. T. moderate.	Beautiful camping ground on terrace lined by deodar trees.
		...	...	57	...		......	.....	......	......	Ancient temple in ruins.
		..	...	62	...		... ..	Namila bridge.			

4	**Uri** P.O., T.O., D.B., E.— ...	13	3	64	...	rec rock formation. This road is liable to landslips after heavy rain and snow owing to the friable nature of the shaly rocks.	......	......	4390	S. G. F. T. procurable, W. scarce.	Village on fine plateau, well cultivated, small fort, tehsil.
		...	...	65	...		......	Islamabad bridge.			
	Bujadanga ...	...	..	69	...		......	......	......	......	Cliffs gorge.
	Dardkot ...	...	...	71	.		......	......	......	......	Ditto.
	Baranbat ...	..	...	74	...		......	......	......	......	Ditto.
	Opi ..	...	...	75	..	......	......	Opi bridge.			
5	**Chakuti** D. B., E. small— ...	13	4	77	4	......	......	......	3700	S. G. F. W. moderate, T. available.	Small village on cultivated plain.
	Chenar stage ...	...	...	82	2	......	......	......	......	......	Kathai, residence of Nawab Sultan Mahomed Khan, on right bank.
	Neli ...	...	...	86	2	The worst months are usually March and April when the snow melts, and the spring rain sets in.	......	Neli bridge	......	......	Plateau above road.
6	**Hatian** ..	10	6	88	2		......	Hatian bridge	3000	S. G. F. T. moderate, W. plentiful.	Police post, old D. B. in ruins.
	Ser neck ...	...	...	93	6		......				
7	**Garhi** P. O, D. B., E.— ...	10	4	98	6		......	......	2700	S. G. F. W. and T. available.	Cultivated plain. Large village, Hatian on right bank.
8	**Dumel** P. O., T. O., D. B., E. small— ..	13	4	112	2	This road is usually closed to wheeled traffic from the middle of December to the middle of March, when it is covered by snow between Srinagar and Uri and for about 16 miles over the Murree hill.	......	......	2225	S. G. F. W. plentiful, T. available.	Bazar at junction of Jhelum and Kishengunga rivers.
	[illegible]	...	...	117	6		......				
9	[illegible]	9	2	121	4		......	......	2105	S. G. F. W. procurable, T. after notice.	Hamlet.
		...	...	124	4		......	Agar bridge	2029		
	[illegible] ...	...	...	126	..						
	Barsala B.— ...	..	...	132	...		......	......	2010	......	Bungalow reserved for H. H. Maharaja, and shop.

14	**Barakao** *D. B. E.*– ...	12	...	184	2	......	......	Barakao causeway.	1950	Ditto	Two shops and police post.
				188	2	......	......	Pungrel causeway.			
15	**Rawul Pindi** .. *P. O. T. O., D. B., hotels. C., E.*–	13	4	197	6	...	......	......	1700	S. G. F. W. and T. abundant.	Large military cantonment, civil station, large city, head-quarters of district and station on N.-W. Ry.

[illegible] miles 2 furlongs, a road 1½ mile long after crossing the Jhelum river by at present a temporary wire rope suspension bridge branches [illegible], a town and head-quarters of zillah at the entrance of the Kishengunga valley.

Another road forks out to Abbottabad, see Route XLIII.

Murree Church is distant 3 miles, from Sunny bank 161 miles, and, as a rule, most travellers prefer halting in Murree, where there are good hotels and a club.

From Murree there are 2 roads westwards to Abbottabad, for the upper, see Route XXVII, and for the lower, see Route IXa.

From Kohala there is an old bridle road up the hill spur to Dewal 11 miles, Jhika gully 18 miles, and Murree 29 miles.

XLIIa HATIAN to KOHALA by OLD ROAD–

6	**Hatian** ...	...	...	88	2	Fair track ascending to Chikar.	......	Hatian bridge. Hatian ford	3000	S. G. F. T. moderate, W. plentiful.	Police post.
							......		......	S. G. F. T. W. procurable.	Village. Pir Punjal range.
7	**Chikar** ...	10	...	98	2	......	Basoli gully	... ..	......		
				99	...	......	Across Agar valley.				
				102	...	......					
									......	Ditto	Village.
8	**Maira** ...	8	...	106	2	......	......	......			
				109	4	......	......	Agar ford.			
9	**Danna** ...	7	...	113	2	Steep descent to Jhelum river.	......	......	......	S. G. F. W. plentiful.	Large village.

Number of Marches.	Names of Stages.	Distance in miles and furlongs. Inter-mediate. m.	f.	Total. m.	f.	Nature of Route.	Main Valleys and Mountain Passes.	River crossings and Lakes.	Altitude above Sea Level in feet.	Supplies and Transport at Stages.	Remarks.
XLXI	*ROUTE—contd.* ...	...	...	13[illegible]	4						
10	**Kohala** ... *P. O., T. O, D. B., E. very small—*	12		13[illegible]	1	......	......	Jhelum bridge	1916	S. G. F. W. procurable, T. after notice.	Small bazar and customs post.
				13[illegible]	...	When this Murree section is blocked by snow, travellers follow the old bridle road between Kohala by Dewal to Murree	Down Jhelum valley right bank.	Kunair bridge	1925		
11	**Phagwari** ...	12	2	14[illegible]	6		Ascent of Murree hill.	......	......	S. G. F. W. available. T. nil.	Village with two shops.
	Rewat, Road bungalow	...	...	14[illegible]	...						
	Jhika gully ...	..	.	15[illegible]	...		......	......	6800	......	Bridle road from Murree to Dewal crosses.
	Kuldanha ...	...	..	16[illegible]	...	......	......	......	......	......	Road branches to the gullies and Abbottabad
12	**Sunny bank under Murree** ...	15	2	161	...	Excellent hill carriage road, hence to Rawul Pindi, well maintained.	Descent of Murree hill.	......	6600	S. G. F. plentiful, W. from new supply, T. ample.	Murree is a civil and military sanitarium with large bazar.
	Murree Brewery ...	...	..	165	...						
	Gora Gali	...	...	16[illegible]	..		......	......	5200		
13	**Trot** ... *P. O., D. B., E.—*	11	2	172	2	......	......	......	2900	S. G. F. W. procurable, T. nil.	Small bazar.
				174	4	.....	......				
	Chattar garden ...	...	...	17[illegible]	2			Salgram bridge.			

Number of Marches.	Names of Stages.	Distance in miles and furlongs. Intermediate m.	f.	Total. m.	f.	Nature of Route.	Main Valleys and Mountain Passes.	River crossings and Lakes.	Altitude above Sea Level in feet.	Supplies and Transport at Stages.	Remarks.
[illegible]	[illegible] ...	7	...	113	2						
10	Kohala ...	7	.	120	2	......	......	Jhelum bridge	1916	S.G.F.W. procurable, T. after notice.	Small bazar and customs post.

[illegible] miles 6 furlongs another short cut may be made by climbing up the hill at the back of the Dak Bungalow to the Kot village, 3,000 feet, thence descending gradually down the Agar valley to Chatar on the Jhelum road 114 miles, thus saving 12 miles. The path is fair but stony, and fit only for men on foot.

XLIII SRINAGAR to KALAKE SERAI or HASSAN ABDAL by ABBOTTABAD—

	Srinagar *P. O., T. O., C., E.*— ...	...	...	0	...	Carriage road under construction to Baramulla, or go by boat down Jhelum river and through Woolar Lake 60 miles. If Noru canal between Shadipur and Sopur be open, then 50 miles.	Down Jhelum valley on left bank.	Amira Kadal	5235	S. G. F. W. and T. abundant.	Large city, fort, bazar and summer capital of Kashmir state.
		...	...	2	...			Dudh Gunga bridge.			
	Purana Chowni ...	...	...	5	...						
	Harprat ..	...	...	13	...		......	Suknag bridge.			
1	**Patan** *E.*— ...	19	...	19	...		......	.. ...	5200	S. G. F. T. available, W. from springs.	Small village, two ancient Hindu temples in ruins.
	Polhallan ..	...	...	21			......	......	.. ...	......	Road branches to Gulmarg 17 miles.
	Bulgaon ..	...	...	27	...	......	......	Ningal bridge	...	......	Road branches to Sopur 4 miles.

2	**Baramulla** *P.O., T.O., D.B., E.—*	...	16	...	35	...	......	Cross Jhelum river to right bank.	Jhelum bridge	5175	S. G. F. W. plentiful, T. after notice.	Town, bazar, tehsil.
	Bhimbiar	...	...	..	45							
					47	...	......	......	Limber ford.	......	......	Gypsum alabaster quarries 3 miles up side valley.
	Tatamulla	...	...		49	..	Fair hill road passable for laden animals but difficult in places.	......	......	4846	......	Jagir of Dewan Luchmun Doss.
3	**Gingl** *E.—*	...	18	...	53	...		......	Bijhama bridge.	4618	S.G. F.W. procurable, few coolies.	Bijhama 2 miles up side valley, summer residence of Nawab Sultan Mahomed Khan.
					55	...	......	......	Dodiali bridge.			
	Dawaren *Old Imperial serai in ruins*	...	...	..	56	...	......	......	...	......	......	Ancient ruins of city and temple.
		...	...		59	...	......	......	......	4283		
	Dina	...	...	..	63	..	Rough hill road stony with many ascents and descents and much cut up after heavy rain.	......	......	4798		
4	**Shadera** *B.—*	...	12	2	65	2		......	......	4294	Ditto	Ditto.
					69	..		Kumar must	......	4682		
5	**Kathai** *E.—*	...	10	6	76	...	......	... .	Kathai ford	3665	S. G. F. W. and T. available.	Winter residence of Nawab Sultan Mahomed Khan.
					79	2	......	Cowlanda	......	4045		
	[illegible]			...	80	...	...	......	Peliasa ford.			
6	[illegible]	...	8	6	84	6	......	... .	......	3540	S. scarce, G. F. W. procurable, T. nil.	Small village.
	[illegible]	...	.		92	..	......	......	Dopatta ford	......	......	Old fort.
7	**Hattian**	...	10	...	94	6	Good hill road onwards.	... ..	......	2665	S. G. F. W. and T. available.	Large village.
	Malsi	...	--	...	97	..		......	Dwarsida ford			

Routs of Jammu & Kashmir, by De-Bourbel(P-14)

Number of Marches.	Names of Stages.	Distance in miles and furlongs. Intermediate. m.	f.	Total. m.	f.	Nature of Route.	Main Valleys and Mountain Passes.	River crossings and Lakes.	Altitude above Sea Level in feet.	Supplies and Transport at Stages.	Remarks.
[illegible]	[illegible]	...	...	97	...						
[illegible]	[illegible]abad ... P. [illegible], T. O., D. B. at [illegible], E.—	13	2	108	...	Rough track very stony and much cut up, steep approaches to pass on both sides.	.....	Kishengunga bridge.	2222	S. G. F. W. plentiful, T. after notice	Town, fort, bazar, head-quarters of zillah.
				109	...		......	.. ...	......	......	Old Imperial serai.
				115	...		Doob gully	......	4556		
9	Garhi Habibulla P. O., D. B., C., E. small	10	4	118	4	Fair hill road passable for ekkas.	......	Nansook or Kunhar bridge	2648	S. G. F. W and T. available.	Large village and bazar.
				125	6	... ..	Batrasi gully	... .	4004		
				133	4	......	.....	Ichur bridge	3360		
10	**Mansera** ... P. O., D. B., E.—	18	...	136	4	Fair cart-road earthen.	.....	Batti "	3540	S. G. F. W. and T plentiful.	Large village and tehsil.
11	**Abbottabad** .. P. O., T. O., D. B., E.—	16	...	152	4	Good road bridged and metalled.		......	4005	S. G. F. W. and T. ample.	Military cantonment, civil station, town, head-quarters of district Hazara.
				153	..		Sulhud pass				
				161	...	Tonga dak runs to Hassan Abdal.	.....	Dor ford	2700		
	Chamba ... *B. C., E —*	...	...	163	..	......	...	.. ...	2610	S. G. F. W. after notice. T. nil.	Halting place.
	Haripur ... *P. O., T. O., D. B., C., E.—*	23	2	175	6	......	. ...	......	1730	S. G. F. W. and T. plentiful.	Town, bazar, tehsil.
	Huttar ...	...	...	189	...	......	.. ...	......	......	S. G. F. after notice.	Halting place.
	Balar tope ..	...	...	191		......	.....	Haro ford	1600	W. from well, T. nil.	

Routs of Jammu & Kashmir, by De-Bourbel(P-15)

Routes of J&K
by De-Bourbel

16

From Hassan Abdal onwards this road leads to Gilgit/Kafirstan & Central Asian Countries including Russia & China. The historical Silk wayfor (you can divert from Abbottabad on Shahrah-e-Abr-Esham). From Hassan Abdal this road will lead you to Islamabad via Panja Sahib Texla, Jehlum, Mirpur — RNB

13	**Kala-ko Sorai** ... *P. O., T. O., D. B.*— or **Hassan Abdal** ... *P. O., T. O., D. B., 1½ mile from railway station.*	21	2	197	...	......	.....	.....	1690	S. G. F. T. after notice, W. from well.	Railway station on N.-W. Railway.
		19	...	194	6	......	......	......	1400	S. G. F. W. and T. available	Ditto.

From Peliasa 80 miles there is a track up the side valley northwards over the Hattian gulli of the Kajnag range which descends into the Karna valley to Titwal on the Kishenganga river 20 miles.
From Malsi 97 miles there is a track up the Dwarsida valley across the Kajnag range and descends down the ravine which leads to Noseri Nausada on the Kishenganga river about 16 miles in length.
From the old Imperial serai at Mozufferabad 109 miles there is an alternative route by the Lohar gulli 3,459 feet 112 miles, to Garhi Habibulla 119½ miles. This track is passable for laden animals.
From Garhi Habibulla northwards, there is a good road up the Kunhar valley on both banks to Balakot 12½ miles, a populous town and trading mart of the Kaghan valley.

XLIII2 BARAMULLA to MOZUFFERABAD by TUTMARI GULLI—

2	**Baramulla** ... *P. O., T. O., D. B., E.*—	...	...	35	...	Fair hill road, fit for riding and passable for laden animals, through to the Kishen-gunga valley.	......	......	5175	S. G. F. W. plentiful, T. after notice.	Town, bazar, tehsil.
	Arhama ...	...	...	40	4		......	......	5400	......	Large village.
				41	...		......	Vij ford.			
	[illegible]	...	...	42	4		......	Hamal "			
3	[illegible] *E.*—	14	...	49	...	......	Up Marwar valley left bank.	......	......	S. G. F. W. available, few coolies.	Ditto.
				50	4			Tirus ford.			
	[illegible] ...	..	...	52	...	......	.....	Marwar "	5700	......	Ditto.
	[illegible]ach ...	...	...	64	...						
4	**Lansor Naugaon** *E.*—	9	...	58	...	.....	.. ...	.. ...	......	S. scarce, G. F. W. moderate, few coolies after notice.	Hamlet.

Routs of Jammu & Kashmir, by De-Bourbel(P-16)

☆ Books and Maps which have been consulted

"Abu-Fazal Alami, Ain Akbari, Translated by Colonel J.S Jerratt. See Vol. II Fasciculi IV and V of Asiatic Society of Bengal. 1891.

باقی فہرست میں زیادہ تر نام اُنہی سیاحوں اور سفرنامے لکھنے والوں کے ہیں جن کا ذکر راقم نے پہلے ہی اس مضمون میں کیا ہے لیکن جن کا ذکر نہیں آیا ہے وہ بوریل کے حوالے سے حاضر ہے۔[ا]

۱۔ وکٹر جیکو ماونٹ ٹریولز ان انڈیا ۱۸۴۱ء۔

۲۔ ڈاکٹر ایچ فیلیونز میموریز آف کشمیر اینڈ لٹل ٹیبٹ (تبت) ۱۸۳۷ء۔

۳۔ جی ٹی وگنے ٹریولز ان کشمیر لداخ اینڈ اسکردو ۱۸۴۲ء۔

۴۔ ایف ڈریو جموں اینڈ کشمیر ٹیری ٹریز وتھ میپس ۱۸۵۷ء۔

۵۔ سی ایف۔ گل برل ہنٹس ٹو ٹریولرز ان کشمیر ۱۸۸۷ء۔

۶۔ میجر ای وارڈ سپورٹس نیر گائیڈ ٹو کشمیر اینڈ لداخ ۱۸۸۸ء۔

۷۔ کرنل لیمبرٹ ٹریولر ٹو کشمیر اینڈ لداخ ۱۸۹۱ء۔

ڈی بوریل نے کچھ اور کتابوں کا ذکر بھی کیا ہے جن میں تبت، کاشغر، کافرستان اور شمالی علاقہ جات کے راستوں کا ذکر ہے۔ جو کشمیر کی طرف آتے ہیں۔

ا۔ راستے آتے بھی ہیں اور جاتے بھی لیکن پھر بھی اپنی جگہ کھڑے ہیں۔ کئی راستے
منسوخ کر دیئے گئے۔ سڑکوں، شاہراہوں اور پُلوں کی تعمیر سے کئی راستے کالعدم قرار دے دئے
گئے جو داستانِ پارینہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ لیکن یہ صدیوں تک کشمیر آنے والے مہمانوں بلکہ حملہ
آوروں کے پاؤں چُومتے رہے اور اُن ہزاروں کاروانوں کی آمد کے چشم دید گواہ ہیں جو اس وادی
میں آئے اور گئے۔ کہتے ہیں کہ تہذیب اچھی سڑک پر چل کر آتی ہے یہ ذو معنی جُملہ ہے جس کا ایک
مطلب یہ ہے کہ زندگی گزارنے کے آداب اچھی سڑکوں پر چلنے سے سیکھے جاسکتے ہیں اور ترقی اور
خوشحالی تب آتی ہے جب اس کے آنے کیلئے راستہ ہموار اور صاف ہو۔ ہماری اس وادی کی
تہذیب وثقافت صدیوں پر محیط ہے۔ اس میں تبدیلی بھی آتی رہی ہے جو کہ ایک فطری عمل ہے اور
ناگزیر ہوتی ہیں۔ لیکن ہماری نئی نسل کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم کہاں سے آئے ہم کون ہیں اور
ہماری اگلی منزل کہاں ہے؟

معلوم دَور کی تاریخ کے صفحات پر اِس وادیٔ گلپوش میں تشریف لانے والے مشاہیراوراہم تاریخی شخصیات کے ذکر سے پتہ چلتا ہے کہ اس کوچے میں آنے والے اہلِ خرد وجنوں کے نزدیک اس کی کتنی اہمیت تھی۔ ان کی فہرست بے حد طویل ہے لیکن میں اختصار سے کام لیتے ہوئے چند ایک نام تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ سِکھ مت کے بانی گورونانک دیو، گورو ہرگوبند سنگھ، عیسائی مشنری، تیسرے شنکر اچاریہ، مہاراجہ رنجیت سنگھ، لارڈ کلایو، لارڈ ڈلہوزی، لارڈ لنتھلگو، لارڈ واویل، لارڈ کرزن، لارڈ ماونٹ بیٹن اور لیڈی ماونٹ بیٹن، ایران کی ملکہ ثریا، افغانستان کے شاہ امان اللہ، پاکستان کے بانی محمد علی جناح، شاعرِ مشرق علامہ سر محمد اقبال، حفیظ جالندھری، لیاقت علی خان، عبدالرب نشتر، محمد دین تاثیر، مولانا ظفر علی خان، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، فیض احمد فیضؔ۔ پنڈت جواہر لال نہرو، سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان، حکیم اجمل خان، آصف علی سیف الدین کچلو، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، غلام رسول مہر، اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل ڈاگ ہیمر شولڈ[1] (ڈاگ ہیمر شولڈ شاید عالمی سطح کے آخری سفیر تھے جو اس راستے سے وادی میں داخل ہوئے تھے)۔

7 اپریل 2005ء کو قریب ساٹھ سال تک بند رہنے کے بعد اِس شاہراہ کو ٹریفک کے قابل بنا کے کھول دیا گیا۔ دونوں سرحدوں کو ملانے والے پُل کا نام اِس طرف سے کمان برج یا امن سیتو اور اُس طرف سے ''اُپی'' پُل رکھا گیا۔ اُپی حدِ متارکہ کے اُس پار قریبی گاؤں کا نام ہے۔

---

[1] ڈاگ ہیمر شولڈ غالباً 1961ء میں اوڑی کے راستے سے سرینگر آئے تھے۔ میں اس واقعے کا چشم دید گواہ ہیں۔ میں نے ہائی سکول بونیار کے دوسرے طلباء کے ساتھ اُن کے سامنے ایک ویلکم سانگ پیش کیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور ہمیں مزید ارتافیاں دیں۔ اُنکی بیگم نے ہمارے درمیان کھڑے رہ کر تصویریں کھنچوائیں۔ انہوں نے اپنا لنچ بونیار میں نالہ ہاپت کھائی کے کنارے کھایا، اُن کے ہمراہ وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد اور ہندوستان کے وزیر دفاع کرشنا مینن بھی تھے۔

جہلم ویلی روڈ آج:

مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے سرینگر کوہالہ جہلم ویلی کارٹ روڈ کا باضابطہ سرکاری طور افتتاح ۷ ستمبر ۱۸۸۹ء کو کوہالہ کے پل پر ربن کاٹ کر کیا اور ایک لاری اور چار بیڈفورڈ بسوں کو ہری جھنڈی دکھا کر سرینگر کی طرف روانہ کیا۔ اس کے بعد کئی لاریاں موٹریں بیل گاڑیاں اور چھکڑے ضروریا اشیاء لے کر دوسری دن روانہ ہوئے۔ ۱۰ اکتوبر کو برفباری کی وجہ سے درجنوں گاڑیاں اوڑی بارہ مولا رام پور میں رک گئیں جو ۱۴ دنوں تک رُکی رہیں اور پھر آنے والے جاڑے کے موسم میں شدید برفباری سے یہ روڈ بند رہی مسافر پیدل سفر کرتے رہے۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ اِس پر ہر میل پر ایک قُلی تعینات کیا گیا اور میکڈم بچھانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس روڈ پر سرینگر اور راولپنڈی کے درمیان روزانہ ۶ بسیں چلتی تھیں جن میں ۱۵ سیٹیں فی بس ہوتی تھی اور ۱۵ مسافروں کے علاوہ ایک بھی سواری کو بٹھانا بہت بڑا جرم، مانا جاتا تھا۔ باقی لوگ بیل گاڑیوں، گھوڑوں اور تانگوں پر سفر کرتے تھے۔ چراغ الدین اینڈ سنز کی ٹرانسپورٹ کمپنی .... بس سروس کے علاوہ ایک اور بس اِس روڈ پر چلتی تھی۔ بس کی ٹکٹ کئی دن پہلے بلکہ مہینوں پہلے خریدنا پڑتی تھی۔ سرینگر سے مظفر آباد تک کا کرایہ ابتداء میں دو روپے اور راولپنڈی تک ۵ روپے اور مظفر آباد تک ۴ روپے مقرر رہوا۔ یاد رہے کہ سرینگر سے مظفر آباد کا فیصلہ ۱۶۲ کلو میٹر اور راولپنڈی اسلام آباد تک ۲۷۲ کلو میٹر یعنی ۱۷۴ میل تھا۔ اس سفر میں ۱۰ سے ۱۲ گھنٹے لگتے تھے۔ بیل گاڑی کو ۱۵ دن اور ٹانگے کو ۱۰ دن منزل مقصود تک پہنچے میں لگتے تھے۔ غریب مزدور لوگ روٹیاں، اچار، گھی، وغیرہ پیٹھ پر باندھ کر پاؤں میں گھاس کا جوتی پلھور یا پُول پہن کر سفر کرتے تھے اور انہیں بھی ۸ سے دس دن کا عرصہ سفر میں لگتا تھا۔ اس سفر میں ۸ سے ۱۰ پُولوں (پلہور) کے جوڑے فالتو رکھنے پڑتے تھے۔ اوڑی میں ایک مُرسلین بیگ نامی شخص کی دُکان ہوتی تھی جس کے پاس برٹش آرمی کے استعمال شدہ جنگی جوتے بکتے تھے۔ یہ جوتے یورپ میں بنے ہوئے تھے اور خالص چمڑے کے ہوتے تھے۔ قیمت ۵ روپے

سے سات روپے کے درمیان ہوتی تھی۔ اس زمانے میں مزدور کی ایک یوم کی اُجرت ایک سے دو آنے ہوتی تھی۔ نمک ایک روپے میں 5 کلو، چاول ایک روپے میں ۵/ کلو ہوتے تھے۔ (راقم الحروف خود اسکا گواہ ہے) کھانڈ ۶ آنے میں اور شکر ۴ آنے نیز گُو ۳ آنے میں سیر، بکتا تھا۔ سیر موجود کلو سے تھوڑا سا زیادہ ہوتا تھا۔ مارکین ۱۶/ آنے میں ایک گز اور لٹھا چوبی ڈیڑھ سے دو روپے فی گز ہوتا تھا۔ گھوڑے اکیے تانگے اور بیل گاڑیاں بارہ مولا تک ہی جاتی تھیں۔ بارہ مولا سے آگے اکثر کشتیوں میں براستہ سوپور سری نگر کا سفر کرتے تھے، بارہ مولا ایک بڑی تجارتی منڈی کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ حال ہی میں مظفر آباد کے دورے کے دوران راقم کو گڑھی دوپٹہ میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی جس کی عمر بقول اُس کے ۹۰ سال ہے۔ وہ ۱۹۴۷ء تک چراغ الدین اینڈ سنز کی بس کا ڈرائیور رہ چکا ہے۔ آج اُنکی اپنی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی ہے وہ ۳۰ سال تک قادری ٹریلویز کے جنرل منیجر بھی رہے اور آج تقریباً ۶۰ بسوں کے مالک ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اگست ۱۹۴۷ء سے اکتوبر ۴۷ء تک سرینگر میں مقیم رہے۔ کیونکہ سرینگر راولپنڈی روڈ پر جگہ جگہ قبائلی حملہ آوروں اور مہاراجہ کی فوج اور پولیس کے درمیان لڑائی جاری تھی۔ اس لئے ایک ماہ کے لئے سڑک بند کردی گئی تھی۔ انہوں نے بس کمپنی کے مالک کو فون پر پوچھا کہ وہ کیا کرے۔ ٹرانسپورٹ کمپنی کے مالک نے اُسے ہدایت کی کہ وہ بس کو فروخت کرکے واپس مظفر آباد چلا آئے۔ چنانچہ اس نے سرینگر ہی میں کسی دوست کو بیڈفورڈ بس ساڑھے بارہ ہزار روپے میں فروخت کرڈالی۔ دس ہزار روپے انہوں نے امیرا کدل کے جموں وکشمیر بنک میں جمع کروادئے جو اُس ماہ کھلا تھا اور ڈھائی ہزار روپے لے کر واپس مظفر آباد کی طرف روانہ ہوئے لیکن راستے میں حملہ آوروں نے اُس سے وہ ڈھائی ہزار روپے بھی چھین لئے اور اسے ادھموا کرکے چھوڑ دیا۔ وہ اس اُمید کے ساتھ کہ آج نہ سہی تو کل، کل نہ سہی تو پرسوں واپس لوٹے گا گھر پہنچا اور آج تک واپسی کے انتظار میں بیٹھا ہے، نے مجھے درخواست کی کہ جے کے بینک امرا کدل شاخ سے اُنہیں وہ روپے نکال کردے۔ فی الوقت میں اس

بینک پر نہیں گیا ہوں۔ ایک تو اُسے بینک اکاونٹ بک اور رسید کھو دیئے ہیں اور پھر Pessnation نہیں کی جسکے نتیجے اغلب ہے کہ اُس کا کھاتہ بند ہو چکا ہو اور اگر اکاونٹ نمبر موجود بھی ہوگا کہ 12000 روپے کو آج 12 کروڑ بن چکے ہوں گے۔

۳۰ر اکتوبر کو جب مہورہ پاورس کو اُڑا دیا گیا اور جموں و کشمیر کی سرکاری فوج کے کمانڈر اِن چیف بریگیڈیر راجندر سنگھ کو بونیار کے مقام پر ہلاک کر دیا گیا اور اوڑی نیز اُپی کے تاریخی پُلوں کو بھی نذر آتش کر دیا گیا تو اس روڈ پر ٹرانسپورٹ سروس بند کر دی گئی۔ 26 اکتوبر کو ایک بس بارہ مولا سے صبح 6 بجے مظفر آباد کی طرف روانہ ہوئی۔ اس میں چار طالب علم ایسے تھے جو سرینگر کے ایس پی کالج میں زیر تعلیم تھے۔ اُن میں ایک طالب علم رشید سرور گیلانی نے مجھے ایک ملاقات میں کہا کہ بزرگ مسافروں نے انہیں بارہ مولا سے بس میں بیٹھنے سے منع کیا اور کہا کہ راستے میں جنگ ہو رہی ہے۔ لیکن ہم نے نہ مانا۔ ہم لوگ اوورلوڈ میں ہی بس کے اندر سوار ہو گئے۔ بس کے ڈرائیور نے اوورلوڈ اٹھانے سے انکار کر دیا لیکن ہماری منت سماجت کے بعد اس نے ہمیں سیٹوں کے درمیان لیٹ جانے کے لئے کہا۔ رشید سرور گیلانی نے کہا کہ وہ ڈرائیور پشاور کا رہنے والا تھا۔ اس نے ہم سے دوگنا کرایہ وصول کیا اور ہم تھوڑی سی نصابی کتابیں اپنے جھولے میں رکھکر جا رہے تھے اِس اُمید پر کہ ہفتے کے بعد واپس آجائیں گے۔ لیکن آج تک انہیں بارہ مولا اور سرینگر دیکھنے کا ارمان پورا نہ ہو سکا۔ رشید سرور گیلانی نے آگے تعلیم راولپنڈی میں حاصل کی۔ بعد میں وہ پاکستان پر زیر انتظام کشمیر میں ایک پولیس افسر بن گئے۔ اُن کے ایک عزیز نے مجھے بتایا کہ 2009ء میں اُن کا انتقال ہو گیا ہے اور اس طرح جہلم ویلی روڈ کا آخری مسافر بھی نہ رہا۔ 2005ء تک یہ روڈ قطعی بند رہی اور سرینگر سے اڑوسہ تک ایک آر ٹی سی کی بس یا پھر کوئی پرائیویٹ نجی گاڑی چلتی رہی۔ اڑوسہ سے ایل او سی (اُپی برج) تک کا دو کلومیٹر کا راستہ بالکل سنسان اور ویران رہتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی فوجی گاڑی کمان پل تک جاتی رہی نہ بیل گاڑی چلی نہ تانگہ، نہ گھوڑا اور نہ لاری۔ پھر دونوں ممالک کے حکمرانوں نے اس سڑک کو مشروط طور پر کھولنے کا

فیصلہ کرلیا۔ شرط یہ رکھی گئی کہ یہ شاہ راہ ہفتے میں صرف ایک دن (پیر) کھو کھلے گی اور دونوں جانب سے صرف منقسم خاندانوں کے وہ لوگ جنہیں حکام نے کافی تحقیقات کے بعد ایل او سی کراسنگ پرمشن دے رکھی ہو کمان پل کو عبور کر سکتے ہیں۔ چنانچہ 5 اپریل 2005ء کے دن وہ تاریخی دن آ ہی گیا جب عالمی میڈیا اور اعلیٰ حکام اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی میں خونی رشتے رکھنے والے 50/50 افراد (دونوں طرف کے) نے انتہائی جذباتی ماحول میں کمان پل کراس کیا۔ پاکستان کے زیر انتظام کشمیر سے تشریف لانے والے کئی خواتین وحضرات نے پُل عبور کرتے ہی اپنے مادر وطن کی زمین پر سر بسجود ہو کر اللہ کا شکریہ کیا کہ آخر اُنہیں اس تاریخی راستے کو عبور کرنے کا 58 سال کے بعد پھر موقعہ ملا، جس پر اُن کے اسلاف یا وہ خود برسوں چلے ہیں اور سڑک ایسے ہزاروں سیاحوں اور مسافروں کے اِدھر یا اُدھر قدم رنجہ فرمانے کی واحد گواہ رہ گئی ہے، جس نے کئی انقلاب دیکھے، کئی اہم شخصیات کی قدم بوسی کی اور تاریخ کے صفحات پر کئی کھٹے میٹھے واقعات کی عینی شاہد بن گئی۔

اپریل 2005 کے بعد اس روڈ پر ماسوائے چند ماہ کے جب 8 اکتوبر 2005 کو ایک خطرناک زلزلے سے اس روڈ کے دونوں اطراف بڑی بڑی پسیاں گر آئیں کمان پل بھی گر گیا اور مظفر آباد تک ان گنت مقامات پر سڑک کا نام ونشان نہ رہا، سڑک کی مرمت اور از سر نو تعمیر کے بعد دوبارہ آمد ورفت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ 2009 سے دونوں ممالک نے CBM اعتماد سازی کے لئے محدود پیمانے پر 21 اشیاء کی تجارت شروع کر دی۔ آج مسافروں کو ہفتے میں ایک دن یعنی سوموار کو کراس کرنے کی اجازت ہے جبکہ شروع شروع میں پندرہ دنوں میں ایک مرتبہ کراسنگ کی اجازت ہوتی تھی۔ سڑک سامان سے لدے ہوئے سلام آباد پہنچتے ہیں اور وہاں انکو ضروری چھان بین کے بعد چکوٹھی (پاکستان کے زیر انتظام کشمیر) تک جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ جہاں سے وہ خالی واپس آ کر سلام آباد سے وہ سامان اٹھاتے ہیں جو پاکستان کے ٹرک وہاں چھوڑ گئے ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ فی الوقت جاری ہے۔ لیکن جہلم ویلی روڈ کی شانِ رفتہ ابھی بحال نہیں ہو سکی

ہے۔اس سڑک کی اہمیت اُس دن بڑھے گی جب اس پر روزانہ سینکڑوں گاڑیاں مسافروں کو لے کر مظفر آباد یا راولپنڈی غیر مشروط طور جا سکیں گی۔

حوالہ جات:

۱۔ راج ترنگنی (اُردو ترجمہ) پنڈت کلہن

۲۔ گلدستہ کشمیر، پنڈت ہرگوپال خستہ

۳۔ تاریخِ حسن، حسن شاہ

۴۔ تاریخ فرشتہ دونوں جلدیں، محمد قاسم

۵۔ واقعاتِ کشمیر، محمد اعظم دیدہ مری

۶۔ سفرنامہ کشمیر، منشی محمد الدین فوق

۷۔ رہنمائے کشمیر، منشی محمد الدین فوق

۸۔ تاریخِ اقوام کشمیر، منشی محمد الدین فوق، جلد اوّل، جلد دوم

۹۔ تاریخِ اقوام پونچھ..........منشی محمد الدین فوق

۱۰۔ تاریخِ گکھڑاں

۱۱۔ تاریخ کھکھا راجپوت، راجہ سیماب خان

۱۲۔ تاریخ ملکاں

۱۳۔ آتشِ چنار..........شیخ محمد عبداللہ

۱۴۔ شہاب نامہ..........قدرت اللہ شہاب

۱۵۔ ویلی آف کشمیر، لارنس

۱۶۔ رُوٹس آف جموں اینڈ کشمیر، ڈی بوربیل

۱۷۔ ریڈریس اِن کشمیر، میجر جنرل محمد اکبر خان

۱۸۔ Ancient monuments of Kashmir, By R.C.Kak

۱۹۔ History of Sikh Rule in Kashmir, By P.K.Parimoo.

۲۰۔ Kashmir-Untold Story of Men & Mathers, By Kak.

۲۱۔ مظفر آباد تاریخ کے آئینے میں، (ا) پروفیسر نصر اللہ خان ناصر،
(۲) خوش دیو مینی

۲۲۔ شیرازہ۔ جموں کشمیر لداخ نمبر جلد ا تا ۷۔

۲۳۔ مختصر تاریخ جموں و کشمیر۔ مولوی حشمت اللہ خان لکھنوی

۲۴۔ دستاویزات صابر آفاقی

۲۵۔ تاریخِ کشمیر، صابر آفاقی

☆☆☆

☆☆☆

☆......چیمٹ نمگیل لداخی

بھوٹی (لداخی) زبان اور اس کا رسم الخط

بھوٹی لداخیوں کی مادری زبان ہے جوکہ سارے لوگ بولتے، سمجھتے اور لکھتے ہیں۔ اس کو کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ جیسے لداخی، تبتی، پوت یگ، پُورکی، لاہولی، بھوٹیا وغیرہ۔ اس کا اپنا رسم الخط بھی ہے۔ بھوٹی زبان کے رسم الخط کا موجد تبتی راجہ سروٹگچن گمپو کے آقا کا بیٹا تھونمی سمبھوٹا تھا۔ جس کو دیگر 15 ذہین لڑکوں کے ساتھ چن کر راجہ نے ساتویں عیسوی میں بھوٹی زبان کیلئے ایک رسم الخط اپنانے کی غرض سے ہندوستان بھیجا تھا۔ سمبھوٹا نے مشہور و معروف بالندہ یونیورسٹی اور کشمیر میں بڑی لگن اور محنت سے 14 سال مکمل تعلیم حاصل کر کے اور مختلف زبانوں کا مطالعہ کر کے تبت واپس جا کر بھوٹی زبان کا رسم الخط ترتیب دیا تھا۔

تھونمی سمبھوٹا دس مختلف زبانوں میں مہارت رکھتا تھا۔ اُس نے چوتھی صدی عیسوی کے گُپتا عہد کی دیوناگری رسم الخط کی بنیاد پر پانینی کی سنسکرت گرائمر وغیرہ کا مطالعہ کر کے اُس وقت کی بھوٹی زبان بولنے والے سارے علاقوں کے ماحول اور زبان کی ضرورت کے مطابق اس میں ترمیم اور نئے حروف ابجدی کر کے تیں حروفِ تہجی اور چار واویل (Vovel) والا ایک مکمل رسم الخط ترتیب دیا تھا۔

اس رسم الخط میں وہ تمام اوصاف وخوبیاں پائی جاتی ہے جوکہ ایک مکمل جدید اور وسیع زبان کیلئے ہونی چاہئے۔ بھوٹی زبان میں الفاظ کے بڑے ذخیرے موجود ہیں جو حالت اور موقع کی مناسبت استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ شعروشاعری اور نظم نگاری کے

لئے قاعدہ کی علاحدہ کتاب ہے۔ بھوٹی زبان کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر لفظ کے لئے ایک الگ اعزازی لفظ (Honorafic words) موجود ہے۔ جیسے، سر کو عام لفظ میں 'گو' بولا جاتا ہے۔ اس کو اعزازی لفظ میں 'اُو' بولا جاتا ہے۔ کپڑے کو عام لفظ میں 'گوس' بولا جاتا ہے اور اعزازی لفظ میں اس کو 'نم ذا' بولا جاتا ہے۔ بھوٹی زبان کے رسم الخط میں جس کسی بھی زبان کا تلفظ لکھا جائے ہو بہو اُسی زبان کے تلفظ کی آواز نکل سکتی ہے۔ ایسا اور کسی بھی زبان کے رسم الخط میں نہیں ہو پاتا ہے اور تیزی سے لکھنے کے لئے اس کا شارٹ ہینڈ بھی موجود ہے۔ جسکو 'سدو یگ' کہا جاتا ہے۔ بھوٹی زبان کا ٹائپ رائٹر اور کمپیوٹر بھی بن چکا ہے۔ کمپیوٹر ٹریننگ کیلئے بھوٹی زبان کی علاحدہ کتاب بھی ترتیب دی گئی ہے۔ خوش خط لکھنے کے لئے نہ صرف انگریزی کی طرح ۴ لائین ہوتے ہیں۔ بلکہ خوش خط تحریری قاعدہ کی مشہور رہبری کتاب بھی موجود ہے۔ انگریزی کی طرح اس رسم الخط کے بھی چھوٹے اور بڑے دو قسم کے حروف ہوتے ہیں۔ چھوٹے حروف کی چار اور قسمیں ہوتی ہیں۔ ان کے الگ نام اور شکلیں ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ زبان دُنیا کی چند مستند مکمل زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔

تھونمی سمبھوٹا نے بھوٹی رسم الخط ترتیب دینے کے بعد تبتی 'لوژاوا' عالموں کے ساتھ مِل کر ساتویں صدی عیسوی سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک سنسکرت سے بھوٹی زبان میں ترجمے کے کام کئے تھے۔ جن کی تعداد دس ہزار جلدوں سے بھی زیادہ ہے۔ جس میں فلسفہ، مذہب، طب، نجوم، جیوتش، منطق، فنِ مصوری، ہنر، تاریخ وغیرہ شامل ہیں۔ اِس کے علاوہ سینکڑوں تبتی مشہور عالموں (لوژاوا) نے اپنی ادبی تحریریں و تبصرے لکھ کر بھوٹی ادب میں اضافہ کیا ہے۔

جب بارھویں صدی عیسوی میں ہندوستان پر شمال مغرب کی طرف سے بیرونِ ملک کا حملہ ہونے سے تمام گونپوں اور یونیورسٹیوں کی لوٹ کھسوٹ اور تباہی ہونے کے بعد بہت ساری سنسکرت کی کتابیں ختم ہوگئیں تھیں، جن کی تعداد 4502 بتائی جاتی ہے، جو کہ

اس وقت بھوٹی زبان میں محفوظ ہیں اُن کو پھر سے بھوٹی سے سنسکرت میں واپس ترجمہ کرنے کیلئے کام چل رہا ہے۔ اس لئے سنسکرت کی کھوئی ہوئی کارناموں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے بھوٹی ایک اہم ضرورت کی زبان بنی ہوئی ہے۔

اکثر لداخی اور لداخ آئے غیر لداخی عالموں (لوژاوے) جنہیں سنسکرت اور بھوٹی زبان دونوں میں مہارت حاصل تھے۔ اُن میں دسویں صدی کے لوژاوارنچیں زنگپو۔ بارھویں صدی کے زنسکار لوژاوا پھگسپا شراب اور سولہویں صدی کے لامہ ستگ سنگ رسپا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جنہوں نے سنسکرت سے بھوٹی زبان میں ترجمے اور بھوٹی زبان میں تخلیقی کام کئے اور صرف بھوٹی زبان میں تخلیقی کام کرنے والے مشہور لداخی عالموں میں، لام چھلٹیم نماں، سرس رنپسو چھے نوزنگ چھلٹیم چھوسفل، گے شیش ایشے تنڈوپ، کاچھین لوزنگ ذوت پا، گیرگن تحم، سیکدان گیرگن، کھانپو کونچوک ستنزین وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اس وقت کی بھوٹی زبان کے دانشوروں میں مشہور سکالر لٹشی رگبیس، ڈاکٹر لوزنگ چھوانگ، پروفیسر جمیانگ گلچن، گے چھونگ ریگزین یگشے کونچوک ورنگدوس اور درجنوں دانشور لامہ گشیش، شیخ محمد جاوید بہت سارے مردوزن تخلیق کار موجود ہیں۔

متذکرہ بالا عالموں کی تحریری کاموں میں بھگوادارا کی علمِ طب کی کتاب ''اشتنگ گدیری دیوا'' کارنچیں زنگپو کی بھوٹی ترجمہ، لامہ ستگ سنگ کی سوانح حیات، سفرنامہ، مذہبی گیتوں کا مجموعہ، لامہ چھلٹیم نماں کی سوانح حیات، سرس رنپو چھے لوزنگ چھلٹیم چھوسقل کی مذہبی نثر و نظموں کا مجموعہ، گیشے ایشے تنڈوپ کی سوانحِ حیات، کاچھین لوزنگ ذوت پا کی زنسکار کی ہسٹری و دوسری تحریری کام۔ گرگن تحم کی لداخی ہسٹری، سکبدان گرگن کی لداخ ہسٹری، لٹشی رگبس کی مشہور لداخ ہسٹری و نظموں کا مجموعہ و دوسرے بہت سارے کارنامے، کھانپو کونچک پھاندے کی پھاندے لیک شات، رحم مالک کی بھوٹی ترجمہ قران، صنم پونچوک کا لداخ دیب تھیر، راقم کے ڈراموں کی کتاب، پدما بھوشن بکولا رنپوچھے کی مشہور سوانحِ حیات۔ پدما شری صنم نوربو کی سوانح حیات وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ دُنیا کے مختلف ملکوں کے عالموں، ہنگری کے محقق سوماڈی کروس نے النقرۃ میں رہ کر بھوٹی زبان سیکھی اور بھوٹی زبان کے لغات اور گرائمر بنایا اور اے۔الف۔یاسکے نے ستوق گاؤں کے ایک لامہ سے بھوٹی زبان سیکھ کر بھوٹی انگریزی لغات بنائی۔مولاوین مِشن کے پادری ڈاکٹر کارل مارکس اور فرانکی نے بھوٹی زبان سیکھی اور بائبل کا بھوٹی زبان میں ترجمہ کیا۔اس نے انگریزی میں لداخ کی ہسٹری لکھی۔اسی طرح گرمیوں میں یورپ اور مغربی ملکوں سے آنے والے کلچرل ٹورسٹوں میں سے بہت سارے لوگ بھوٹی زبان سیکھ کر تحقیقی کام کرتے ہیں جس سے کہ بھوٹی صرف بھوٹی بولنے والوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اِس کا دائرہ وسیع ہوگیا ہے۔

بھوٹی زبان دُنیا کی زبانوں کے دوسرے بڑے خاندان یعنی تبتین سے تعلق رکھتی ہے جو کہ دُنیا کی 1/5 آبادی کے لوگ بولتی ہے۔بھوٹی زبان چینی زبان سے بالکل الگ ہے۔چینی Pictoral Sambal کی بنیاد پر مبنی ہے اور بھوٹی زبان Sound samble کی بنیاد پر بنتی ہے۔

بھوٹی ساتویں صدی عیسوی میں جبکہ اس کا رسم الخط بنا تھا سے آج تک 1360 سال گزر جانے کے باوجود بھی ایک جیتی جاگتی جدید زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کی وجہ تبتی لوزاوا عالموں کے وقتاً فوقتاً اس زبان کی درستی ونظر ثانی کرتے آئے ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی سے لے کر آج تک اس زبان پر کئی بار نظر ثانی کی گئی ہے۔پہلی نظر ثانی 180 سال کے بعد نویں صدی عیسوی میں کی گئی۔دوسری نظر ثانی دسویں صدی عیسوی کے آخر سے پندرہویں صدی عیسوی کے شروع تک 470 سالوں سے زیادہ عرصے کے دوران 163 مشہور تبتی عالموں نے سلسلہ وار اور وقتاً فوقتاً اس پر نظرِ ثانی کرتے رہے ہیں۔

شروع سے آخر تک کی ہر نظر ثانی کے دوران تھونمی سمبھوٹا کے گرائمر کے قاعدہ کو مقدم رکھ کر مرے ہوئے لفظوں کو نکل کر بگڑے لفظوں کی درستی کرتے آئے تھے۔یہی وجہ ہے آج یہ زبان بہت پُرانی ہونے کے باوجود بھی ایک جیتی جاگتی عام فہم اور لاکھوں

کروڑوں لوگوں کی بول چال کی زبان بنی ہوئی ہے۔ بھوٹی زبان ہمالیہ خطے کے مغرب میں ریاستِ جموں وکشمیر کے لداخ سے لے کر مشرق میں اروناچل پردیش تک کے چھ ریاستوں اور بیرون ملک کے بھوٹان، مشرقی نیپال، تبت، نئی و پرانی چین، اندرونی و بیرونی منگولیا اور روس کے پانچ ری پبلک بُریت، قالمق، تُرفن، وغیرہ میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

لداخ، لاہول پتی، سکم، بھوٹان، درجے لنگ، اروناچل پردیش، مشرقی نیپال اور تبت میں یہ مادری زبان کے طور پر اور اندرونی و بیرونی منگولیا، چین اور روس میں یہ کلچرل اور مذہبی زبان کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ بھوٹی ہندوستان کی چھ ریاستوں اور بھوٹان کو ملا کر کُل 47,00000 لوگوں کی مادری زبان ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی 15 یونیورسٹیوں شملہ، ورانسی، شانتی نکیتن، کولکتہ، دہلی، چندی گڑھ، گھورکھپور، بودھ گیا، لیہہ لداخ، سارناتھ وغیرہ میں بھوٹی زبان کے شعبے کھولے گئے ہیں اور بیرون ملک فرانس، امریکہ، جرمنی، برطانیہ وغیرہ دُنیا کے ایک سو سے بھی زیادہ ملکوں میں بھوٹی زبان کے مختلف شعبے ہیں۔ جن میں یہ زبان تحقیقی مقاصد کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

بھوٹی زبان کے بہت سارے پرنٹنگ پریس بھی موجود ہیں۔ ریاستِ جموں وکشمیر کا پہلا چھاپ خانہ لداخ راجہ نماں نمگل کے دورِ حکومت میں لیہہ میں کھولا گیا تھا جس میں مذہبی کتابیں چھپتی تھیں۔ اس وقت کے چھاپ خانوں میں رتنا پرنٹنگ پریس، شیوام پرنٹنگ پریس، بوجیوری پرنٹنگ پریس، لیبزرین پرنٹنگ پریس، سکم پرنٹنگ پریس، جائد پرنٹنگ پریس دہلی، ساتنم پرنٹنگ پریس ورانسی اور ڈیرہ دھون پرنٹنگ پریس وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

بھوٹی زبان کے مخطوطات کی کئی شاندار لائبریریاں بھی موجود ہیں۔ جن میں سنٹرل انسٹی چیوٹ آف بدھسٹ سٹڈیز لائبریری لیہہ، نمگیل انسٹی چیوٹ لیبریری گانگٹوق، شانتی نکیتن لیبریری کولکتہ، جیا شوال لیبریری پٹنہ، سرسوتی لیبریری دہلی۔ سنسکرت یونورسٹی لیبریری وراناسی اور ہمالیہ رجن کے تمام گونپوں کی 7000 لیبریریاں قابلِ ذکر ہیں، جن میں لاتعداد کتابیں موجود ہیں۔ کئی کئی کتابیں سونے اور چاندی ہرے موتی پرو کر

لکھی گئی ہیں اور چند ایک کتابیں 20 کلو سے بھی زیادہ وزن کی ہیں۔ حال ہی میں گونپوں کی لیبریریوں سے کئی قیمتی کتابوں کو محفوظ و بہتر طریقے سے رکھنے کے لئے لداخ ہل کونسل اور دہلی نیشنل میوزیم کے اشتراک سے لداخ کے 18 بڑے گونپوں کے 18 لاسے اور پانچ پڑھے لکھے نوجوانوں کو دہلی میں 10 دِنوں کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی۔

ریڈیو سٹیشن لیہہ، شملہ، سکم، توانگ، دہلی، گانگتوق وغیرہ سے بھوٹی زبان میں خبریں باقاعدہ طور پر نشر ہوتی ہیں اور ریاست کا سب سے پہلا اخبار بھی 1906ء صدی عیسوی میں لیہہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کا نام "لداخ اخبار" اور "فونیا" تھے۔ بھوٹی زبان میں ہر قسم کی تخلیقی کام ہوتے ہیں۔ اس وقت لداخ میں بھوٹی زبان کے کئی قابل و نامور عالم اور درجنوں قلم کار موجود ہیں اور ان کے لیہہ سے شائع ہونے والے جدید اخبار اور رسالوں میں ریکپیے دورژی، لداخ ناڈا، تانگ پا، سینگے کھابس، ریگ ذوت، لداخ فونیا اور ہمالئے سیونگ یاگس رسالے اور اخبار "لداقس سرگیور" وغیرہ اور کلچرل اکاڈمی کا شیرازہ اور سال نامے ہیں۔ اس کے علاوہ پہلی سے بارھویں کلاس تک کی بھوٹی زبان کی کتابیں بنی ہیں اور تمام اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

حوالے:

1. Tibetan Book about language development and reforms-Tungkar

2. Tibetan 3rd book about Tibetan literature, by: Rev. Mugey Samstan

3. Importance of Bhoti language, paper presented in the 6th International calloquium, by: Chhimet Namgyal.

4. Bhoti language and its importance (Magazine) Published by CIIL Mysore, NBCA, Delhi.

☆☆☆

☆......کے ڈی مینی

کشمیر اور گجر

۱۴-۱۵ راگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کو انگریزوں سے آزادی ملی اور مُلک بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہوگیا۔ اس تقسیم کے ساتھ ہی ساتھ ریاستِ جموں و کشمیر کو سیاست کی نظر لگ گئی۔ یہ مسئلہ اقوامِ متحدہ تک پہنچا اور پھر پہلی جنوری ۱۹۴۹ء کو اقوام متحدہ کی مداخلت سے جنگ بندی نافذ ہوئی اور ریاستِ جموں و کشمیر دو حصوں میں بٹ گئی اور بیچ میں حدمتارکہ قائم ہوئی گئی۔ یہ حدمتارکہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی ہندو پاک جنگ کے بعد ۱۱ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو حقیقی کنٹرول لائن میں تبدیل کردی گئی۔ ۶۴۸ کلومیٹر لمبی یہ حقیقی کنٹرول لائن صوبہ جموں کے علاقہ چھمب سے شروع ہو کر علاقہ راجوری سے گزرتی ہوئی پرانی ریاست پونچھ کو دو حصوں میں بانٹتی ہوئی گلمرگ، اوڑی، ٹیٹوال، کرنا، گریز اور تلیل کی پہاڑیوں کو چھوتی ہوئی دراس، بٹالک اور ترتک کی سربلند چوٹیوں سے آگے بڑھتی ہوئی سیاچن گلیشر میں گُم ہوجاتی ہے۔ حقیقی کنٹرول لائن کو بیشتر حصہ خطۂ پیر پنچال کو دو حصوں میں بانٹتا ہے۔ کیونکہ جھمبھ میر پو، کوٹی، باغ، سدھنتی، اور مظفر آباد کے علاقے ایل اوسی کے اُس پار رہ گئے جبکہ اوڑی، ٹیٹوال کرناہ، حویلی ، مینڈر، راجوری اور بدھل تک پیر پنچال کا بالائی حصہ ریاستِ جموں و کشمیر کے اس طرف واقع ہے۔ یہی وہ علاقے تھے جنہیں گجروں نے آباد کیا۔ گاؤں اور شہر بسائے اور صدیوں صدیوں سے ہمسایہ طبقوں کے ساتھ مل جُل کر رہ رہے تھے۔

ایک ایسی تقسیم جس نے گھروں اور خاندانوں کو ہی نہیں ان قبائل کی سوچوں اور

امنگوں کو بھی دو پھاڑ کر دیا۔ حالانکہ کنٹرول لائن کے اُس پار بھی یہی گجر بکروال قبائل اور ہمسایہ طبقے آباد ہیں۔ دونوں طرف لوگوں کی زبان ایک جیسی ہے۔ رہن سہن، لباس، ثقافت اور خوراک ملتی جلتی ہے۔ خوشیاں اور غم، دُکھ اور سُکھ سانجھے ہیں۔ دونوں اطراف کے ان قبائل کی آپس میں رشتے داریاں ہیں۔ صدیوں کا ساتھ ہے ماضی کے سائے اُن کا تعاقب کر رہے ہیں۔ ان حالات نے گجر بکروال قبائل کی اقتصادی، سماجی اور سیاسی زندگی پر سخت وار کئے ہیں۔

ہندوستان میں گجر:

ہندوستان کے مختلف صوبوں یعنی راجستھان، گجرات، ہریانہ، ہماچل پردیش، یوپی اور جموں و کشمیر میں ہندو گجروں کے ساتھ ساتھ مسلمان گجر بھی آباد ہیں۔ ہندو اور مسلمان گجروں کی آپس میں لسانی، تہذیبی اور ثقافتی و تاریخی مماثلت ہے۔ ان کی ذاتیں اور گوتیں[1] آپس میں ملتی جلتی ہیں۔ اس لئے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں بسنے والے گجر مذہب کے تضاد سے اُوپر اُٹھ کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک ہی خاندان یا قبیلے کے بچھڑے ہوئے آدمیوں کی طرح آپس میں گھی شکر ہو جاتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ گجروں میں برداشت، تحمل اور ایک دوسرے کے مذہب اور جذبات کی قدر کرنا رہی ہے۔ چونکہ مسلمان گجروں کی سب سے بڑی تعداد ریاستِ جموں و کشمیر میں مقیم ہے اور یہاں کے گجر مذہبی، روحانی اور سماجی و سیاسی رہبری باباجی صاحب کے دربار وانگت شریف کے سجادہ نشینوں سے حاصل کرتے ہیں جو اسلام کے سچے اصولوں کے ساتھ صوفیانہ بھائی چارے، رواداری اور مذہبی یگانگت کا درس بھی دیتے رہے ہیں۔ اس لئے اُنہوں نے ریاست کے گجروں کے یہ ہندوستان کے ہندو گجروں کے ساتھ دوستی اور محبت کے رشتے استوار کرنے میں بڑا اہم کام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سجادہ نشین حضرت میاں نظام الدین لاروی (۱۸۹۷ء تا ۱۹۷۳ء)

---

[1] ریاست جموں و کشمیر میں بھی ہندوؤں اور مسلمان گجروں کی کچھ ذاتیں مشترکہ ہیں، جیسے، کوہلی، بالی، سُودو غیرہ مگر ہندو اپنے آپ کو گجر نہیں لکھتے۔

اور حضرت میاں بشیر احمد لاروی جتنے ریاست کے گجروں میں معتبر اور مذہبی رہنما مانے جاتے ہیں اُتنے ہی ہندوستان کے گجروں میں بھی مقبول ہیں اور ہندوستان کے گجر انہیں اپنی قوم کا سردار سمجھتے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر کے گجر:

ریاستِ جموں وکشمیر مختلف نسلوں، ذاتوں اور فرقوں کا ایک گلدستہ ہے جس کا ہر پھول اپنی مہک اور زیبائی کے باعث اس گلدستے کے حُسن کو دوبالا کرتا ہے۔ ایک طرف جغرفیائی طور پر ریاست تین خطوں پر مشتمل ہے۔ تو دوسری جانب سماجی طور پر یہاں کے قبائل اس ریاست کو کسی قالین میں کڑھے گئے مختلف رنگوں کے پھولوں کی طرح سجاتے ہیں۔ لداخ میں چانگپا، دُرکپا، بڑکپا، بھول بوٹو شینا بلتی اور درری قبائل آباد ہیں تو وادیٔ کشمیر میں کشمیری مسلمان اور کشمیری بنڈتوں کے علاوہ گجر بکروال قبائل ۔۔۔۔۔ ہفت رنگ تہذیب سے اِسے خوبصورت بناتے ہیں اور صوبہ جموں میں ڈوگری اور پہاڑی طبقوں کے علاوہ خطہ پیر پنچال میں گُجر بکروال قبائل ہمسایہ طبقوں کے ساتھ مخصوص طرزِ زندگی کے باعث اپنی منفرد پہنچان بنائے ہوئے ہیں۔[1]

کیا گجر ریاست کے مقامی باشندے تھے:

گُجر قوم کی ریاست جموں وکشمیر میں آمد کے بارے میں مختلف آرائیں۔ کچھ گُجر موٴرخ ان کو ریاست کے قدیمی باشندے مانتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ راج ترنگنی میں کشمیر کے حوالے سے جس کھش قوم کا ذکر آیا ہے، وہ دراصل گُجر ہی تھے جو آگے چل کر کھش سے کھشان اور کھشان سے کسانہ ہوئے۔ زمانہ قدیم میں یہ قبائل بڑے زبردست اور مطیع نہ ہونے والے تُند مزاج لوگوں کا گروہ تھے جن کا مرکز علاقہ راجوری میں وادی بدھل تھا۔ ابوالقام کی تاریخ فرشتہ اور البیرونی کی کتاب الہند کے مطابق محمود غزنوی کے ۱۰۱۵ء اور ۱۰۲۱ء میں کشمیر پر حملے کی ناکامی کا سبب پونچھ کے وہ کھش قبائل تھے جنھوں نے راجہ ترلوچن پال کی

1. گجر۔ گوجری زبان وادب۔ رام پرساد کھٹانہ

رہبری میں قلعہ لوہر کوٹ پونچھ میں خیمہ زن ہوئے دو ماہ تک سلطان محمود کا سامنا کیا اور اُسے واپس غزنی جانے پر مجبور کیا تھا۔

تاریخ گرجر کے مطابق چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں لوہر کوٹ پونچھ کے حکمران جہانگیر باگڑی، ابدال باگڑی، ابراہیم باگڑی اور حسین باکڑی نے کشمیر میں سلطانوں کی حکومت بنانے اور مٹانے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔

کشمیر کے مورخ جہانگیر باگڑی اور اُس کے جانشینوں کو ماگرے یا ماکرے لکھتے ہیں۔ جبکہ اے۔ ایس سٹین راج ترنگنی میں لکھے گئے ناموں پر تحقیق کرتے ہوئے ماگروں کو مارگیسا قبائل بتاتے ہیں۔ سنسکرت میں مارگیسا کے معنی درّوں کے نگہبان کے ہوتے ہیں۔ چونکہ اُس زمانہ میں گجروں اور دوسری قوموں میں کوئی لیکر نہیں ہوتی تھی اس لئے ایسا لگتا ہے کہ مارگیسا قبایل کے جو لوگ پیر پنچال کے پہاڑی درّوں سے کشمیر کی طرف چلے گئے وہ کشمیری کلچرل کا حصہ بن گئے اور ماگرے یا ماکرے کہلانے لگے جبکہ وہ حصہ جو پیر پنچال کی جنوبی تہلٹیوں میں آباد ہوا وہ مقامی کلچر میں خلط ملط کر باگڑی کہلانے لگ پڑا۔ پھر درّوں کے آر پار بولی جانے والی زبانوں نے اُن کو جُدا کر دیا۔ آج بھی علاقہ لوان سرن کوٹ اور بدھل میں باگڑی گجر آباد ہیں۔[1]

گجروں کی گجرات سے کشمیر میں آمد:

مورخوں کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جو اس خیال کا حامی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں گُجر زمانہ قدیم کے علاوہ ۱۵۸۶ء مغلوں کے کشمیر پر حملہ کے بعد یہ قبائل، پنجاب کے علاقہ گجرات اور اس کے نواحی علاقوں سے کثیر تعداد میں مغل قافلوں اور شاہی کاروانوں کے ساتھ ملازم کے طور پر کشمیر کی طرف آئے اور یہاں کے معتدل موسمی حالات سے متاثر ہو کر یہیں کے ہو کر رہ گئے اور کشمیر کی طرف جانے والی شاہراہوں یعنی مغل روڑ۔ شاہراہ توس

---

1. تاریخ گرجر، رانا علی حسن چوہان، راج ترنگی، کلہن، History of Kashmir by NPK Baazi.

میدان اور بدھل پیرو ننڈن سر کے راستوں کے ساتھ ساتھ اقامت گزین ہوتے گئے۔ اُس زمانے میں گجرات اور بھمبھر کے راستوں سے ہی شاہی قافلے کشمیر جایا کرتے تھے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ شاہی افواج کے ساتھ ملازم یا کسی دوسری حیثیت سے یہ لوگ گجرات سے اس طرف آئے ہوں۔ کیونکہ آج بھی یہ لوگ اِن ہی راستوں کے ساتھ ساتھ پونچھ اور راجوری کے علاقہ تھنہ بدھل، سورن کوٹ، مینڈر منڈی وغیرہ میں ان لوگوں کی غالب اکثریت آباد ہے۔ اس لئے یہ بات تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ پونچھ راجوری کے گُجر زیادہ تر گجرات سے آئے ہیں۔ ان علاقوں میں گجروں کی ذاتیں اور گوتیں بھی وہی ہیں جو گجرات کے گجروں کی ہیں۔

کشمیر کے گجر بکروال:

کشمیر کے علاقہ میں مقیم گجروں کا حسب نسب سیدھے طور پر گجرات سے نہیں جڑتا۔ وادیٔ کشمیر میں کرناہ، اوڑی، ٹیٹوال، گریز اور تلیل کے پہاڑی سلسلے مظفر آباد، وادیٔ نیلم اور وادیٔ کانمان سے ملتے ہیں۔ اکثر مورخین اس خیال سے متفق ہیں کہ ان علاقوں میں گُجر بکروال قبائل اور قبیلے ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ اور وادیٔ کانمان سے آئے ہیں۔

ضلع ہزارہ سے کشمیر کی طرف پیش قدمی:

موجودہ پاکستان کا صوبہ خیبر پختون خواہ کے ضلع ہزارہ عہد قدیم میں گجر قوم کا ایک بڑا مرکز اور اہم پڑاوٴ مانا جاتا تھا۔ مہم جو گجروں کے قافلے اور کارواں پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں افغانستان سے کوہ سلمان کے راستے ہندوستان کی طرف بڑھے تو انہوں نے ہزارہ کو اپنا مرکز اور آگے مہم کے لئے ایک اہم پڑاوٴ کے طور پر اپنایا۔ اس لئے پرانے وقتوں سے ہی گجر ضلع ہزارہ میں کسی نہ کسی صورت میں غالب اور قابض رہے ہیں۔ آج بھی اس ضلع مین گجر اپنے تاریخی اور ثقافتی پس منظر کے ساتھ آباد ہیں اور گجروں کی 101 ذاتوں اور گوتوں میں سے 45 گوتیں ہزارہ میں پائی جاتی ہیں۔ اس ضلع میں گجروں کے علاقے تحصیل ہری پور اور تحصیل مانسہرہ مانے جاتے ہیں۔ وہاں یہ لوگ بڑے بارسوخ، معتبر اور

1. گجر، گوجری زبان و ادب تحریر رام پرساد کھٹانہ، تاریخ گرجر، رانا علی حسن چوہان، اقبال عظیم ایک ملاقات

آسودہ حال زمین دار کے طور پر اپنی پہچان رکھتے ہیں اور ریاست کشمیر کے پرانے ضلع مظفر آباد کے ساتھ ساتھ تحصیل مانسہرہ کی وادی کاناں میں گجر بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ان لوگوں کے لباس، مشاغل، فطرت، خدوخال، زبان، خوراک اور تہذیبی علامتیں وہی ہیں جو وادیٔ کشمیر کے مغربی پہاڑی علاقوں میں آباد گجروں کی ہیں اور بکروال گجروں کی بستیاں اور قبیلے مانسہرہ اور کاناں کے پہاڑی علاقوں اور جنگلوں کے نزدیک چراہ گاہوں اور گھاٹیوں میں آباد ہیں اور سردیوں و گرمیوں میں نقل مکانی کرتے ہیں، جیسے ہمارے ریاست میں بکروال طبقے کرتے ہیں۔ کاناں اور مانسہرہ میں بکروال گجروں کی کچھ مخصوص ذاتیں ہیں جو گجرات اور ہندوستان کے دوسرے گجروں میں نہیں پائی جاتیں۔

وقت[1] کے ساتھ ساتھ گجر بکروال کاناں وادی اور مانسہرہ کے علاقے سے کشمیر کی طرف پیش قدمی کرنے لگے، مظفر آباد اور وادی نیلم سے ہوتے ہوئے شمس بری، قاضی ناگ، دبن ڈون گریز اور تلیل کے پہاڑی علاقوں اور جنگلوں کے نزدیک چراہ گاہوں میں اپنے قدم جمانے کے بعد اوڑی، کرناہ، ٹیٹوال، لولاب، بانڈی پورہ، کنگن، وانگت، داچی گام اور سونہ مرگ تک پھیل گئے اور پھر یہ قبائل روزگار کی تلاش میں وادیٔ کشمیر کے میدانی علاقوں میں بھی آئے جہاں کشمیری لوگوں کے ساتھ ساتھ ان کی چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی موجود ہیں۔ چہرے بشرے، خدوخال، لباس، لمبی داڑھیوں، ستوان ناک، فراخ ماتھے، چوڑی، پتلے اور لمبے قد بُت کے لحاظ سے کشمیر کے بکروال گجر ہزارہ، پشاور اور افغانستان کے لوگوں سے مماثلت رکھتے ہیں۔[2]

ریاست کے گجر دانشور اقبال عظیم کے خیال میں وادیٔ کشمیر میں گجروں کی اکثریت وہ ہے جو ضلع ہزارہ مانسہرہ اور کاناں کے علاقوں سے ہجرت کر کے آئے لیکن ان کا

۲ گجر گوجری زبان و ادب، تحریر رام پرساد کھٹانہ،

Gujjars of Jammu and Kashmir by Prof. K. Warkoo,

۲ History of Punjab by Conneguous.

Gujars of Jammu and Kahsmir by K. Workoo

Iqbal Azam, a discassion

ماخذ بھی گجرات سے ہی ملتا ہے۔ اُن کے مطابق افغانستان اور پشاور کی طرف سے آگے بڑھنے والے مہم جو گجر ہزارہ کو روندتے ہوئے گجرات آگئے اور گجرات کو اپنا مرکز بنالیا پھر صدیوں تک گجرات اور اس کے نواحی علاقوں میں گُجر قوم کا ڈنکا بجتا رہا اور یہ لوگ بلا کھٹکے ان علاقوں پر قابض رہے۔ لیکن اٹھارویں صدی عیسوی میں جب پنجاب میں سکھوں کو عروج ملا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی فتوحات شروع کیں تو سارا پنجاب اُس کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس طرح علاقہ گجرات بھی افراتفری، تشدد، اتھل پتھل اور جنگ و جدل کا شکار ہوگیا۔ حالات سے بیزار ہوکر گجرات میں علما نے جہاد شروع کیا اور مقابلے پر نکلے ان علما میں ایک ولی بابا صدری صاحب بھی تھے۔ اُن کا اصل نام صلاح الدین بجراں تھا۔ وہ ایک عرصے تک گجرات میں مخالفوں کے خلاف جہاد کرتے رہے اور سینکڑوں لوگ شہید ہوگئے۔ ایک دو بدو لڑائی میں حضرت صدرالدین کی گردن پر بھی تلوار لگی اور خون کے فوارے بہہ نکلے لیکن وہ پھر بھی برسرِ پیکار رہے اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جہاں میں گر جاؤں وہیں میری قبر ہوگی۔ چنانچہ سکھوں کے ساتھ لڑتے لڑتے ہزارہ کے پہاڑی علاقے کی طرف رُخ کرلیا اور پیروکاروں کے ساتھ جب وہ تحصیل مانسہرہ کے علاقہ سنجوڑہ کے قریب پہنچے تو اُن کا جسدِ خاکی گھوڑے سے نیچے آ گرا۔ مریدوں اور پیروکاروں نے اُن کی تربت وہاں ہی بنادی اور اُس کے آس پاس اپنی بستیاں قائم کرلیں۔

دھیرے دھیرے گجروں کے خاندان گجرات کے دنگے فساد سے تنگ آ کر اس پہاڑی علاقہ میں آنے لگے اور پھر یہیں مقیم ہوگئے جس میں بجران گُجر اکثریت میں تھے۔ اس قبیلہ کے لوگ اکثر ضلع ہزارہ اور پشاور میں ملتے ہیں۔

حضرت صلاح الدین ولی کے دستے میں حضرت میاں جلالی بھی تھے جن کا اصلی نام غلام محمد تھا۔ جلالی اس لئے کہتے تھے کہ اُن کے چہرے سے نور اور جلال ٹپکتا تھا۔ وہ نہایت خوبصورت، باہمت، مردِ میدان تھے۔ بجران قبیلے کے لوگ اپنا شجرہ نسب حضرت میاں جلالی سے ہی ملاتے ہیں۔ دربار شریف وانگت کے سجادہ نشین میاں بشیر صاحب کے اقوال

کے مطابق گُجر قوم کا رشتہ عرب کی بدُو قوم سے جڑتا ہے۔جن کی عرب میں حکومتیں رہی ہیں۔آپ کے مطابق اس قبیلے کے لوگ عرب میں آج بھی اونٹ اور بھیڑ بکریاں پالتے ہیں، پشتو کا استعمال کرتے ہیں اور آسودہ حال ہیں اور سعودیہ میں جو خاندان اقتدار میں ہے اُس کا تعلق بھی بُدو قبیلے سے ہی ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اپنے ریوڑ اور اہل خانہ کے ہمراہ عرب سے نکل کر وسطِ ایشیا اور جنوبی ایشیا کی طرف آئے اور چراہ گاہوں کی تلاش میں پشاور، راولپنڈی، ہزارہ اور کچھا کے مقام پر بکروال گجر پہلے پہل آباد ہوئے۔ان میں سے کچھ قبیلے موسم گرما میں مظفر آباد نیلم اور تلیل کے پہاڑوں میں واقع مرغزاروں تک آیا کرتے تھے اور ڈاچی گام تک پڑاو ڈالتے تھے اور بہار کے آغاز میں بکروالوں کے یہ قافلے سُمبل، بارہمولہ کے راستے واپس اپنے آبائی گاؤں کی طرف جاتے تھے۔اسی دوران تلیل اور کنگن کے علاقہ میں کچھ بکروال قبائل نے موسم گرما میں بھی قیام شروع کر دیا۔کھیتی باڑی کے لئے جنگلوں کے نزدیک زمین آباد کیں اور رہائش کرنے لگے۔ان مقامات پر بکروال قبائل اپنے ریوڑوں کا کچھ حصہ کشمیر کے تاجروں کو بیچتے اور خریدتے بھی تھے اور سرما کے دِنوں میں یہ لوگ وادئ نیلم دراوہ اور مظفر آباد کے علاقوں کو عبور کرنے سنجوڑہ، کانماں، راولپنڈی اور ایبٹ آباد تک جاتے تھے۔سنجوڑہ کا علاقہ تحصیل مانسہرہ میں پڑتا ہے اور وادئ کانماں میں واقع ہے جو بالاکوٹ قصبے سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔میاں بشیر صاحب کے مطابق سنجوڑا کے بکروال قبائل عرب کے قبائل کی نسل سے ہیں اور بدُو قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ان قبائل کے پشاور اور افغانستان میں جلال آباد، قندھار اور کابل کے گردونواح کے بکروالوں سے بھی کڑیاں جڑتی ہیں۔وانگت کے اکثر لوگ بتاتے ہیں کہ وہ یاغستان سے آئے ہیں۔اس طرح یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ کشمیر میں آباد بکروال گجروں کی اکثریت کا ماضی پشاور، افغانستان اور ہزارہ سے جڑا ہوا ہے۔ان لوگوں کے چہرے بُشرے، خدوخال چھ فٹ سے اوپر، قدبت اونچی ناک، گورا رنگ، چہروں پر جلال، فراخ ماتھے، چوڑی چھاتیاں اور ان کے پہناوے صوبہ سرحد اور افغانستان کے لوگوں سے ملتے

ہیں۔اُن قبائل کی طرح ہی یہ لوگ گوشت خور ہیں۔مکی کا استعمال کرتے ہیں۔تندور جلاتے ہیں۔سر پر لنگی اور کلاوہ کا استعمال کرتے ہیں۔عورتوں کا تاجکستانی ٹوپی پہننا اور افغان عورتوں کی طرح لمبی چوڑی چھنٹ دار چادر سے سرڈھانپنا اور مردوں کا لمبی قمیض، ڈھیلی شلوار پہننا، لمبی داڑھیاں اور رعب طنطنے اور مزاج کے لحاظ سے بھی یہ قبایل سرحد اور افغانستان سے مشابہ ہیں۔اُدھر بکروال گجروں کی اکثر ذاتیں (جن میں بجران بھی شامل ہیں) ایسی ہیں جو صرف صوبہ سرحد اور افغانستان کے علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔اس طرح میاں بشیر صاحب اور اقبال عظیم کی رائے زمینی حقائق سے مطابقت رکھتی ہے اور کشمیر کے بکروال گجروں کے حسب نسب کا صحیح تعین کرتی ہے۔[1]

ریاست کے کہناری بکروال گجر:

وادیٔ کشمیر میں گجروں کے بہت سے نسلوں کے قبائل آباد ہیں۔جو مختلف سمتوں سے کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں سکونت پذیر ہوئے۔جیسے کوہستان سوات کی طرف سے آنے والے الائی وال بکروال، گجرات اور پونچھ راجوری کی طرف سے آنے والے پونچھی گجر، بھینس پال کر روزی روٹی کمانے والے نہارہ گجر اور دودھی گجر وغیرہ۔لیکن ان تمام قبائل میں کہناری بکروال گجروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے جو تلیل، گریز، سونہ مرگ، کنگن، وانگت، ڈاچی گام، لار، لپا وادی ٹیٹوال، چوکی بل، کرناہ اور اوڑی کے علاقوں میں آباد ہوکر کشمیر کے ضلع اننت ناگ، شوپیان اور پہلگام کے بالائی علاقے تک پھیلتے چلے گئے۔[2]

ان بکروال گجروں کے ساتھ کہناری کا لفظ علاقے کی مناسبت سے جڑا ہوا ہے۔ کہناری موجودہ پاکستان کے صوبہ خیبر پختون خواہ کے ضلع ہزارہ کے شمالی علاقہ جات کو وادی کہنار، وادی بھوگڑ منگ اور وادی کونش کہتے ہیں۔ جہاں سے ترکِ سکونت اور نقل مکانی

---

[1] بابا میاں بشیر احمد لاوری صاحب سے ایک گفتگو

[2] گجر۔گوجری زبان وادب، تحریر رام پرساد کھٹانہ

کر کے یہ لوگ وادیٔ کشمیر میں آئے کہناری علاقہ دریائے کانماں کے ساتھ ساتھ پڑے ہے۔ یہ دریا کانماں کے پہاڑوں سے نکل کر علاقہ دراوہ سے ہوتا ہوا مظفر آباد اور کوہالہ کے درمیان ایک مقام پر دریائے جہلم سے آملتا ہے۔ اس دریا کے ساتھ ساتھ واقع پہاڑوں، جنگلی علاقوں اور وادیوں کو کہنار کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دریائے سرن، ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ کے شمالی پہاڑی علاقوں سے نکل کر علاقہ پکھلی اور تناول کو سیراب کرتا ہوا، تربیلہ کے پاس دریائے سندھ کے ساتھ آملتا ہے۔ یہ دریا دو مختلف دروں سے گزرتا ہے جن کے مشرقی حصے کو بھوگڑ منگ کہتے ہیں اور مغربی درّے کو کونش کہتے ہیں۔ یہ تینوں درّے یعنی درہ کہنار، درہ بھوگڑ منگت اور درہ کونش ملحقہ ہیں اور ان کا علاقہ مشرق کی سمت سے مظفر آباد اور مغرب کی طرف دریائے سندھ سے ملتا ہے۔ یہ تمام پہاڑی علاقے جو وادیوں، جنگلوں اور ندی نالوں پر مشتمل ہیں یہاں سے گجر بکروال اپنے آپ کو کہناری بکروال کہتے ہیں تاکہ کہیں بھی سکونت کریں ان کے اصل وطن کی پہچان واضح رہے۔[1]

ریاستِ جموں و کشمیر میں گجر بکروال قبائل نے مختلف ادوار اور مختلف سمتوں سے آکر سکونت اختیار کی۔ کچھ گجر وہ بھی تھے جو علاقہ پیر پنچال کے اصل باشندے تھے۔ کھش قبائل کہلاتے تھے اور جن کے تاریخی کارنامے کلہن کی راج ترنگنی میں درج ہیں۔ یہ قبائل تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں دین اسلام کے عروج کے وقت مشرف بااسلام ہوئے۔ اُدھر گجرات اور اس کے نواحی علاقوں میں آباد گجروں کے ایک گروہ نے کسی سخت قحط سالی، موزی بیماری یا پھر علاقے میں افراتفری کے باعث کشمیر کے پہاڑی علاقوں کی طرف رُخ کیا اور پھر سولھویں صدی عیسوی میں گجروں کی کثیر تعداد مغلوں کے شاہی کاروانوں کے ساتھ بطورِ ملازم کشمیر کی طرف آئے یہاں کے خوبصورت علاقوں اور موسمی حالات کی وجہ سے یہاں کے ہی ہو کر رہ گئے اور دھیرے دھیرے اُس وقت کشمیر کی طرف جانے والی شاہراہ مغل روڈ کے آس پاس آباد ہوتے چلے گئے جن کی اکثریت علاقہ پونچھ اور

[1] گجر۔ گوجری زبان وادب، تحریر رام پرساد کھٹانہ

راجوری میں آباد ہے۔ دوسری جانب کشمیر کے مغربی پہاڑی سلسلوں میں وادی کاغان کے بکروال گجروں نے چراہ گاہوں کی تلاش میں گریز، تلیل، قاضی ناگ، پانڈو، دبن دون اور شمش بری وغیرہ پہاڑوں کی طرف پیش قدمی کی اور پھر وادی کے اندر پھیلتے چلے گئے۔[1]

ریاست[2] میں گجر بکروال قبائل کی گوتوں اور ذاتوں کے حساب سے ٹھوس جتھے بندی تھی۔ قبیلوں کے براگ سردار یا چوہدری کہلاتے تھے اور اُن کا حکم ہی قبیلے کے لئے قانون ہوتا تھا۔ اس طرح ریاست میں ان کے سینکڑوں قبیلے تھے۔ اگر چہ ان قبیلوں کا آپس میں زبان، تہذیب، نسل اور مذہب کا رشتہ تھا، لیکن کوئی تال میل نہ تھا۔ اکثر قبائل چراگاہوں اور مرگوں کی ملکیت کی بنا پر آپس میں جھگڑتے تھے اور پھر نسل دشمنی پالتے تھے۔ ان قبائل کی اکثریت ناخواندہ تھی۔ اگر چہ دین اسلام پر یقین تھا مگر اسلام کے اصل اصولوں سے نابلد تھے، تاہم پرستی وہموں اور مقامی عقیدوں کے اثرات کے باعث ان کے وطیرے اور اعمال اسلام کے اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اُدھر اٹھارھویں صدی عیسوی میں سکھوں کی یلغاروں، ۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے کشمیر پر قبضے کے وقت گجروں پر سختیوں اور پھر ۱۸۴۶ء کے معاہدہ امرت کے بعد دوگرہ شاہی کے شخصی راج کی ستم رانیوں نے انہیں مایوسی اور سراسیمگی کی حالات میں ڈال دیا تھا۔ اس لئے سماج میں نہ تو اُن کی کوئی حیثیت تھی، نہ طاقت کی مرکزوں تک رسائی۔ سیاسی نمائندگی نہ ہونے کی وجہ سے کہیں بھی اُن کے مسائل اور مصائب کی شنوائی نہ ہوتی تھی اور یہ محکوم اور غریب در غریب ہوتے چلے گئے اور ان لوگوں کے پاس چند بکریوں، تھوڑے سے برتنوں کے علاوہ بے انتہا غربت، بے انتہا پسماندگی، بے انتہا ظلم وجبر اور بیگار اور سماجی نابرابری ان کے حصے میں آئی تھی اور دوسری جانب یہ قبائل شاہکاری، ذیلداری اور جاگیرداری سسٹم کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ ساہوکاروں،

1۔ گجر، گوجری زبان وادب، تحریر رام پرساد کھٹانہ
Gujjars of Jammu and Kashmir by K. Warkoo

2۔ چوہدری اقبال عظیم، میاں ارشاد احمد ایک گفتگو

خوجوں اور سُود خوروں نے ان کی زمین کا اناج بچوں کی اُمنگ اور نوجوانوں کی محبت پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ اس شخصی راج میں ہل چلاتے ہوئے کامگار چرواہے اور چوپان گھیسٹ کر بیگار پر بھیج دیتے تھے۔ چونکہ کشمیر کے عوام انگریز سرکار سے خریدے گئے تھے۔ اس لئے اِن زر خرید غلاموں کی کوئی زندگی نہ تھی۔ اُن کی کوئی عزت نہ تھی۔ اُن کے لئے کہیں انصاف نہ تھا۔ سرکاری اہلکار، خوجے اور بنیے سب ملکر اُن پر اس طرح جھپٹتے تھے جیسے گدھ مردہ جانوروں پر جھپٹا مارتے ہیں۔ اس طرح پکے ہوئے پھل، پکا ہوا حسن اور پکی ہوئی فصل ہر شے شاہکاری نظام، لگان، مالیے، تیرنی، محصول چنگی، اور سود خوری کی نظر ہو جاتی تھی۔

کہتے ہیں کہ کسی قوم پر جب ظُلم کی انتہا ہو جاتی ہے۔ اُس کے حاکم جابر ہو جاتے ہیں اور انصاف کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ تو پروردگار اپنے عدل کے دروازے کھولتا ہے اور کوئی نہ کوئی ولی، اولیا یا ایسی ہستی بھیجتا ہے جو مظلوم قوم کے لئے مسیحا بن کر آتی ہے۔ اُن کو بیدار کرتی ہے۔ حالات سے مقابلے کے لئے تیار کرتی ہے اور راہ حق پر چلا کر جینے کے آداب سکھاتی ہے، روحانی طاقت سے سرفراز کرتی اور ترقی کے راستوں پر ڈال دیتی ہے۔۔۔۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس دَور میں (اٹھارھویں صدی عیسوی میں) بکروال گجرات میں کشمیر سے دور مغرب کی طرف وادیٔ کانماں کے گاؤں سنجوڑہ میں ایک عظیم ولی اللہ اور روحانی شخصیت حضرت باباجیؒ صاحب کا ظہور ہوا۔ جنھوں نے ریاستِ جموں وکشمیر کے گجر، بکروال، قبائل اور پہاڑوں میں آباد دوسرے طبقوں کی زندگی میں انقلاب لایا۔ انہیں اسلام کے صحیح اصولوں سے روشناس کرایا اور وانگت شریف میں ہجرت کر کے روحانیت اور رہبری کا مرکز قائم کیا اور بے سہارا قوم کی شیرازہ بندی کی۔ جہاں ان قبائل کو دین اسلام کے حقیقی اصولوں کی طرف راغب کیا وہیں ریاست بھر کے گجر بکروال قبائل اور پہاڑی طبقے کی قیادت کی۔ انہیں ظلم کے خلاف لام بند کیا۔ اُن کی رہبری اور پذیرائی کی۔ انہیں منفرد پہچان اور شناخت عطا کی۔ اُن کا حوصلہ بڑھایا۔ اور ان قبائل کے اندر بُری عادتوں، بُرائیوں اور بدعتوں کے خلاف جہاد کیا اور تمام قبائل کو اکٹھا کر کے بند مُٹھی کی طرح مضبوط کر دیا۔ وہیں باباجیؒ

صاحب، گجر بکروالوں کے ساتھ ساتھ ہمسایہ طبقوں کی بھلائی اور بہبودی کے لئے بھی مصروف رہے۔ حضرت باباجی صاحبؒ کے وصال کے بعد حضرت میاں نظام الدین لارویؒ ۱۸۹۷ء تا سن ۱۹۷۱ء نے گجر بکروال قوم کی روحانی پیش وائی کے ساتھ ساتھ سیاسی رہبری کر کے اس قوم کا الگ تشخص قائم کیا۔ اُن میں دینی قوم تصور کے علاوہ دنیاوی جاگرتی کو بھی اجاگر کیا۔ جہاں دین کی تبلیغ کے سلسلے کو جاری رکھا، وہیں دوسرے غریب طبقوں کو ساتھ لے کر جاگیردارانہ نظام، شاہکاری سسٹم اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف اپنی قوم کی رہبری کر کے انہیں صف آرا کرتے رہے۔ آپ کی رحلت کے بعد دین کی تبلیغ اور قوم کی سربلندی کا بیڑا حضرت میاں بشیر احمد لاروی صاحب نے اٹھایا۔ ایک طرف پہاڑی علاقوں میں لوگوں کو باایمان بنانے کے لئے سیرت کانفرنسوں کا سلسلہ شروع کیا۔ سماجی بدتوں کے خلاف سینہ ٹھوک کر میدان میں اُترا تو دوسری جانب شاہی ایوانوں تک رسائی حاصل کر کے گجر بکروال قوم کو درجہ فہرست قبائل کے زمرے میں لایا جس کے باعث آج ریاست جموں وکشمیر کے یہ قبائل سر اٹھا کر چلتے ہیں۔ دوسری قوموں سے نظر ملا کر بات کرنے کے قائل ہوئے ہیں اور ترقی و بہبودی کے اُس راستے پر گامزن ہوئے ہیں جو روشن مستقبل کی طرف جاتا ہے۔

☆☆☆

☆......تنویر حسن

کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ۔ ایک جائزہ

پروفیسر عبدالقادر سروری کچھ مدت تک کشمیر یونیورسٹی میں استاد رہے۔ انھوں نے کشمیر میں فارسی ادب کی عہد بہ عہد ترقی پر ایک مبسوط کتاب بعنوان ''کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ'' تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ کو سمجھنے میں ایک سر چشمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جس کے بارے میں مصنف نے خود اشارہ کیا ہے:

> ''اس وسیع دور کے متنوع کارناموں کی تاریخ مرتب کرنے کا کسی کے ذہن میں اب تک خیال نہیں آیا تھا۔ کشمیر کے مورخین کی دلچسپی کی وجہ سے بہت سے شعراء کے بارے میں معلومات ضرور محفوظ ہوگئی ہیں جن سے استفادہ کر کے موجودہ دور کے کئی اصحاب نے کشمیر کے فارسی شعراء کے تذکرے لکھے ہیں لیکن یہ تذکرے بہت مختصر ہیں، عالموں اور ان کے کارناموں اور انشاء پردازوں کا تذکرہ مدون نہیں تھا۔''

اس کتاب کی ترتیب میں مصنف نے خواجہ محمد اعظم ددہ مری کی 'واقعات کشمیر' پیر غلام حسن کھویہامی کی ''تاریخ حسن'' اور غلام محی الدین مسکین کی تاریخ سے استفادہ کیا ہے۔ مصنف کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب دراصل جموں و کشمیر میں اردو ادب کی

تاریخ کے منصوبے کا ایک حصہ تھی۔

مذکورہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب ''تاریخی پس منظر'' میں ابتدا سے لے کر ڈوگروں تک کشمیر کی تاریخ کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب ''آغاز سخن'' میں کشمیر میں فارسی کے رواج، وسط ایشیاء سے سیاسی اور سماجی تعلقات، کشمیر میں اسلام کی آمد، فارسی کی ہمہ گیری وغیرہ موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ تیسرے باب ''کشمیری سلاطین ۔۔ابتدائی عہد'' سے بارھویں باب ''موجودہ دور'' تک فارسی ادب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف نے اس طرح اس تصنیف میں فارسی ادب کی تاریخ کو اپنے زمانے تک قلم بند کر دیا ہے۔ باب اوّل ''تاریخی پس منظر'' میں مصنف نے کلہن کی تاریخ سے اخذ و استفادہ کر کے کشمیر میں اسلام سے پہلے کی تاریخ قلم بند کی ہے۔ مصنف نے کشمیر کی وجہ تسمیہ پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''قدیم ترین روایات کی رو سے کشمیر کی ساری وادی ایک وسیع جھیل تھی جو ستی سر کے نام سے موسوم تھی اور آبادی صرف پہاڑوں پر مرتکز تھی۔ ستی سر جھیل پیشاچوں، ناگوں اور یاکشوں کا مسکن تھی۔ ان کا سردار جلوبھویا جل دیو لوگوں کو بہت دق کیا کرتا تھا آخر لوگ اپنے سردار کشپ ریشی کے پاس، جل دیو کے مظالم کی شکایت لے کر گئے۔ کشب ریشی نے اندر دیوتا سے مدد طلب کی اور انہوں نے بارہ مولہ کی پہاڑیوں میں اپنا رتھ چلا کر پہاڑوں میں راستہ پیدا کر دیا جس سے جھیل کا سارا پانی بہہ گیا۔ جل دیو اور پیشاچ مارے گئے اور لوگوں کی بود باش کے لئے ایک نئی وادی اور ایک نیا گلزار نکل آیا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نئی سرزمین کا نام کشب ریشی کے نام پر ''کشب میرا'' پڑ گیا جو رفتہ رفتہ کشمیر میں تبدیل ہو گیا۔''

مصنف نے کشمیر کی تاریخ کا آغاز گونند اوّل سے کیا ہے اور گونند دوم کے بعد اس

بات کی وضاحت کی ہے کہ ۳۵ راجاؤں کا حال راج ترنگنی میں شامل نہیں ہے لیکن تاریخ حسن میں ان راجاؤں کے حالات ملتے ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس تصنیف میں ان ۳۵ راجاؤں کے حالات کا ماخذ تاریخ حسن ہے، یہ حصہ مختصر ہے اور مصنف نے اختصار سے کام لے کر کشمیر کی تاریخ میں اسلام سے قبل کے دور کو سرسری جائزے کے ساتھ ختم کیا ہے۔

کشمیر میں اسلام کی تبلیغ، شہمیریوں کے برسر اقتدار آنے میں بھی مصنف نے اختصار سے کام لیا ہے۔ شہمیریوں کے بعد چک عہد، مغل عہد، افغان عہد، سکھ عہد اور ڈوگرا عہد پر ضروری اطلاعات فراہم کر کے 'تاریخی پس منظر' کے حصے میں کشمیر کی تاریخ کا خلاصہ پیش کیا ہے۔

دوسرے باب 'آغاز سخن' میں ایران اور کشمیر کے تہذیبی رشتوں پر قلم اٹھایا ہے۔ اس باب میں کشمیر کی تاریخ بیچ بیچ میں آگئی ہے تا کہ کشمیر میں ترویج اسلام کا ایک مبسوط نقشہ قائم ہو سکے۔ کشمیر میں فارسی کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ:

> "کشمیر میں فارسی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکے گا کہ پنڈت علما، نے بہت سی مذہبی کتب کے علاوہ، نعتیں، مناجاتیں اور دعائیں بھی فارسی میں منتقل کر لی تھیں اور ہر گھر میں پڑھی جاتی تھیں۔"

تیسرے باب میں مصنف نے ادوار کے اعتبار سے فارسی ادب کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس باب کا آغاز شہمیری سلاطین کی تربیت اور نگرانی میں فارسی ادب کی ترقی کا ایک جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے شہمیری دور کے ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ ابتدائی عہد سے علی شاہ تک وجود میں آنے والے ادب پر مبنی ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ سلطان علاء الدین کا دور صحیح معنوں میں فارسی زبان کے عروج کا دور ہے۔ سید جلال الدین جہانیاں جہانگرد اسی عہد میں کشمیر آئے تھے۔ سلطان شہاب الدین کے عہد میں فارسی زبان وادب کو مزید ترقی ملی تھی۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

> "شہاب الدین (۱۲۵۷ء تا ۱۲۷۶ء) کے عہد سے سلطنت کا عروج

شروع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ تہذیب اور شائستگی کے کاموں کو بھی فروغ ہونے لگتا ہے۔ کشمیر کی مشہور عارف شاعرہ، لل دید اور حضرت نور الدین ریشی کا یہی زمانہ تھا۔ جنھوں نے کشمیر میں عرفان اور محبت کے نغمے سنائے اور یہ نغمے ابھی تک اہل کشمیر کے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ مشہور عالم دین اور پیشوا حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کی تشریف آوری کشمیر میں اسی زمانے میں ہوئی تھی۔ آپ صرف چار مہینے یہاں قیام کر کے واپس تشریف لیے گئے۔ ان چار مہینوں کے دوران آپ اور آپ کر رفقاء نے یہاں کی عوام کو اسلام کے عقائد اور احکام سکھانے کے لیے فارسی ہی سے کام لیا تھا۔ سلطان شہاب الدین کے عہد میں ملا احمد نے 'فتاوی شہابی' مرتب کی تھی۔ ملا احمد علامہ بڈشاہ کے درباری شاعر ملا احمد کشمیری کے نانا ہوتے تھے۔"

امیر کبیر سید علی ہمدانی کی دوسری مرتبہ تشریف آوری کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف اپنی رائے کا اس طرح اظہار کرتا ہے:

"حضرت امیر کبیر دوسری دفعہ سلطان قطب الدین کے زمانے میں کشمیر آئے۔ مورخین کا بیان ہے کہ آپ کے ہمراہ آپ کے معتقدین اور رفقاء میں کوئی سات سو افراد موجود تھے۔ آپ نے اس دفعہ چھ مہینے کشمیر میں قیام کیا اور جب تشریف لیے گئے تو بہت سے رفقاء کو، سلطان اور اس کے خاندان کے افراد اور عوام کی تعلیم و تربیت کے لیے یہیں چھوڑ گئے۔"

حضرت امیر کبیر کے علمی اور صوفیانہ مرتبہ پر مصنف نے بہت کم اطلاع فراہم کی ہے۔ یہ حصہ تشنہ تحقیق ہے لیکن سلطان قطب الدین کی علم دوستی پر تمام بنیادی باتیں آ گئی ہیں۔ مصنف نے سلطان قطب الدین کی شعر گوئی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے لیکن جو اشعار

نقل کیے ہیں وہ جدید تحقیق کی روشنی میں قطب الدین سے غلط منسوب قرار پاتے ہیں۔

سلطان سکندر کے عہد کے ان دو اہم واقعات پر مصنف نے مناسب روشنی ڈالی ہے۔ جن کا اثر فارسی کی ترقی اور اشاعت پر مستحسن تھا اور ان واقعات کا تعلق میر محمد ہمدانی کی کشمیر میں آمد اور خروج امیر تیمور سے ہے۔ مصنف نے سلطان سکندر کی علم دوستی پر بھی قلم اٹھایا ہے اور سلطان سکندر کے انتقال پر مولانا احمد کے مرثیے سے کچھ بیت بھی نقل کیے ہیں۔ ان مرثیوں میں مولانا احمد کے مرثیہ کے کچھ بیت خواجہ اعظم نے نقل کیے ہیں:

کجا است شاہ سکندر کجا است میدانش — در انتظار ھلا کند گوی و چوگانش

عجب کہ دیدہ شود گل شگفتہ و گلزار — عجب کبک خرامد بناز در کھسار

عجب کہ باغ بہ خندد چو مردم غافل — عجب کہ باغ نگرید بسان ابر بہار

بہ آب دیدہ بشوید ای مسلمانان — زمین روضہ شہ را برای استظھار

درین مقام بخواھید ہر چہ می خواھید — بہ اعتقاد درست و درون بی انکار

خدا شناس و پیمبر صفت سکندر شاہ — کہ آفرین خدا بر روانش بادھزار

باب چہارم میں سلطان زین العابدین سے حبیب شاہ تک کے فارسی ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے سلطان زین العابدین کی علم دوستی، اولوالعزمی اور بیدار مغزی کا ذکر کرتے ہوئے انہیں اکبر اور محمد قلی قطب شاہ کا پیش رو بتایا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ بڈشاہ کا دور ہر اعتبار سے سنہرا دور کہلانے کا مستحق ہے۔

عہد شاہ جہاں تک آتے آتے مصنف نے اکبر جہانگیر اور ان سے پہلے کے ادوار میں فارسی زبان کے ارتقاء اور کشمیر میں وجود میں آنے والے فارسی ادب کی اہمیت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ عہد شاہ جہاں کو مصنف نے عروج کے دور سے تعبیر کیا ہے۔ اس دور کی ادبی تاریخ کے ساتھ ساتھ کچھ سیاسی تاریخ بھی زیر بحث آ گئی ہے۔ ظفر خان احسن دو مرتبہ شاہ جہاں کی طرف سے کشمیر کے گورنر رہے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے، ظفر خان احسن کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ:

"مادی تعمیر کے ساتھ ساتھ کشمیر کی کچھ ذہنی تعمیر بھی احسن کے ہاتھوں ہوئی۔ اسے شعر و سخن کا ذوق جو ابتدا سے تھا اس میں کشمیر آنے کے بعد اور بھی ترقی ہوئی۔ محفل آرائیوں کا وہ سلسلہ جو اس کے کابل سے نکلنے کے بعد موقوف سا ہو گیا تھا، یہاں دوبارہ شروع ہوا۔"

ظفر خان احسن نے کشمیر کے بارے میں جو مثنویاں کہی تھیں ان میں 'ہفت منزل' کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس تصنیف میں شاہ جہانی عہد کے جن شعرا کا ذکر ملتا ہے ان میں میر الٰہی ہمدانی، ملا شاہ بدخشی، حاجی محمد جان قدسی، طغرا مشہدی، بہشتی، حکیم صدرا مسیح الزمان اور کلیم کے علاوہ مولانا حیدر خصالی، مرزا سلیم، ابوالقاسم، مولانا رونقی، ملا محسن فانی، ملا محمد طاہر غنی کشمیری اور عبدالرسول استغناء کا تعارف بہت جامع الفاظ میں پیش کیا ہے۔ محسن فانی کے بارے میں لکھتے ہوئے مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ:

"ملا محسن فانی اس دور کے علماء اور اساتذہ فارسی میں بہت شہرت رکھتے ہیں۔ شیخ یعقوب صرفی اور بابا داؤد خاکی کے بعد یہ مرتبہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہو سکا۔ فانی عالم اور شاعر تھے، فلسفے سے بھی ان کو لگاؤ تھا۔"

غنی کشمیری پر مصنف کا محاکمہ غنی کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے کچھ مختصر ہے۔ ان کی شعری خواص پر کئی اہم نکتوں کی طرف مصنف اشارہ کرنا بھول گیے ہیں۔ یہ محاکمہ غنی کشمیری کی مکمل

تصویر پیش نہیں کرتا۔ اسی طرح جویا اور گویا تبریزی دونوں پر مزید تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ غیر شعری ادب کا جائزہ بھی بھرپور نہیں ہے۔ نثر میں صرف طبقات شاہ جہانی، ملا شاہ بدخشی اور خواجہ معین الدین کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ ملا حسن گو، جو عالمِ قرآن تھے ان پر جو لکھا ہے وہ بھی مزید تفصیل کا متقاضی ہے۔ مصنف نے اس طرف بھی کوئی اشارہ نہیں کیا ہے کہ شاہ جہاں کا عہد کشمیر میں ایک نئے عہد کا آغاز ہے۔ 'سبکِ ہندی' کے بارے میں بھی مصنف نے جو اطلاعات فراہم کی ہیں وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جبکہ 'سبکِ ہندی' کا اثر کشمیر کے فارسی شعراء پر بھی اسی دور میں قائم ہوا تھا اور پھیلا تھا۔

''اورنگ زیب اور اس کے بعد'' جو کتاب کا اٹھواں باب ہے، اس میں مصنف نے ۱۶۵۸ء سے ۱۷۵۲ء تک یعنی اورنگزیب سے فرخ سیر کے عہد تک کے فارسی ادب کا تذکرہ پیش کیا ہے۔ مصنف کے بیان کے مطابق اورنگ زیب کے دور میں اگلے عہد کے کئی شاعر موجود تھے اور کچھ نئے شاعر اور ادیب جن کی پرورش پچھلے دور میں ہوئی تھی، اورنگ زیب کے عہد میں منظر عام پر آیے۔ یعنی جو شعری ترقی شاہ جہاں کے زمانے سے شروع ہو چکی تھی وہ اس عہد میں بھی جاری رہی۔ اس عہد کے شعراء کے ذکر میں مصنف نے عبدالغنی بیگ قبول، لالہ ملک شہید، عنایت خان آشنا، ملا بینش اور محمد رفیع منشی کا تعارف پیش کیا ہے لیکن لالہ ملک شہید کا خصوصی تعارف پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ داؤد بتہ مالو، زین الدین پال اور میر حیدر لاری کی علمی شخصیت کا بھی جائیزہ لیا ہے۔

لالہ ملک شہید کا تعارف پیش کرتے ہوئے مصنف نے ان کی تاریخ گوئی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''لالہ ملک شہید کو شعر گوئی اور تاریخ میں بہت ملکہ تھا۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی منقبت میں اس نے ایک ہزار ایک تاریخیں کہی تھیں ان میں ہر شعر سے آپ کی تاریخ ولادت اور سن و تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے کہتے ہیں کہ لوگ ان کے پاس تاریخ کہلوانے کے لئے آتے تھے شہید کا ایک کارنامہ ''دہ مجلس فتنہ ابراھیم خان'' کے نام سے موسوم ہے۔ اسی طرح مرزا عبدالغنی بیگ قبول کے ذکر میں مصنف نے

ان سے متعلق بنیادی باتیں پیش کردی ہیں۔لیکن عنایت خان آشنا اور ملا بینش کے بارے میں مصنف نے انصاف سے کام نہیں لیا اور جو بھی لکھا ہے نہ ہونے کے برابر ہے۔حالانکہ یہ دونوں اس عہد کے سب سے اہم شاعر تھے۔اس حصے میں جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ ابواب کو ٹھیک سے قایم نہیں کیا گیا ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس شاعر کا تعلق کس دربار یا کس بادشاہ سے ہے۔اسی طرح علماء شعراء اور دیگر نثر نگاروں کی فہرست بھی الگ الگ قایم نہیں کی گئی۔شعراء کے ذکر کے ساتھ بیچ بیچ میں نثر نگاروں کا بھی ذکر آ گیا ہے مثلاً صفحہ نمبر ۵۶۔۱۵۵ پر لالہ ملک شہید کے فوراً بعد ''مراۃ طیبہ'' کے مصنف خواجہ معین الدین نقشبندیؒ کا ذکر آیا ہے۔

علماء اور مصنفین کے ذکر میں بابا داؤد مشکواتی اور ان کی تصانیف کا مناسب تعارف ملتا ہے۔نارائن کول عاجز پر بھی مصنف نے مناسب اطلاعات یکجا کردی ہے۔لکھتے ہیں کہ ''پنڈت نارائن کول عاجز کی تاریخ کشمیر جو ''منتخب التواریخ'' کے نام سے مشہور ہے۔عالم گیر کے آخری عہد کی مشہور تواریخ میں سے ہے یہ قدیم تواریخ پر مبنی ہے لیکن مصنف نے حتی الامکان صحیح واقعات درج کرنے کا اہتمام کیا ہے۔عاجز کا اسلوب مرصع ہے گو وہ مرّوجہ فارسی میں لکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔کتاب کی تصنیف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عارف خان کی فرمائش پر جو جعفر خان، ابراہیم خان اور نوازش خان کے عہد نظامت میں نائب اور دیوان رہا تھا، مختلف تاریخوں سے مستند واقعات جمع کرکے یہ تاریخ مرتب کی ہے۔نارائن کول عاجز کے علاوہ دیگر کئی اہم غیر مسلم علماء جیسے شیو کاک در، پنڈت شیوجی در اور پرمانند کا ذکر بھی قابل توجہ ہے۔

مصنف نے کچھ علماء، مصنفین اور شعراء کا ذکر کیا ہے جن میں سے شیخ علی پامپوری، عبدالحکیم ساطع، محمد رفیع منشی، حافظ عبدالغفور، خواجہ جواہر یکتا، شاہ محمد صادق، میاں محمد امین دار، ملا محسن کھشو، ملا محمد اشرف منتو، ملا عنایت اللہ شال ملا عبدالرشید زرگر، شیخ محمد چستی رادھو، ملا صفی الدین اردبیلی، میرزا اکمل الدین بدخشی، شیخ عبدالوہاب نوری، شیخ محمد

مرادرفیقی اور میر کمال الدین اندرابی رسوا وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کے بارے میں مصنف نے اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد تخت وتاج کے لئے جو کشمکش شروع ہوئی تھی اور اس کا جو اثر کشمیر پر پڑا مصنف نے اس پر بھی قلم اٹھایا ہے۔اس باب میں خواجہ محمد اعظم اور ان کی تصانیف خواجہ محمد اعظم کے بیٹے اسلم منعمی ، محمد رضا مشتاق ، خواجہ نور اللہ دیوانی ، شیخ محمد عاصمی کے ذکر میں مصنف نے اختصار کے باوجود تمام ضروری اطلاعات فراہم کردی ہیں۔ محمد شاہ کے عہد کے مولانا امان اللہ شہید اور فرخ سیر کے عہد کے مرزا لطف اللہ خان صہبا کا ذکر اگر چہ مختصر لیکن بہت مناسب ہے۔

کتاب کے نویں باب میں افغان عہد کے ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔جب مغلیہ اقتدار کے خاتمے کے بعد افغانوں کا تسلط کشمیر پر ہوگیا تو عام طور پر تہذیبی امور کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔افغان اچھے سپاہی تھے لیکن تہذیب اور شایستگی کے امور سے انہیں اتنا ہی بعد تھا جتنا ابتدائی مغلوں اور تا تاریوں کو تھا۔مصنف ، بامزائی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''مغل اقتدار کی زوال پزیری کے بعد اہل کشمیر نے جب افغانوں کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی ، انہیں اس کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ کشمیر اور اس کے حسن وخوبی کا ایسا صاف صفایا ہو جائے گا کہ زندگی دو بھر ہو جایے گی۔ایک شاعر نے بڑے ہی اچھے انداز میں اس عہد کی ناگفتہ بہ حالت کا نقشہ اپنے اس شعر میں کھینچا ہے۔'':

پرسیدم از خرابی گلشن ز باغبان　　　　آہ کشید و گفت کہ افغان خراب کرد

اگر چہ افغان فارسی ادب سے بالکل بہرہ ور نہ تھے تاہم اس دور میں بھی چند شعراء و ادبا منظر عام پر آیے۔ پہلے افغان ناظم عبداللہ خان کے دور حکومت میں ٹیکارام آخون نامی ایک مشہور ومعروف شاعر گذرا ہے اس نے عربی وفارسی کی اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کی تھی اور عربی اور فارسی کے لیے ایک مکتب قائم کیا تھا جس سے بہت سے کشمیری طالبان علم فارسی

زبان وادب کی تعلیم سے فیض یاب ہوئے اور فارسی شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ٹیکا رام آخون کی مثنوی جو 'کبک نامہ' سے موسوم ہے، کافی مشہور ہوئی۔ یہ سردار عبداللہ خان ایشک ۱۷۹۵ء تا ۱۸۰۰ء کے عہد کا کارنامہ ہے اور اسی کی بزم آرائی اور شوق سیر وشکار کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں آخون نے نئے نئے استعاروں وکنایوں سے کام لیا ہے:

چو کبک صبح نور از بصد ناز — ز کوہ چرخ کردہ خندہ آغاز

سیاھی بلبل آسا پرواز از باغ — حواصل سر کشید از بیضہ زاغ

افغان عہد میں فارسی ادب اور خاص طور پر شاعری کی ترقی میں سکھ جیون مل کا بڑا حصہ رہا۔ وہ پنجاب کا کھتری تھا لیکن ولادت کابل میں ہوئی تھی۔ سکھ جیون مل کو فارسی شعرو ادب سے گہرا لگاؤ تھا خود فارسی میں شعر کہتا تھا اور شعراء کا قدردان تھا۔ پیر غلام حسن نے اپنی تاریخ میں اس کے بعض اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ وہ شعراء کو اپنے دربار میں بلاتا تھا اور اس نے دربار کے سات شاعروں کو منتخب کر کے "تاریخ کشمیر یا شاہ نامہ کشمیر" لکھنے پر مامور کیا تھا۔ ایک ایک عہد ان میں سے ہر ایک کے ذمہ کیا گیا تھا اور نظم کی ہر بیت کے لیے ایک ایک روپیہ مقرر تھا۔ جن لوگوں کے ذمہ یہ کام تھا ان میں ملا توفیق، ملا رفیع محمد علی خان متین، محمد بیگ جان سامی، رحمت اللہ باندی نوید، ملا راجح اور عبدالوہاب شائق شامل ہیں۔

میر سعد اللہ شاہ آبادی اس دور کے مشہور مثنوی نگار گذرے ہیں۔ مصنف نے ان کی دو مشہور مثنویاں "باغ سلیمان اور منظوم السعد" کا نہایت مختصر تعارف پیش کیا ہے اور اسی طرح ملا اشرف ویری، بلبل جیسا صاحب دل شاعر کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جس کی شہرت کی بنیاد اس کی مثنویات (ہیمال ناگ رائے، ہشت اسرار، مہر و ماہ، ہشت بہشت، رضا نامہ) پر ہے۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے انہیں "نظامی کشمیر" کے لقب سے یاد کیا ہے۔

افغان دور میں جہاں ادباء کی کمی رہی وہیں پنڈتوں نے فارسی کے تئیں اپنے عشق کا اظہار کیا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ:

"پنڈت دیا رام کاچرو خوشدل، افغان عہد کے ان پنڈتوں میں سے

ہیں جنھیں فارسی زبان، ادب اور شاعری سے عشق تھا اپنے علم وفضل کے لحاظ سے وہ اقران میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں وہ اچھے شاعر تھے اور انشا پردازی کا بھی شستہ مذاق رکھتے تھے۔ افغان عہد کے پنڈت شعرا میں وہ سب سے زیادہ درخشاں ہیں۔"

خوشدل کے قصائد، غزلیات، مثنویات، تاریخی قطعات، کشمیر کی منظوم تاریخ اور ایک بیاض ان کے ذوق وعلمی وادبی دلچسپیوں کی رنگارنگی کی بڑی عمدہ یادگاریں ہیں۔

اس دور کے دیگر شعراء علما اور مشائخین میں مرزا محتشم خان فدا، پنڈت بھوانی داس کاچرونیکو، ارمانی مال کشمیری، مولانا حسام الدین، شیخ محمد رفیقی، سید غلام الدین آزاد قادری، راضی، شیخ محمد عثمان، شیخ محمد چشتی کشمیری، علامہ تفضل حسین، شیخ شرف الدین محمد، خواجہ عبد الکریم، میر احسن اللہ خان، ملا نور محمد، ملا حسینی کشمیری، عبدالغفور شوپیانی، خواجہ نیاز احمد، خضر بابا بجبہاری، خواجہ اسداللہ شگون، ملا حیدر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے افغان دور میں نہ مٹنے والے نقوش ثبت کیے ہیں۔

کتاب کا دسویں باب سکھوں کے دور کے متعلق ہے۔ نظم ونسق کے اعتبار سے اس دور میں فارسی ادب اور شاعری کی ترقی قابل اعتنا رہی۔ اسی لیے اس دور کو" ثانی عہد مغل" بھی کہا گیا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ اس دور کے سب سے بڑے شاعر حمید اللہ شاہ آبادی ہیں ان کی عمر کا بڑا حصہ درس وتدریس میں گذرا۔ شعری ذوق میں غزل سے زیادہ ان کی طبیعت طویل منظومات اور مثنوی سرائی کی طرف مائل تھی۔ چنانچہ انھوں نے سکھوں کی حکومت پر تند وتلخ طنزیہ انداز میں "ہیوج نامہ" کے علاوہ ایک خمسہ بھی لکھتا تھا۔ خمسہ کی مثنوی "شکرستان"، "سعدی کی بوستان" کا جواب بلکہ اس کی پیروی ہے۔ "اکبر نامہ" ایک رزمیہ نظم ہے جس میں افغانوں کی تین پہلی جنگوں کے واقعات نظم کیے گے ہیں۔ حمید اللہ شاہ آبادی کی ایک اور تصنیف "دستور العمل" میں پند ونصیحت کی تبلیغ کی ہے۔ یہ سعدی کی شاہکار تصنیف "گلستان" کے انداز پر ہے۔

مصنف نے ملا بہاؤ الدّین متو پر بھی گفتگو کی ہے اور اس کے خمسہ (ریشی نامہ، سلطانیہ، غوثیہ، نقشبندیہ اور چشتیہ) کا نہایت مختصر خاکہ پیش کیا ہے جو "خمسہ بہائیہ" کے نام سے موسوم ہے۔ ان تمام مثنویوں میں بہاؤ الدّین نے صوفیا کے احوال، مختلف سلسلوں، عبادت وریاضت کے طریقوں، کشف وکرامات اور اسرار ورموز کو نظم کیا ہے

اس دور میں شیخ احمد تارابلی، شیخ محمد تارابلی، صدرالدین احمد، میر سید حسین قادری منتقی اور مرزا مہدی مجرم کے علاوہ پنڈت شعرا میں بیربل کاچرو، بھوانی داس کاچرو، پنڈت کمند رام، پنڈت تابہ رام، شنکر آخون گرامی، روپ بھوانی، آنند رام بیخود، پنڈت کاشکاری پچھمن نارائن داس خمیر اور پچھمن رام سرور نے بھی شہرت حاصل کی۔

کتاب کا گیارہواں باب ڈوگرہ عہد کے فارسی ادب کے متعلق ہے اگرچہ اس عہد میں فارسی کے بجائے اردو سرکاری زبان قرار پائی، انگریزی تعلیم کا دور شروع ہوا، دار التراجم قائم کیے گے اردو عام ہوئی، اس کے باوجود ہمیں اس دور میں فارسی ادیبوں کی کمی معلوم نہیں ہوتی۔ مصنف نے تقریباً چالیس شعراء وادبا کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں پنڈت ٹھاکر داس راز دان، پنڈت راج کاک در، شیخ نورالدین رفیقی کشمیری، پنڈت ست رام بقا، مرزا احد، میرزا یوسف الدّین، پنڈت گوپال کول، پنڈت ہرہ کول، ہشیار، غلام رسول شیوا، کرپارام، پنڈت رامو درترسل، پنڈت لچھمن بٹ چالاک، ملا نورالدین، حبیب اللہ کاملی، پنڈت طوطا رام، ملا احمد سہروردی، پنڈت ٹیکا رام کول، پنڈت مہتاب جیوترسل، شیخ احمد ترالی، پنڈت داس دیو، پنڈت کیلا داس، ابو محمد خواجہ، پیر غلام حسن کھویامی، پنڈت دیا رام دینہ، احمد میرانی، غلام احمد سوپوری، خواجہ سیف الدّین شال، خواجہ سید الدّین نقشبندی، خواجہ محمد شاہ نقش بند، پنڈت گنگا بشن اور مرزا جلال الدّین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کتاب کا آخری اور بارہویں باب مصنف نے موجودہ دور کے عنوان سے لکھا ہے جس کے بارے میں اس نے خود اشارہ کیا ہے:

"موجودہ دور کشمیر کے نئے عہد میں قدم رکھنے کے بعد نظم ونسق کے

اہتمام لے لیے انگریزی کی تعلیم وتربیت کی ضرورتوں نے انگریزی
کو جب اہمیت بخش دی تو فطرتاً فارسی علم وادب کا ذوق گھٹنے لگا، اور
فارسی شاعری سے سبھی لوگ کم دلچسپی لینے لگے۔''

اس باب میں مصنف نے صرف دو بڑے شاعر مولانا شمس الدین حیرت کاملی اور محمد امین داراب کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ مولانا شمس الدّین کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے کہ:

''مولانا شمس الدّین حیرت کاملی موجودہ عہد کے فارسی شعرا میں اپنی
فکر کی تازگی، جدید رجحان کے شعور اور زبان اور انداز بیان پر استادانہ
قدرت کی وجہ سے ممتاز مقام رکھتے ہیں۔''

مولانا شمس الدّین نے چھ جلدوں پر مشتمل ''فسانہ حیرت'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس میں اپنے عہد کے حالات کے علاوہ اخلاق، تصوف اور شعری محاسن کو بیان کیا ہے اس کے علاوہ ''نیرنگ حیرت'' اور ''قانون صحت'' کے نام سے دو مثنویاں اور ''شاہ نامہ بڈشاہ'' کو بھی تحریر میں لایا ہے۔ اسی طرح مصنف نے خواجہ دراب کی تین تصانیف (مثنوی ید بیضا، ہفت بند عزیزی اور تہنیت نامہ) کا ذکر کیا ہے۔ خواجہ دراب کی فکر کے روشن گوشے فارسی کے اساتذہ قدیم کی شاعری کے محاسن کے ساتھ، جدید عہد کے انداز نظر کے بھی حامل ہیں۔ غزل گوئی ان کی توجہ کا مرکز نہیں بلکہ ان کی نظر کائنات کے حقائق کی طرف زیادہ ہے:

سیر سلوک من ببین عشق و جنون من نگر
پویۂ من براہ حق روی دلم بسوی تو
روز و شبم چسان گذشت ہست حساب مختصر
شب بہ طواف کوی تو روز بہ گفتگوی تو

اس کے علاوہ مصنف نے پیر عبدالقادر آثم، پروفیسر نند لال کول طالب، میر غلام رسول نازکی، میر کمال الدّین شیدا، محمد طیب شاہ صدیقی، سید شمس الدّین غمگین اور سرخوش

کشمیری وغیرہ کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض شعراء زیادہ تر اردو میں شاعری کرتے تھے۔اس طرح مصنف نے اس کتاب میں کشمیر کے فارسی ادب کی پوری تاریخ کا جایزہ لیا ہے اور فارسی ادب کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔مجموعی طور پر یہ کتاب کشمیر میں فارسی ادب کے عہد بہ عہد ارتقاء کا ایک بھرپور جائیزہ پیش کرتی ہے اور وہ لوگ جو فارسی سے واقف نہیں ہیں وہ اس کتاب کے مطالعہ سے کشمیر میں وجود میں آنے والے فارسے ادب کی خاطر خواہ آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔

در گلشن کشمیر دلا طائیر قلسی　　　پا بند ھوا گشتہ در دیر فنا را

ماخذ:

۱۔کشمیر میں فارسی ادب کی تواریخ، پروفیسر عبد القادر سروری، مطبوعہ حیدر آباد، ۱۹۶۸ء

۲۔تاریخ واقعات کشمیر، خواجہ محمد اعظم دیدہ مری، قلمی، عبدالسلام کلکشن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۳۔تاریخِ کشمیر، ڈاکٹر صابر آفاقی، لاہور، ۱۹۸۸ء

۴۔اسلامی کلچر ان کشمیر، جی۔ایم۔ڈی۔صوفی، دہلی، ۱۹۷۹ء

۵۔کشمیر انڈر مغلو، عبدالمجید متو، کشمیر، ۱۹۸۸ء

☆☆

شیرازہ اُردو

کی بعض اہم خصوصی اشاعتیں

- ☆ سمپوزیم نمبر
- ☆ پنڈت جواہر لال نہرو نمبر
- ☆ مورخ حسن نمبر
- ☆ منشی پریم چند نمبر
- ☆ غالب نمبر
- ☆ شیخ العالم نمبر
- ☆ شاہِ ہمدان نمبر
- ☆ شیرِ کشمیر نمبر
- ☆ غلام محمد صادق نمبر
- ☆ نوجوان نمبر
- ☆ فخرِ کشمیر نمبر
- ☆ عبدالاحد آزاد نمبر
- ☆ ثقافت نمبر
- ☆ محی الدین قادری زور نمبر
- ☆ محمد الدین فوق نمبر
- ☆ ڈاکٹر سر محمد اقبال نمبر
- ☆ عجائباتِ کشمیر نمبر
- ☆ لل دید نمبر
- ☆ صوفیانہ موسیقی اور کشمیر نمبر
- ☆ سمینار نمبر
- ☆ افسانہ نمبر
- ☆ شاعرِ کشمیر مہجور نمبر
- ☆ مغل اور کشمیر نمبر
- ☆ جموں و کشمیر میں اردو ادب نمبر

☆ حکیم منظور نمبر
☆ غلام رسول نازکی نمبر
☆ غلام رسول کامگار نمبر
☆ بخشی غلام محمد نمبر
☆ عمر مجید نمبر
☆ پی۔این۔کے بامزئی نمبر
☆ ہمعصر شعری انتخاب نمبر
☆ پشکر ناتھ کول نمبر
☆ مقبول فدا حسین نمبر
☆ ٹیگور نمبر
☆ شیرازہ اُردو گولڈن جوبلی نمبر

☆ حامدی کاشمیری نمبر
☆ میکش کاشمیری نمبر
☆ محمد یاسین بیگ نمبر
☆ شمیم احمد شمیم نمبر
☆ جموں و کشمیر ،لداخ نمبر (۹ جلدیں)
☆ غلام رسول سنتوش نمبر
☆ محمد یوسف ٹینگ نمبر
☆ فرید پربتی نمبر
☆ ہمعصر افسانہ نمبر
☆ اکبر حیدری نمبر
☆ میراجی نمبر

............☆☆☆............

سالنامہ "ہماراادب"
کی بعض خصوصی اشاعتیں

☆ لوک ادب نمبر

☆ مشاہیرِ کشمیر نمبر (۲ جلدیں)

☆ شیرازہ، انتخاب نمبر

☆ جموں کشمیر نمبر (۵ جلدیں)

☆ شخصیات نمبر (۵ جلدیں)

☆ اولیاء نمبر (۵ جلدیں)

☆ ڈوڈہ نمبر

☆ مولانا رومی نمبر

☆ ہمعصر تھیٹر نمبر

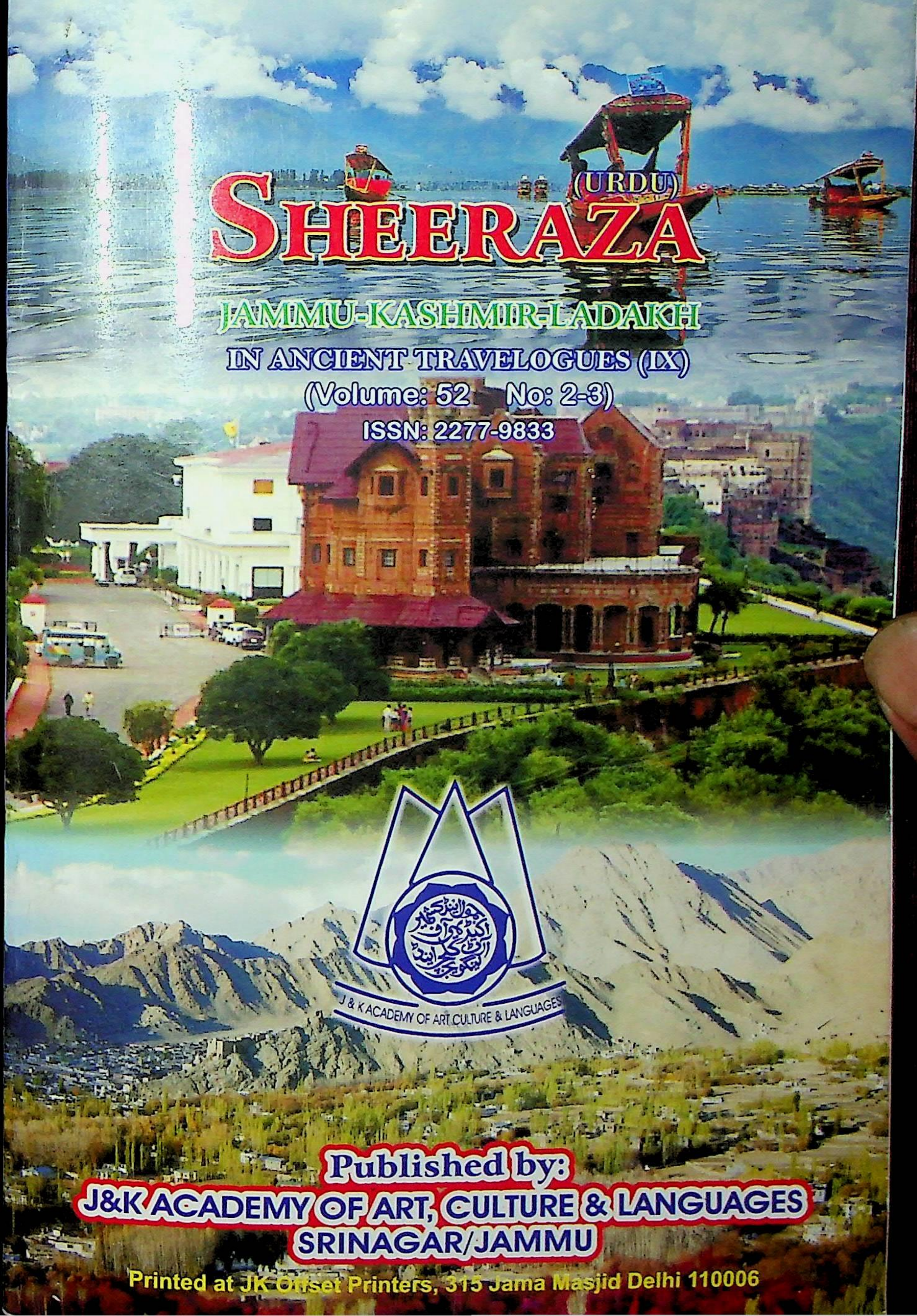
☆ فیض احمد فیض نمبر

☆ منٹو نمبر

☆ تنقید نمبر

شیرازہ اور ہماراادب کی خصوصی اشاعتیں کتاب گھر، سرینگر/ جموں/ لیہہ/ سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

............☆☆☆............


(URDU)
SHEERAZA
JAMMU-KASHMIR-LADAKH
IN ANCIENT TRAVELOGUES (IX)
(Volume: 52 No: 2-3)
ISSN: 2277-9833
J & K ACADEMY OF ART CULTURE & LANGUAGES
Published by:
J&K ACADEMY OF ART, CULTURE & LANGUAGES
SRINAGAR/JAMMU
Printed at JK Offset Printers, 315 Jama Masjid Delhi 110006